

محاکمہ

دیوان غالب نسخہ لاہور مسروقہ

ترتیب

پروفیسر جعفر بلوچ
رفاقت علی شاہد



محاکمہ

دیوانِ غالب نسخۂ لایہو (مسروقہ)

جلد اول حصہ اول

ترتیب

پروفیسر جعفر بلوچ رفاقت علی شاہد

علم و فن پبلشرز

T-G ماسٹر سٹریٹ / محلہ ڈالہ / لاہور فون: 7352332
E-mail: gagan_g_1999@yahoo.co.uk

جملہ حقوق محفوظ

کتاب	حاکمہ (جلد اول: حصہ اول)
مرتب	دیوانہ غالب نسو لاہور (مسروقہ)
مترجم	پروفیسر جعفر بلوچ، رفاقت علی شاہ
ناشر	علم و عرفان پبلشرز لاہور
کمپوزنگ	فراز کمپوزنگ سنٹر اردو بازار لاہور
مطبع	رحمانیہ پرنٹرز لاہور
اشاعت اول	جولائی 2001ء
قیمت	200/- روپے

ملنے کا پتہ
علم و عرفان پبلشرز

C-7، مقرر سٹریٹ اوٹر مال روڈ لاہور۔ فون: 7352332

E-mail: waqas_g_1999@yahoo.co.uk

انتساب

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام

جنہوں نے دیوان غالب نسخہ لاہور کا پہلا تعارف لکھا

فہرست

۹	پرو فیسر جعفر بلوچ	سر مشین
۱۸	خلیل الرحمن داداوی	مقدمہ

حصہ اول : کتابچے

۳۱	ڈاکٹر حسین قریشی	۱۔ دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق
۱۷۷	سیدہ قدرت نقوی	۲۔ دیوان غالب، نسخہ خوب یا نسخہ مسروقہ
		۳۔ "دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق" اور "دیوان غالب،
۱۳۵	ڈاکٹر عارف نقیب	نسخہ خوب۔ صحیح صورت حال۔۔۔۔۔ ایک کتابی جائزہ

حصہ دوم : مضامین اور تبصرے

۱۳۳	ڈاکٹر ایمان پندرجین	۴۔ دیوان غالب، نسخہ خوب یا نسخہ لاہور
۱۶۶	رفیق احمد نقشب	۵۔ ادبی دنیا میں نگر و یا اور جمل سازجوں کی حیرت انگیز روداد
۱۸۵	عزت جہاں	۶۔ دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق
۲۹۰	اختر رحمت	۷۔ جاگیر غالب سے دیوان غالب تک
۲۹۸	رفعت علی شاہد	۸۔ دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق

حصہ سوم : کالم

۳۰۳	عمر اقبال	۹۔ دیوان غالب۔ نسخہ خوب یا نسخہ لاہور
۳۰۸	اشرف بخاری	۱۰۔ دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق
۳۱۲	ڈاکٹر شرف احمد	۱۱۔ دیوان غالب، نسخہ خوب کا تنازع
۳۱۷	ڈاکٹر اسماعیل یازدی	۱۲۔ مرزا غالب مغلوب اور جنرل ارشد محمود
۳۲۰	ڈاکٹر اسماعیل یازدی	۱۳۔ وی سی صاحب کو التجا

- ۱۳۔ جمہولی الپ آئی آر اور چور پوٹسٹر
 ۳۲۳ ڈاکٹر اجمل نیازی
 ۱۴۔ چائٹر صاحب اوکس چائٹر کی بددگر
 ۳۲۶ ڈاکٹر اجمل نیازی
 ۱۵۔ چائٹر کے گھرواں چائٹر کا "تحقیق جی"
 ۳۲۹ ڈاکٹر اجمل نیازی
 ۱۶۔ اورک کا پوٹسٹر کرنے والے بوزنے
 ۳۳۲ ڈاکٹر عارف یاقب
 ۱۷۔ عالم ادواج سے مرزا اسد اللہ خان غالب کا خط
 ۳۳۶ حفیظ الرحمن خاں
 ۱۸۔ چوری اور سینہ زوری
 ۳۳۸ اشفاق احمد ورک

حصہ چہارم: متفرقات

- ۲۰۔ اپنی بات --- ادواجیہ ماہنامہ "تحقیق" لاہور
 ۳۳۳ اعظم جادو
 ۲۱۔ روشنی کا سفر اندھیروں کا تعاقب --- ادواجیہ ماہنامہ "سورج" لاہور
 ۳۳۵ تسلیم احمد تصور
 ۲۲۔ اقتباس از انشرویج
 ۳۳۷ حفیظ الرحمن داؤدی
 ۲۳۔ اقتباس از انشرویج
 ۳۵۱ لطیف الزماں خاں
 ۲۴۔ اقتباس از مضمون
 ۳۵۴ ظفر علی راجا
 ۲۵۔ اقتباس از "غالب کے نام ایک خط"
 ۳۵۵ مبین مرزا
 ۲۶۔ انجمن تحفہ ناموس، غالب ورشید احمد صدیقی کے پنفلٹ
 ۳۵۷
 ۲۷۔ پنجاب یو ندر سٹی کے واکس چائٹر کی جانب سے تحقیقات کا حکم
 ۳۷۱
 ۲۸۔ دیوان غالب کا نسخہ لاہور
 ۳۷۳ ڈاکٹر حسین فراقی
 ۲۹۔ "انجمن خیال"
 ۳۷۶
 ۳۰۔ تلمیذیں
 ۳۸۸ پروفیسر جعفر بلوچ
 ۳۸۹ بانف زعفرانی

حصہ پنجم: ضمیمہ

- ۳۱۔ (الف) "دیوان غالب، جرمین ایلی ٹیشن" پر محققانہ نظر
 ۳۹۳ رفاقت علی شاہد
 ۳۱۔ (ب) "روزنامہ" پاکستان میں شائع ہونے والی خبر کا ٹکس
 ۳۹۹

سرمتن

پروفیسر جعفر بلوچ

مقدمہ

خلیل الرحمن داؤدی

سرِ متن

نہ	سنو	گر	نرا	کے	کوئی
نہ	کہو	گر	نرا	کرے	کوئی
روک	لو	گر	غلط	چلے	کوئی
بکس	دو	گر	خطا	کرے	کوئی

حضرت غالب کے یہ ارشادات بجا ہیں لیکن ذرا وضاحت طلب ہیں۔ تیسرا مصرع واضح طور پر ’نہی عن المنکر‘ کی ترجمانی کرتا ہے لیکن باقی تین مصرعوں کے مضامین ذاتی اور انفرادی حوالے ہی سے درست ہیں اور یہی غالب علیہ الرحمہ کا غلط مضمون ہوتا ہے۔ جس برائی کا اثر اجتماع یا سوسائٹی پر پڑتا ہو، اس سے انفرادی طور پر اعراض و اغراض کرنے یا اسے انفرادی طور پر بخش دینے کا اختیار کسی کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟

ادبیات میں سرقہ و دزدی اور جعل سازی کی روایات بہت پرانی ہیں لیکن انہیں کسی زمانے اور کسی خطے میں جائز یا مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ ادب کے نام پر ہونے والی بدعنوانیوں پر گرفت، مختلف اسالیب میں، ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ غازی اور اردو زبانوں کے ادب میں بھی اس موافقہ کی بیسیوں یا پچاسوں جنمیں، نیکیوں مثلیں موجود ہوں گی۔ موجودہ زمانے میں تو علمی چوریوں، چکاریوں، ادبی ذکیٹیوں، لکری و چنی اٹھائی گریوں اور لفظی و معنوی اچک بازوں کا گراف کچھ اور بھی بلند ہوا ہے، اور یہ صورت حال علمی و ادبی اور تہذیبی ارتقا کے حوالے سے نہایت برا شکون ہے۔

ہمارے ”ممدوح“ ڈاکٹر سید مصححین الرحمن صاحب، جو سورج افق سے ”اُٹھیا“ کی عظیم درس گاہ گورنمنٹ کالج، لاہور کے صدر شعبہ اردو بھی ہیں، ایک طویل عرصے سے متعدد علمی و ادبی بدعنوانیوں میں ملوث چلے آتے ہیں اور ان کی ان نامطلوب بلکہ

موسم وارداتوں کا طویل سلسلہ گزشتہ کئی برسوں سے ادیبانِ علم و ادب کے لیے عبرت و اذیت کا باعث بنا ہوا ہے۔ ان کی صغیرہ لغوشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں ان کے چند کہاڑ کی طرف صرف سرسری اشارے کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

(i) انھوں نے لائق شعر و سخن سے بے نصیب ہونے اور تحسینِ شعر کی صلاحیت سے

بے بہرہ ہونے کے باوجود غالب اور اقبال جیسے عظیم اور آفاقی شعرا کو اپنی ہوس نقد و نظر کا نشانہ بنایا ہے۔

(ii) انھوں نے اپنی ایک شاگرد بشری باسل کے ایم اے کے مقالے "اورا جعفری

مخصوصیت اور شاعری" کے بعض ادیب کو اپنے نام سے رسالہ "نقوش" لاہور میں شائع کرایا ہے۔

(iii) انھوں نے بھارت کے معروف غالب شناس پرتھوی چندر کی محنت شاق اور خوش

سلیقگی سے مرعہ کی ہوئی ایک مطبوعہ مگر ناچاپی کی حد تک کیا پ کتاب "چاکیر غالب" کے نائل سے پرتھوی چندر کا نام غالب کہ دیا اور اس کے بجائے بلور مرعہ اپنا نام داغ دیا۔

(iv) موصوف کا تازہ کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۹۸ء میں انھوں نے "دیوان غالب" کے

ایک قلمی نسخے کو، جس پر خود حضرت غالب کے ہاتھ سے بعض تراجم و اصلاحات

بھی ہیں اور جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی ملکیت تھا، "دیوان غالب، نسخہ

خواب" کے نام سے اپنی تحقیق اور دریافت کے طور پر شائع کر دیا۔ یہ اہم اور گراں

بہا نسخہ قبل از ۱۹۵۳ء سے پنجاب یونیورسٹی کی ملکیت چلا آرہا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ

نے جولائی ۱۹۵۳ء میں ماہنامہ "ماہ نو" کراچی میں اس نسخے کا تعارف کرایا تھا اور

تعارفی مضمون کے ساتھ اس نسخے کے دو صفحوں کے ٹکس بھی شائع کرا دیے تھے۔

بعد میں معروف اور نامور محقق قاضی عبدالودود اسی نسخہ "دیوان غالب" کا ردو

گراف بھارت نے گئے تھے اور انھوں نے بھی اس نسخے کا تعارف "نقوش"

لاہور کے شمارہ ۶۹-۷۰ (اپریل اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں کرایا تھا۔ غالبیات کے ایک

اور ممتاز محقق و نقاد جناب امتیاز علی خاں عرشی نے بھی ۱۹۵۸ء ہی میں "دیوان

غالب۔ نسخہ عرشی" مرعہ کیا تو انھوں نے قاضی عبدالودود صاحب کے حاصل کردہ

رونوگراف کی مدد سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری والے نسخہ دیوان غالب پر ایک مفصل نوٹ لکھا اور اس نسخے کو انھوں نے "نسخہ لاہور" کا نام دیا۔ یہ اہم نسخہ دیوان غالب ۶۳-۱۹۶۴ء کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو گیا۔ ۱۹۹۸ء میں اسی نسخے کو سید معین الرحمن صاحب نے اپنے تحقیقی کارنامے کے طور پر شائع کرایا تو اس شان کے ساتھ کہ نسخے کے آخری صفحے پر لگی ہوئی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی عدد نمبر کو چھپی لگا کر چسپا دیا گیا تھا اور نسخے کے صفحہ ۲۴ پر درج لائبریری کے ایکسیشن نمبر (۶۸۱۳) کو کھرچ دیا گیا تھا۔ کھرچنے اور چھیلنے کے اس عمل میں نسخے کی جدول بھی کھرچی گئی۔

اس محفوظ دیوان غالب کو "دیوان غالب، نسخہ خوبہ" کے نام سے شائع کرانے کے بعد سید معین الرحمن نے اسے پاکستان، بھارت اور دیگر ممالک کے کئی قابل ذکر غالب شناسوں اور اہل قلم خدمت میں بھیجا اور اپنے اس کارنامے پر داد کے حقائق بھیجے۔ جواہر بعض حضرات نے دسما، بعض نے مروجا، بعض نے سہوا، اور بعض نے مجبوراً موصوف کی اس "کولمبیت" کی قرابت و توصیف کر دی لیکن بعض ٹڈ اور عاقبت بین محققین نے توصیف و تمجید کے اس ارتقائی عمل میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھا۔ ایسے صاحبان نظر میں رشید حسن خان اور پروفیسر ڈاکٹر حنیف نقوی کے اسلئے گرامی خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر معین صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اپنے اس کہی اہار توصیف و ستائش کو "دیوان غالب، نسخہ خوبہ" تجزیہ و تمجید کے نام سے تین سو اٹھائیس صفحات کی ایک ضخیم کتاب میں شائع بھی کر دیا۔ مدح اندوزی کی حرص کی انتہا یہ ہے کہ موصوف نے نہ صرف ان لوگوں کی آرا کو بھی اپنے لیے مستقر قرار دے لیا ہے جن کا غالب شناسی سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ بعض ایسے حضرات کے دامن اقتدار میں بھی پناہ لینے کی کوشش کی ہے جو غالب شناس تو کیا، سرے سے ادب شناس ہی نہیں ہیں۔ انسا فہ و انسا لیبہ واجعون۔

اس صورت حال کا رد عمل ظاہر ہوتا تھا اور ہوا۔ پہلے تو حق اندیش اور باطل نا پذیر ارباب ادب میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں پروفیسر ڈاکٹر معین فراتی نے "دیوان غالب، نسخہ خوبہ" اصل حقائق کے نام سے معین صاحب کے مرتبہ دیوان

عالم کا مکمل تجربہ کیا۔ ہر پہلو سے اس کا جائزہ لیا (اس تجربے و جائزے کی تفصیل ڈاکٹر حسین کی کتاب میں آچکی ہیں)، اور بالآخر یہ ثابت کر دیا کہ مصیبن صاحب کا مصنف ”نور خولہ“ دراصل وہی نور ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا منسوخ تھا اور عالم ۱۹۶۲ء کے بعد لائبریری سے عالم / چوری ہو گیا تھا، اور یہ وہی نور ہے جس کا تعارف پہلے ہی ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عیسیٰ رام چوری کرا چکے تھے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے یہ بحث بھی اٹھائی ہے کہ ”نور لاہور“، یا بقول سید قدرت نقوی ”نور ہے چور“ کو پروفیسر خولہ منظور مصیبن سے موسوم کر کے ”نور خولہ“ قرار دینے کا کوئی ادبی یا اخلاقی جواز نہ تھا۔ ڈاکٹر حسین کا یہ موقف بالکل درست ہے کہ اس تسمیہ سے پروفیسر خولہ منظور مصیبن کے مقام و احترام میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں ہوا، بلکہ چوری کے مال کو ان کے نام سے موسوم کرنے سے ان کی تحریف اور توہین ہوئی ہے۔

مصیبن صاحب مدنی ہیں کہ انھوں نے یہ نور ”دیوان عالم“ قریباً سترہ سال کی عرق ریزی کے بعد مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ مصیبن صاحب اذوق شعر و سخن سے بے بہرہ اور قاری زبان سے نااہل ہونے کی بنا پر ”دیوان عالم“ کو مرتب کرنے کے اہل ہی نہ تھے۔ انھوں نے مصیبن صاحب کے مرتب کردہ نسخے میں نقل حرفی (Transcription) کر دیے اور الملا کی پچاسوں قاش غلطیاں گنوا کر اپنے موقف کو ناقابل تردید بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی کی اس صدائے احتجاج کی گونج پوری ادبی دنیا میں شنی گئی اور ڈاکٹر مصیبن الرحمن کے غیر علمی رویوں پر انھوں اور قوم کا اظہار کیا گیا۔ کتابچوں، کالموں، اعتراضوں، مذاکرہوں، ٹھکروں اور ادبی گفتگوؤں میں ڈاکٹر حسین کے موقف کی تائید و توثیق کی گئی۔

مئی ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر مصیبن نے ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں اپنا ایک کتابچہ ”دیوان عالم، نور خولہ۔۔۔ صحیح صورت حال“ کے نام سے شائع کر دیا۔ مصیبن صاحب ڈاکٹر حسین کے اٹھائے ہوئے کسی علمی اور تحقیقی سوال کا مناسب اور اطمینان بخش جواب نہ دے سکے۔ مصیبن صاحب کا یہ جوابی کتابچہ کٹ جتنی، کج بجھی اور تلوہ سانہ اعزاز فکر کی اہموں ناک مثال ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی، مصیبن صاحب سے پوچھتے ہیں کہ حضرت! آپ نے نور مذکورہ کو اپنی دریافت بنانے اور اس کی اشاعت سے پہلے یہ تحقیق کیوں نہ کی

کہ یہ نسخہ آیا کہاں سے؟ نسخے کے آخری صفحے پر چھپی گئی ہوئی تھی (جس کے نیچے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مدد مہر تھی) تو آپ نے یہ جاننے کی زحمت کیوں گوارا نہ کی کہ یہاں کیا چیز چھپائی جا رہی ہے؟ قلمی نسخے کے ص ۲۲ کے زیریں صفحے کی جدول (جس پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا انٹیمیشن نمبر ۶۸۱۲ درج تھا) ”نسخہ خوبہ“ کے پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) میں کھربھی ہوئی کیوں ملتی ہے؟ اور دیباچہ نیز درختوں کے اردو ترجمہ کی تکمیل میں آپ نے جاہد ہاتھ کریں کھائی ہیں اور قارئین کو گمراہ کرنے کے مرکب ہوئے ہیں۔ کیا غلطیے ہر سترہ سال کی محنت کا یہی حاصل ہونا چاہیے تھا؟ اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ذوق شعر و سخن سے فطری طور پر بے بہرہ ہونے کے باوجود آپ نے دیوان غالب کی ترتیب کا کام اپنے ذمے لیا ہی کیوں؟ ڈاکٹر حسین کے ان تمام سوالوں کے جواب میں صحیحین صاحب کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ مجھ سے یہ کیا بوجھ رہے ہیں؟ بس آپ یہ ملاحظہ فرمائیں کہ میرے بارے میں الف نے کیا فرمایا ہے اور ب نے کیا کہا ہے؟ ج کے تاثرات کیا ہیں اور د نے کیا رائے دی ہے؟ وغیرہ۔ صحیحین صاحب کے جوابی کتابچے کو پڑھ کر ہمیں بے ساختہ حضرت علامہ اقبال کی مشہور نظم ”شیر اور چکر“ یاد آگئی جس میں شیر پوچھتا ہے:

ساکنانِ دشت و صحرا میں ہے تو سب سے الگ
کون ہیں شیر سے اب وجد کس قبیلے سے ہے تو

اور چکر جواب دیتا ہے:

میرے ناموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ سب اہلِ دین شایِ اصلیل کی آہد

دیوانِ غالب کے اس نسخہ مسروقہ کے بارے میں ایک اہم کتابچہ گزریہ و محقق اور ماہرِ عالمیات سید قدرت نقوی (متوفی دسمبر ۲۰۰۰ء) نے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع کرایا۔ انھوں نے اپنے حقیقی مباحث میں ڈاکٹر صحیحین کے اس دعوے کو مردود ٹھہرایا ہے کہ ان کا شائع کردہ نسخہ دیوانِ غالب اور نسخہ دیوانِ غالب حصارِ ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ ہم الگ الگ نسخے ہیں۔ سید قدرت نقوی کا قوش کردہ یہ حقیقی نقطہ نہایت قابلِ داد ہے کہ نسخہ مسروقہ کے تاریخی سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو غالب

نے ۱۸۵۴ء میں بے پیر کے راجا کے لیے بڑے اجتام سے تیار کرایا اور راجا کو بگھوایا تھا۔ جناب قدس نقوی کا پیش کردہ یہ حقیقی نکتہ ان مباحث کی بھول بھلیوں میں، جو عقائد نسو دیوان غالب کی اصل کے بارے میں سمجھنے سے گئے ہیں، فتح باب کا درجہ رکھتا ہے۔

ستمبر ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر عارف قاقب نے ایک کتابچہ لکھ کر ڈاکٹر حسین فراقی اور ڈاکٹر معین کے کتابچوں کا نہایت معروضی انداز میں تقابلی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر عارف قاقب نے ڈاکٹر حسین فراقی کے سوالات ترتیب وار درج کر کے ثابت کیا کہ ڈاکٹر معین نے اکثر سوالوں کے جواب دینے سے پہلو جھکی ہے اور جہاں کسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، وہاں مغالطہ آفرینی، دروغ بانی اور دجل و فریب سے کام لیا ہے۔

دیوان غالب کے اسی مسروقہ نسو "بے پیر والا ہونہ" کے بارے میں معروف محقق و نقاد اور مخطوط شناس جناب ظلیل الرحمن داؤدی سے ڈاکٹر حسین کی متحدہ گفتگو نہیں ہوئی۔ انھوں نے ہنگامہ ڈاکٹر حسین کے موقف کی پُر زور تائید کی ہے۔ اس سلسلے میں داؤدی صاحب نے جو زبردست حاکم تحریر کیا ہے، وہ حقیق و تنقید میں ان کی دقت نظری، نکتہ داری، نکتہ فوازی اور تعمیر اہداف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اسی طرح پروفیسر لطیف الزماں خان نے بھی اپنے مکالموں اور مصاحبوں میں نقد و تحق کا حق ادا کرتے ہوئے فیصلہ ڈاکٹر حسین فراقی کے حق میں صادر کیا ہے۔

اسی سیاق مباحث میں ڈاکٹر گیان چند جین کا ایک مضمون بھی "ہماری زبان" دہلی اور ماہنامہ "سورج" لاہور میں شائع ہوا۔ اس مضمون کے متعدد جات بھی ڈاکٹر حسین فراقی کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہیں۔

۲۰۰۱ء میں معین صاحب نے اسی مخطوط دیوان غالب کا ڈی کس ایڈیشن بھی شائع کروایا۔ اس ایڈیشن میں مذکورہ بالا ص ۴۴ کے زیریں حصہ کی تصحیح یا کھرپنی ہوئی جدول کو مکمل کر دیا گیا۔ اس اضطرابی حرکت کا نفسیاتی محرک پوری کے پکڑے جانے کا خوف نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن کیا چڑیاں اس طرح چسپائی چا سکتی ہیں؟

قریب ہے بار روز محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان مخبر، لہو پکارے گا آتش کا
اس ڈی کس ایڈیشن کا ایک "اقتیاد" یہ بھی ہے کہ اس میں ان تمام اغلاط کی درستی

یونین لائبریری ہی کا مملوک ہے، اگر زمین صاحب اپنی ساہتہ لغزش یا کوتاہی پر غلام یا معذرت خواہ ہوتے تو بھی ان کی تذکرہ اولیٰ معصیت کی طلافی کسی نہ کسی حد تک ہو جاتی، مگر وہ تو اب تک ”میں نہ مانوں“ کی تکرار کیے جا رہے ہیں اور ”چوری اور سیدہ زورنی“ کا صدقاتی بنے ہوئے ہیں۔ خدا جانے یہ ”نکبت“ کا کون سا درجہ ہے؟

ادب میں سرقہ بازی اور جعل سازی کی وارداتوں کا ارتکاب بجائے خود بھی بہت گھٹاؤنا اور ناقابل معافی مجرم ہے، لیکن یہ سوال اس سے بھی زیادہ نشوونما انگیز ہے کہ کیا ایک استاد ادبیات، اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور جیسی بڑی درس گاہ کے صدر شعبہ اردو کو، تحقیق کے نام پر ایسی غیر شائستہ، بلکہ قبیح اور قابل مذمت وارداتوں کا مرتکب ہونا چاہیے؟ اس سے وہ اپنے شاگردوں اور آئندہ اولیٰ نسلوں کو کیا سبق دے رہے ہیں؟ ادب و تحقیق کا کیا مفہوم وہ نسل نو کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں؟ وہ کن روایات کی تبلیغ کرنی اور کن فرائض کی تعمیل کرنی چاہتے ہیں؟

یہ صدر انگیز واردات، جو ادب اور تحقیق کے نام پر کی گئی ہے، خود پنجاب یونیورسٹی اور اس کے ارباب حل و عقد کے لیے بھی کڑا فکر یہ ہے۔ یونیورسٹی کو مستند اور دیانت دار ارکان پر مشتمل ایک تحقیقی پردہ قائم کرنا چاہیے جو اس چوری کے پس منظر کا سراغ لگائے اور یونیورسٹی کے مملوک اس شخص کے بلا اجازت شائع کرنے پر اس کے مرتب اور پیشرو کو نہ صرف قرار واقعی سزا دلانے بلکہ وہ تمام خطیر سرمایہ بھی یونیورسٹی کو دلانے جو زیر بحث شخص کی غیر قانونی اشاعت اور فروخت سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ گزارش بھی نامناسب نہ ہوگی کہ چونکہ نسل و جماعت غالب مملوک پنجاب یونیورسٹی کو بلا اجازت اور غلط تسمیہ کے ساتھ، یعنی ”نسل خرابہ“ کے نام سے شائع کیا گیا ہے، اس سے جہاں یونیورسٹی کی حق تلفی ہوئی ہے، وہاں خود شخص کی حیثیت عرفی بھی بمرور ہوئی ہے۔ چنانچہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اس ”نسل لاہور“ کو خود اپنے اہتمام سے شائع کرے تاکہ اس صورت حال کی طلافی ہو سکے جو ”نسل خرابہ“ کے غلط تسمیہ کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کو نہ صرف یونیورسٹی کی لائبریری بلکہ تمام دیگر متعلقہ شعبوں کی جانباً اور ان کی اچانکوں کی نگہداشت اور حفظ کے لیے بھی فوری اور موثر اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ آئندہ کے لیے چوری

پنکاری اور لوٹ کھسوٹ کے ایسے انھوس ناک واقعات کا سہا پ ہو سکے۔

اس کتاب میں دیوان غالب کے نسخہ مسروقہ اور اس کی ناچائز اشاعت سے متعلق ڈاکٹر حسین فراقی کی کتاب کا اضافہ شدہ ایڈیشن مکمل طور پر شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تمام اہم کتابچوں، کالموں اور خطوں کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ ادبی تاریخ کا ریکارڈ درست رہے، نیز یہ بات بھی ریکارڈ پر آ جائے کہ حق آج بھی باطل کے تعاقب میں ہے۔ اعلائے کلمت الحق کی یہ تاناک روایت، نئی نوبلی اکیسویں صدی عیسوی کے لیے ایک خاطر کشا بشارت ہے۔

دیوانی غالب نسخہ لاہور کی زیر بحث ناچائز اشاعت کے حادثہ فلیچ کے بارے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس تمام لوازمے کی سہلی ایک جلد میں دشوار ہے۔ پھر آنکھوں بھی اس ضمن میں بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش اور توقع ہے۔ چنانچہ ان تمام مباحث کو ایک سے زیادہ جلدوں میں مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ فی الحال اس سلسلے کی پہلی جلد نذر قارئین ہے۔ حضرت غالب علی کی الفاظ میں:

دردی تمام ہوا اور ”مدح“ باقی ہے

ڈاکٹر عارف نقیب نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت ہمارے لیے وقف کر دیا۔ مواد کی جمع آوری سے اشاعت کے مرحلے تک انھوں نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا جس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔

پروفیسر حفیظ بلوچ

مقدمہ

خلیل الرحمن داؤدی

ڈاکٹر سید مصین الرحمن کا مرتب یہ دیوان غالب ۱۹۹۸ء کے آخر میں شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کے بعد ۲۰۰۰ء کے آغاز میں مصین صاحب اپنے دو مائتوں معراج نیر اور اصغر ندیم سید کے نام سے ایک کتاب ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ تجزیہ و تحسین“ منظر عام پر لے آئے۔ سو اٹھ سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب برصغیر کے ستر پچیسرا اصحاب کی طرف سے مصین صاحب کی شان میں ان قصائد کا مجموعہ ہے جو کتاب وصول ہوتے ہی، اسے مطالعہ کیے بغیر، انتہائی جگت میں گھم بند کیے گئے ہیں۔ ”نسخہ خوبہ“ مصین صاحب کی عقلی اور خود ساختہ کا شہکار تو تھا ہی، سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ تجزیہ و تحسین کے نام سے یہ مجموعہ قصائد آجانے پر مصین صاحب بدزم طویش برصغیر میں اردو ادب کے حلق اعظم اور نقاد ب بول بن گئے۔ یہ دیکھ کر سنجیدہ اصحاب علم و فضل نے اس پر توجہ کی۔ اپریل ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹر حسین فراقی نے ۷۲ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ بعنوان ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ اصل حقائق“ شائع کر دیا۔ جس کے جواب میں مصین صاحب نے ۶۲ صفحات کا ایک کتابچہ بعنوان ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ صحیح صورت حال“ منظر عام پر لے آئے۔ اگست ۲۰۰۰ء میں جناب سید قدرت نقوی (مرحوم) نے ایک کتابچہ بعنوان ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ یا نسخہ مسروق“ ایک جائزہ“ پیش کر دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر یار فاق باقب کا کتابچہ سامنے آ گیا جس میں جناب ڈاکٹر حسین فراقی اور سید مصین الرحمن کے کتابچوں کا ایک تقابلی جائزہ لیا گیا۔ اس طرح سے ڈاکٹر سید مصین الرحمن کے ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ کے سلسلے میں چار کتابچے شائع ہو چکے ہیں۔ ان چار کتابچوں کے علاوہ اخبارات اور رسائل میں متعدد مضامین اور کالم بھی شائع ہوئے ہیں اور غالبیات میں انتہائی گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ چونکہ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی چکی ہے کہ ڈاکٹر سید مصین الرحمن صاحب نے جو ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ شائع کیا تھا، وہ کوئی نو دریافت نسخہ نہیں تھا بلکہ نہایت یو یو ریسی لائبریری کا وہی مسروق نسخہ تھا جس پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۳ء کے ”ماہ نو“ کراچی میں ایک

مضمون لکھا تھا۔ مصین صاحب نے اپنے نسخے کو کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے میں ایک سنی لا حاصل فرمائی ہے جس کے بظان میں یہ تمام کتابچے مضامین اور کالم لکھے گئے ہیں۔ اب یہ تمام بھٹ فتم ہو جانی چاہیے کیونکہ آخر میں ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے اقتباسات ماہنامہ ”سورج“ لاہور ماہیت جنوری ۲۰۰۱ء میں شائع ہو گئے ہیں جن کی رو سے مصین صاحب کی وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی ہے جس پر انہوں نے اپنے مملوکہ نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی والے نسخے سے علاحدہ کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح سے ڈاکٹر گیان چند نے یہ ثابت کر دیا کہ پنجاب یونیورسٹی والے نسخے کا وہ روٹو گراف جو ۱۹۵۷ء کے آخر میں قاضی عبدالودود صاحب لاہور سے لے گئے تھے اور امتیاز علی مرثی نے اپنے مرتبہ ”دیوان غالب“ طبع اول ۱۹۵۸ء میں استعمال کیا ہے اور وہ اب رضا لاہیری رام پور میں محفوظ ہے، وہ اس نسخے کا روٹو گراف ہے جو پنجاب یونیورسٹی سے سرحد ہو گیا ہے اور جسے اب مصین صاحب نے ”نسخہ خوبہ“ کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ مصین صاحب نے جو ”دیوان غالب“ ”نسخہ خوبہ“ کے نام سے شائع کیا ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری کا نسخہ سرحد ہی ہے جس کا روٹو گراف صحیح و سالم حالت میں رضا لاہیری رام پور میں محفوظ ہے۔ اب ذرا قدرے تفصیل سے اس قضیہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ”ماہ نو“ کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء میں ایک مضمون بعنوان ”دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ“ اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہوری میں داخل ہونے والے ”دیوان غالب“ کے ایک قلمی نسخے کے متعلق لکھا تھا۔ اس مضمون میں توثیق کلام اور اشعار شماری کے سلسلے میں سید عبداللہ صاحب سے چند معمولی معمولی فروگزاشتیں ہو گئیں۔ بعض اشعار کے متعلق لکھ دیا کہ وہ اس نسخے میں نہیں ہیں اور کہیں تعداد اشعار کی غلطی ہو گئی۔ نومبر ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالودود صاحب لاہور آئے اور پنجاب یونیورسٹی لاہوری والے اس نسخے کا روٹو گراف لے گئے۔ امتیاز علی مرثی نے ۱۹۵۸ء میں ”دیوان غالب کی ترتیب کے وقت اس روٹو گراف کا استعمال کرتے ہوئے اسے ”نسخہ لاہور“ قرار دیا۔ مرثی صاحب سے بھی ”نسخہ لاہور“ کی تفصیلات بیان کرنے میں کچھ فروگزاشتیں ہو گئیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کے روٹو گراف لینے کے بعد کسی زمانے میں وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری سے ہٹا لیا گیا۔ اس سلسلے میں مدت تک خاموشی رہی۔ جب ۱۹۹۸ء کے آخر میں مصین صاحب نے ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ شائع کیا تو چونکہ یہ وہی پنجاب یونیورسٹی والا

نسہ مسروق تھا اور معین صاحب کے دل میں چہرہ تھا، موصوف نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ کسی صورت اسے پنجاب یونیورسٹی والے مسروق نسخے سے مختلف کوئی دوسرا نسخہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ مجھے ۱۹۸۱ء کے قریب یہ مخطوطہ انارکلی بازار کے کسی کپڑائی سے ملا تھا اور یہ نسخہ اس نسخے سے مختلف ہے جس پر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۳ء کے ”ماہ نو“ کراچی میں مضمون لکھا تھا اور یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے والے نسخے کے اس ریڈو گراف سے بھی مختلف ہے جسے ۱۹۵۸ء میں مرثی صاحب نے استعمال کرتے ہوئے اسے ”نسہ لاہور“ قرار دیا تھا۔ دونوں جگہ معین صاحب نے انہی معمولی معمولی کوتاہیوں کی بنیاد بنایا جو سید عبداللہ اور مرثی صاحب سے سرزد ہوئی تھیں۔

سید معین الرحمن صاحب کا مروجہ ”دیوان غالب، نسہ خولہ“ مجھے کافی تاخیر سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ایک نظر دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تو وہی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے والا مسروق نسخہ ہے۔ معین صاحب نے ”نسہ خولہ“ میں ہر ورق پر دائیں جانب مخطوطے کے متن کا عکس اور بائیں طرف اس کے مروجہ الفاظ میں شطیق قرأت درج کی تھی۔ سید عبداللہ نے اپنے مضمون کے ساتھ اس مذہب و مریض مخطوطہ ”دیوان غالب“ کے اولین دو صفحات کی فوٹو کاپیاں بھی ”ماہ نو“ کراچی میں شائع کرائی تھیں۔ وہ میرے پاس موجود تھیں۔ میں نے فوراً ان دو صفحات کی فوٹو کاپیوں کا معین صاحب کے ”نسہ خولہ“ کے اولین دو صفحات سے مقابلہ کیا تو یقین ہو گیا کہ یہ تو ایک ہی نسخے کی کاپیاں ہیں، جیسا کہ اب ڈاکٹر گیان چند نے بھی یہی کہا ہے:

”حسین نے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، مرثی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور ”نسہ خولہ“ کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں، ان کی وحدت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی بیک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں“ (انتباس از مقالہ ڈاکٹر گیان چند مشمولہ ماہنامہ ”سورج“ لاہور بابہ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۸) اس بات کو جناب رفیق احمد نقوی نے بھی اپنے مضمون میں اس طرح لکھا ہے:

”ان تمام باتوں سے قطع نظر حسین فراتی نے اپنے کتابچے کے آخر میں جو مختلف عکس شائع کیے ہیں، ان کو دیکھ کر ایک عام آدمی بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ مختلف عکس

ایک ہی نسخے کے ہیں۔ کوئی کاتب ایک ہی مسودہ کو سامنے رکھ کر اگر دو، ایک جیسے نسخے بنانا چاہے تو وہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اس کے لفظوں کی نشست، لفظوں کی جگہ اور کشش کے اعجاز میں ہر صفحہ میں کہیں نہ کہیں ضرور فرق ہو گا، جبکہ سید عبداللہ کے حصارفہ نسخے، عرشی صاحب کے فراہم شدہ رٹلو گراف اور ”نسخہ خواجہ“ کے متعلقہ صفحوں کے عکس میں سر نہ فرق نہیں اور ”نسخہ خواجہ“ میں جہاں فرق پیدا کیا گیا ہے، وہیں سے چوری پکڑی جا رہی ہے۔ (مضمون ”ادبی دنیا میں مکروہ ریا اور جعل سازوں کی ہجرت انگیز روداد“ از رفیق احمد نقشب۔ مشورہ ماہنامہ ”سورج“ لاہور۔ پابند فروری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۸)۔

ہندوستان کے ماہر باز، بافتح نظر محقق، نقاد اور دانشور ڈاکٹر حنیف نقوی اور رشید حسن خاں صاحب نے بھی سید مصین الرحمن صاحب کے ”نسخہ خواجہ“ کے سلسلے میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں والا وہ نسخہ، جس پر سید عبداللہ نے ”ماہ نو“ کراچی، پابند جولائی ۱۹۵۳ء میں مضمون لکھا تھا اور اس کا رٹلو گراف، جو قاضی عبدالودود صاحب پنجاب یونیورسٹی لاہور سے لے گئے تھے اور جسے امتیاز علی عرشی صاحب نے ”نسخہ لاہور“ کے طور پر اپنے دیوان غالب مجلد ۱۹۵۸ء میں استعمال کیا تھا اور آپ نے ”نسخہ خواجہ“ کے طور پر حصارفہ کرا رہے ہیں، یہ سب ایک ہیں اور وہ ایک پنجاب یونیورسٹی لاہور میں والا نسخہ ہی ہے۔ یعنی مصین صاحب کو یہ ہادر کرا دیا گیا تھا کہ آپ جسے ”نسخہ خواجہ“ کہہ رہے ہیں وہ وہی نسخہ ہے جو پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چوری ہوا تھا، لیکن مصین صاحب ذہین بن کر ڈٹے رہے۔ کبھی ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے مختلف نسخے بناتے رہے، کبھی قوام نسخے کی کہانی گھڑتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ڈاکٹر حمین فراقی نے ”نسخہ خواجہ“ پر اس درجہ وزنی اور ناقابل تردید اعتراضات وارد کیے اور یہ ثابت کر دیا کہ یہ وہی پنجاب یونیورسٹی والا مسروقہ نسخہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی متن کی بے شمار تدوینی غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا کہ مصین صاحب غیر موزوں طبع شخص ہیں۔ جو میٹر اور نظم میں امتیاز کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ اس کے جواب میں مصین صاحب کا ایک کتابچہ آیا جو ”نذر گناہ بدتر از گناہ“ ثابت ہوا۔ چارے کتابچے میں حمین فراقی صاحب کے کسی ایک اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ جواب کی جگہ ”تجوہ، حمین“ میں شامل کسی بڑی شخصیت کا اپنی شان میں لکھا ہوا کوئی قصیدہ نقل کر دیتے ہیں کہ آپ بھری

ظہیوں کی گرفت کرتے ہیں اور اتنے بڑے بڑے نامور شعراء میری تعریف و توصیف میں دُعا کرتے ہیں۔ نہایت قابل خدمت یہ بات ہے کہ معین الرحمن صاحب نے حسین فراقی صاحب کے اعتراضات کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا ہے، اس میں فراقی صاحب کے سلیطے میں جو چٹک آمیز لہجہ اور پوچ زبان استعمال کی ہے، وہ کسی اہل علم سے متوقع نہیں ہو سکتی۔ فراقی صاحب نے اپنے کتابچہ میں جس اعلیٰ ظرفی، علم اخلاق اور شہادتِ یحییٰ کا مظاہرہ کیا ہے، وہ لائقِ داد ہے۔ اس کے برعکس معین صاحب کا اسلوب نگارش سزاوارِ نقریں و طعنت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے! معین صاحب اپنے معترض کا تعارف ان الفاظ میں کر رہے ہیں: "ایک کم عمر معاصر حسین فراقی کی نوکِ قلم نے اس کام پر مجھے حدِ وجہ "بے پایاں بیداد" کا نشانہ بنایا، وہ بھی انہی طرز (وکھری ناپ) کا تجربہ ہے۔" یہ سب کو معلوم ہے کہ فراقی صاحب کی عمر پچاس سال سے زائد ہے اور معین صاحب کی ۵۸ سال ہے۔ یعنی عمروں میں صرف چند سال کا فرق ہے۔ معین صاحب کے "کم عمر" کہنے سے قاری یہ سمجھتا ہے کہ کوئی میں کچیس سال کا لوطا ہو گا۔ بے شک فراقی صاحب معین صاحب سے چند سال چھوٹے ہیں لیکن علمی فضیلت کے اعتبار سے وہ کوہِ ہمال ہیں اور ان کے مقابلے میں معین صاحب ایک پرکاش ہیں۔ اس لیے کہا گیا ہے: "بزرگی چھل است نہ ببال۔" معین صاحب اپنی علمی بے بیگناہی اور فرومانگی کے ساتھ منافق بھی ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں اخلاقِ فضیلہ کے حامل نظر آتے ہیں لیکن یا وہ گوئی اور لہجہ پن میں تمام حدود بھانگ جاتے ہیں، جس کا اظہار وہ اپنے کتابچہ میں جا بجا فراقی صاحب کے ذکر میں کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر تو وہ تھکوں اور عورتوں کی طرح کوسنے دینے لگتے ہیں۔ مثلاً صفحہ ۳۳ پر رقم طراز ہیں: "میں پتہ نہ لگا ہوں اس وقت سے کہ تـ۔ف کو اپنی اولاد یا اخلاف سے اپنے یا اپنے بزرگوں کے بارے میں کچھ ایسا سنتا ہے۔"

حسین فراقی صاحب نے "لکھنؤ" کا جائزہ لیتے ہوئے معین صاحب کے کیے ہوئے دج ان غالب کے قاری دیکھتے اور خیر دشمن کی قاری تقریباً کے اردو تراجم کی ظہیوں کی نشان دہی کی ہے اور تدوینِ متن کے سلیطے میں ان کی غیر موزوں طبع کے سبب عروضی اسقام بھی بتائے ہیں۔ معین صاحب ان کا جواب تو کیا دیتے، انہ ان کی فارسی دانی اور عروضی استعداد کا مذاق اڑاتا ہے۔ حسین صاحب کی فارسی دانی، موزونی طبع اور مہارت

عروض کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند جیسے بین الاقوامی محقق نے "نئو خوبہ" پر ان کے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے جو داد دی ہے، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے: "مختلطے میں "حیری" ہے لیکن مرتب ("معین الرحمن) نے اپنی تالیف کتابت میں نئو عری کی تقلید میں "تری" لکھا ہے، جس سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ مشاہدہ غیر معمولی عروض دان ہی کر سکتا ہے۔ یہ شامت کرنا کہ مصرع "حیری" سے سوزوں اور 'تری' سے غیر سوزوں ہو جاتا ہے قصین کی مہارت عروض پر قصین کا غالب ہے۔

"قصین فراتی نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمہ میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں وہ مایہ نقر ہیں۔ اس سے مجھے تذبذب ہو گیا ہے کہ قصین شعبہ اردو کے استاد ہیں یا شعبہ فارسی کے۔ انھوں نے "نئو خوبہ" سے بیشتر ان نثریوں کے ترجموں کی جو تفصیلی نشان دہی کی ہے، وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔"

(انتخابات مقالہ مصنف ڈاکٹر گیان چند مفتول ماہنامہ "سورج" لاہور۔ ایڈ جنوری ۲۰۰۱ء۔ صفحہ ۱۹)

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب نے "نئو خوبہ" کی اشاعت کے ساتھ ہی برصغیر کے ستر گھنٹہ دانشوروں سے "نئو خوبہ" کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کے قصائد لکھا لیے تھے اور یہ کام اتنی سرعت کے ساتھ کیا گیا کہ جو حضرات محضوں اور برسوں کسی کتاب پر تہرہ کے لیے دھت نہیں نکال پاتے، ان کی گردن پر گھنٹا رکھ کر ان سے بھی کتاب کو پڑھے بغیر قصائد لکھائے گئے۔ معین صاحب نے جس چابکدستی اور عیاری سے ان لوگوں سے لٹا تھرے اور آراء حاصل کی ہیں، وہ لائقِ داد ہے۔ ان میں ایسے ثقہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے محض تحسین صورت ہی کو دیکھا اور اس کی معنوی خامیوں سے آگاہ ہوئے بغیر ہی قصیدہ لکھ دیا۔ ایسے حضرات اب بچتے رہے ہیں اور بچتے رہیں گے۔ معین صاحب ہیں کہ ان کی تحریروں کو بار بار ہر جگہ اپنے حق میں استعمال کر رہے ہیں۔ معین صاحب نے "نئو خوبہ" پر ان قصائد نما تہرہوں کو جمع کر کے "دیوان غالب، نئو خوبہ۔ تجزیہ و تحسین" کے نام سے علاحدہ ایک کتاب شائع کر دی۔ اب ہر اعتراض کے جواب میں ان کے پاس یہی جواب ہے کہ اتنے بڑے بڑے آدمیوں نے تو میری شان میں یہ قصائد لکھے ہیں، ان کے مقابلے میں آپ کے اعتراض کی کیا حیثیت ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر قصین فراتی کے کتابچے کے جواب میں غیر سلیبدگی کے ساتھ لہجہ

زبان میں یہی روش برقرار رکھی گئی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر حسین فراقی نے نٹان دی کی ہے معین صاحب کے ناموزوں طبع ہونے کے سلسلے میں معین صاحب، رشید احمد صدیقی صاحب کی کورانہ تقلید پر فخر کرتے ہوئے اس باب میں رقم طراز ہیں:

”رشید صاحب کے ارشادات کو میں اپنا بیان واقعی جانتا ہوں۔“ اس کے بعد رشید احمد صدیقی کا ایک قول بغیر کسی حوالے کے نقل کیا گیا ہے کہ کہاں سے لیا؟ یہ معین صاحب کی عادت ہے کہ تصنیف، تالیف کے سلسلے میں وہ صرف نام لکھ دیتے ہیں اور یہ نہیں لکھتے کہ یہ ان کی کس کتاب یا مضمون سے لیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے رشید احمد صدیقی کا یہ قول بغیر کسی حوالے کے نقل کیا ہے:

”میں ان لوگوں میں ہوں جن کو موزوں اشعار بھی اس وقت تک یاد نہیں ہوتے جب تک انھیں ناموزوں نہ بتالیا جائے۔“ اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں: ”میرے لیے رشید صاحب کی تحریریں دستور العمل اور رہنمائے حیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے اور دوسروں کے بھی اچھے برے کارناموں اور رویوں کا ہوازا اور جواب مجھے رشید صاحب سے مل جاتا ہے۔ وہ میرے لیے کیا کچھ نہ تھے، میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان، میری ساری کائنات تھے وہ۔“ یعنی رشید احمد صدیقی موزوں طبع نہ تھے اور کوئی موزوں شعر انھیں اس وقت تک یاد نہیں ہوتا تھا جب تک وہ بغیر موزوں نہ بن جائے۔ لاجل و لافلہ۔ ایسا غیر موزوں طبع آدمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا چیئر مین تھا، یعنی اردو ادب کی تدریس پر مامور رہا، جس ادب کا فضل سے زائد سرمایہ محکوم ہے۔ جو شخص خود شعری موزونیت کو سمجھنے سے عاری ہو، وہ ادب اردو کا اچھا استاد کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ بات اگر طبعیات، کیمیا، نباتات، معاشیات، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کا پروفیسر کہتا تو کوئی مضائقہ نہیں تھا، لیکن اگر اردو کا استاد یہ بات کہے تو برا لگتی ہے۔ بہر حال چونکہ فراقی صاحب نے معین صاحب کو غیر موزوں طبع ہونے کا طعن دیا تھا، انھوں نے رشید احمد صدیقی کی بھڑی میں اپنی اس غای کو بھی باضابطہ عارض نہیں کیا۔ تہذیب اخلاق کے اصول و مسلمات میں تو یہ ہے کہ کسی مرشد کی اچھی عادتوں کی تقلید کرنی چاہیے اور اس کی خامیوں کو اپنے لیے دستور العمل نہیں بنانا چاہیے لیکن یہ تو کوئی جواب باصواب نہیں ہے کہ چونکہ رشید احمد صدیقی طبع غیر موزوں رکھتے تھے، اس لیے میں بھی طبع غیر موزوں رکھتا ہوں۔

حسین فراقی صاحب نے ان کو غیر سوزوں طبع کہا تھا جسے انہوں نے رشید احمد صدیقی صاحب کے حوالے سے بے چون و چرا تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس پر فخر کیا ہے کہ وہ غیر سوزوں طبع رکھتے ہیں۔ یہاں اعتراض یہ ہے کہ جو شخص خود غیر سوزوں طبیعت رکھتا ہو اور نظم و نثر میں امتیاز کی صلاحیت سے عاری ہو، وہ کسی دیوان اور وہ بھی ”دیوان غالب“ کی ترتیب و تدوین کیا خاک کرے گا۔ یہی کچھ معین صاحب نے دیوان غالب کے ساتھ کیا ہے۔ یوں ان کے غیر سوزوں طبع ہونے کے سلسلے میں جناب رفیع احمد نقشب صاحب لکھتے ہیں:

”ان (رشید حسن خاں) کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے کتاب (غالب اور سن ستاون) طبع سوم (دہلی ۱۹۸۸ء) میں غالب کے ایک مصرعہ کا حلیہ بنا کر رکھ دیا کیوں کہ شکر ادا کیجیے اس لطف خاص کا۔ معین صاحب نے یہ مصرعہ اسی صورت میں ”جاگیر غالب“ کے مقدمہ کے اختتام پر کتاب کے ناشر عہد امید چودھری کی خدمت میں پیش کیا ہے (ص ۳۱)۔ غالب کا شعر ہے۔

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطف : کس کا

پندش ہے اور پائے خن دریاں نہیں

ایک ایسا شخص جو غالب کے ایک مشہور مصرعے کو ایک سے زائد جگہوں پر ہے وزن اور بے ربط کر کے لکھتا ہو، ماہر غالبیات ہونے کا دعوے دار ہے، بلکہ اصغر عدم سید کے نام سے چھپنے والی تحریر میں اسے غالب شاعری میں سب سے معتبر شخصیت اور غالب کے سب سے بڑے محقق و نقاد کے گراں قدر الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ تقویر تو، اسے چربا گرواں تقو!

ڈاکٹر حسین فراقی نے اعتراض کیا ہے کہ معین صاحب نے ”دیوان غالب“ کے ساتھ کھاڑی سے جو دوسری کتابیں خریدی ہیں، انہیں ”دیوان غالب“ نسخہ خواجہ کے آخر میں ماخذات میں شامل کر دیا ہے، حالانکہ ”دیوان غالب“ کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان کتابوں سے کسی قسم کا اغذ و اقتباس عمل میں نہیں آیا ہے۔ مگر وہ ماخذات کیسے بن گئیں؟ تصنیف و تالیف کے نام پر ہزاروں صفحات سیاہ کرنے والا شخص اصولی ترتیب و تدوین سے بالکل نا آشنا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے بھی معین صاحب کے دیوان غالب

جہل پر ولادت کرتا ہے۔ معین صاحب نے ”معارف الملوۃ“ کے آگے بریکٹ میں (قلمی ۱۳۸۶ء) لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معین صاحب کا مخطوط ۱۳۸۶ء کا مکتوب ہے۔ جبکہ اس زمانے میں قلمی کتابوں پر سن کتابت جبری لکھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں سن ہجری رائج ہی نہیں تھا۔ میں پہنچ کرتا ہوں کہ اگر معین صاحب کسی ”معارف الملوۃ“ پر سن کتابت ۱۳۸۶ء لکھا ہوا دکھا دیں تو میں عمر بھر کے لیے غلط غائی ان کے حق میں تحریر کر دوں گا۔ جب معین صاحب مخطوطات کو سمجھتے ہی نہیں تو پھر اس قسم کے پتکے لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح معین صاحب نے علامین ہروی کی وفات ۱۵۰۱ء لکھی ہے۔ یہ بھی جبری سن میں ہونی چاہیے تھی۔ بے شک جبری کے ساتھ مطابق سن ہجری درج کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن بنیادی طور پر سن کتابت جبری ہوتا ہے۔ اگر معین صاحب کے الفاظ، قلمی ۱۳۸۶ء کو صحیح تسلیم کر لیں تو ۱۳۸۶ء ۸۹۱ھ کے مطابق ہوتا ہے جو ”معارف الملوۃ“ کا سن تالیف ہے۔ دراصل ”معارف الملوۃ“ ان پچاس خطبات کا مجموعہ ہے جو سیرت النبی ﷺ کے سلسلے میں علامین الدین الشحرہ معین مسکین نے مختلف اوقات میں جامع مسجد ہرات میں ارشاد فرمائے تھے۔ بعد میں انہیں جمع کر کے مجموعہ کا نام ”معارف الملوۃ“ رکھ دیا گیا۔ ۸۹۱ھ اس کا سن تالیف ہے۔ آج دنیا بھر کے کسی کتاب خانہ میں ”معارف الملوۃ“ کا کوئی مخطوط قلمی ۱۳۸۶ء کا نہیں ہے۔ معین صاحب نے چونکہ کبھی مخطوطات پر کام نہیں کیا اس لیے وہ کسی مخطوطے کی تفصیل قلمبند کرنے سے قاصر ہیں۔ مخطوطے کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کاتب کا نام اور سن کتابت ضروری ہوتا ہے۔ یوں تو ”معارف الملوۃ“ حدود بار شائع ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی عام ملتے ہیں۔ اگر معین صاحب اپنی کتاب کو تادیر اور اہم سمجھتے تھے تو انہیں اس کی تدریس بھی بتانی چاہیے تھی جس سے وہ مطلقاً قاصر رہے۔ اور وہ اپنی عادت اور سرشت کے مطابق اپنی کوتاہی اور غلطی تسلیم کرنے کے بجائے فراقی صاحب کے لیے لکھتے ہیں کہ ”اس ضمن میں ان کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں۔ اس لیے اگر ناقص یا ناقص ہیں تو قابل معافی ہیں۔“ (کتابچہ مسند معین الرحمن صاحب صفحہ ۲۰)۔

حقین فراقی صاحب نے اصول ترتیب و تدوین متن کے سلسلے میں معین صاحب کی بے خبری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ فراقی صاحب نے ہی نہیں دوسرے خطا بھی معین

صاحب کی اس عدم واقفیت کے شاک کی ہیں۔ سید قدرت نقوی نے ”نسخہ خواہد“ کا جائزہ لیتے ہوئے متعدد مقامات پر مصین صاحب کے اصول ترتیب و تدوین متن سے ناواقفیت واضح کی ہے۔ وہ اپنی تالیف ”نسخہ خواہد یا نسخہ مسروق“ ناشر مکتبہ تحقیق ادب، کراچی اگست ۲۰۰۰ء کے مرقومہ الذیل صفحات پر رقم طراز ہیں:

۱۔ صفحہ ۲۷: ”یہ سو تو کاتب کا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تو مرتب (مصین الرحمن صاحب) کی غفلت اور غیر حاضر دماغ کی جگہ کاری ہے۔ دوسرے قصیدے میں اور بھی زیادہ تعجب نثر بات یہ ہے کہ قصیدے کے کُل اشعار تراسی (۸۳) گوشوارے میں درج کیے ہیں۔ متن میں شمار کیا گیا تو تعداد پچیس (۴۳) ہے۔ یہ چالیس (۴۰) شعر کہاں سے آئے اور کہاں غائب ہو گئے، اس کا علم مصین الرحمن ہی کو ہو سکتا ہے۔“

۲۔ صفحہ ۲۹: ”اس کیچر کے دور میں جمع کرنے میں اتنی بڑی غلطی واقع ہونا ایک تعجب نثر امر ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز، تعجب نثر مصین الرحمن کا یہ بیان ہے جس سے ان کی فہم ادب اور نظم و نثر کی اقسام سے واقفیت بدرجہ اتم ہو گیا ہے۔“

۳۔ صفحہ ۳۳: ”ہمارے محقق اعظم مصین الرحمن نے غزل کے مطبوعہ مطلع کا یہ مصرعہ ”وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے“ لکھ کر پوری غزل کو ۱۸۱۲ء کی قرار دے دیا ہے۔“

۴۔ صفحہ ۳۳: ”حق تدوین جب ادا ہوتا کہ از خود نسخ کی حقیقت معلوم کرتے۔ نسخہ کے حلق ان کے تمام تر بیانات سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کے بیانات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں بلکہ بعض جگہ ان کے بیان کے خلاف عمل ملتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود نے ایک شعر کی نشان دہی کی ہے کہ یہ مخطوطہ میں ہے۔ جدول میں نہیں۔ تصدیق کرتے وقت مخطوطے میں موجود شعر کو چھوڑ دیا اور جدول کا شعر نقل کر دیا۔ ایسا صرف اس وجہ سے ہوا کہ نسخہ عرشی یا کسی اور دیوان سے وہ شعر نقل کر دیا جو جدول میں ہوتا ہے مگر مذکورہ نسخہ میں نہیں ہے۔“

المحب! المحب!! اسے کہتے ہیں کورانہ تقلید۔ یہی حال لوح، جدول اور نقش ہونے

کا ہے۔ نہ لوح کی کوئی خرافات ہے اور نہ نقوش کی وضاحت اور نہ گل بوئے اور نیلوں کی حالت و کیفیت بیان کی ہے۔ میں نے نسخ شیرانی کی متعلقہ و رنگین لوح اور ”عود ہندی“ کے سادہ نقشیں سرورق کے تیل پتوں وغیرہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ مصین الرحمن ان دونوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے تھے اور مذکورہ نسخے کی کیفیات ترخیم بیان کر سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اول تو انھوں نے، ان تین بزرگوں نے جو کچھ لکھا، اس کو نقل کر دیا اور اپنی دید و دانست سے کچھ نہیں لکھا۔ دوسرے یہ کہ خطاطی و ترخیم و آرائش کے فن سے عملاً اور عملاً بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ وہ روشی قلم اور ترخیمی گل کاریوں کے انداز کو نہیں جانتے۔ ان کے فرق و اختلاف کو نہیں پہچانتے۔ اسی وجہ سے انھوں نے اس نسخے کی بابت کوئی تفصیلی بات، لوح کی کیفیت اور اس کے نقوش کی حالت کے متعلق نہیں لکھی۔“

۵۔ صفحہ ۷۴: ”مقدمہ و تعارف اور حقیقت شناسی میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔“

۶۔ سید قدرت نقوی اپنے اسی کتابچے کے صفحہ ۷۴ پر ”نسخہ خوبہ“ کے نام کے سلسلے میں رقم طراز ہیں: ”عقیدت کا اظہار بذریعہ احتساب کیا جاتا ہے۔ مرحوم (خوبہ منظور حسین جن کے نام پر مصین صاحب نے دیوان غالب کا نام ”نسخہ خوبہ“ رکھا ہے) کے نام سے موسوم کرام مرحوم کی مدح بالذم ہے۔ وہ ان کے نام معنون کر سکتے تھے جس کا اظہار انھوں نے ”میرے کرم فرما“ کے زیر عنوان منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا مصین الرحمن ”منسوب“ اور ”موسوم“ کے فرق کو نہیں جانتے؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جائے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جائے۔ یہ خوبہ صاحب سے اظہار عقیدت کا کوئی اچھا طریقہ نہیں، بالخصوص اس حالت میں کہ نہ وہ مالک تھے اور نہ مرتب۔ مرحوم کے علمی مرتبہ کو اس سے بھیج نہ پڑتی ہے اور مصین الرحمن اس عجیب و غریب حرکت کے مرتکب ہوئے۔ یہ مرحوم کی تو جین و تکبیل کا سبب بھی بن سکتی ہے۔“

اس موقع پر ڈاکٹر گیان چند کے مقالے کا اقتباس یہ عمل نہ ہو گا:

۹۔ ”رشید حسن خاں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ اسے ”نسخہ خوبہ“ کہنے کا جواز نہیں

(صفحہ ۵۹)۔ میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سخت ناقابل اعتراض ہے۔ اس نسخے کا خوبہ منظور حسین سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے اسے

شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہر غالبیات نہیں تھے۔ مصین صاحب کی ان سے عقیدت سر آکھوں پر لیکن وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام کیلنگ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خانے کا نام "خوبہ منظور حسین منزل" رکھ دیں تو اس سے ان کا مکان تلاش کرنے والوں کو محالہ میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہوگا؟

۱۰۔ "وہ (مصین الرحمن) جو بار بار مخطوطے کو "نسخہ خوبہ" کہتے ہیں۔ اس سے مجھے دھچکا لگتا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں "نسخہ خوبہ" میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترنیم یا تنسیخ ہوتی ہے" (صفحہ ۲۰)۔ غالب نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ وہ جس نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں وہ نسخہ غالب نہیں "نسخہ خوبہ" ہے۔ کون سا خوبہ، خوبہ کلام الدین لایا، یا خوبہ میر درد؟

(مقالہ ڈاکٹر گیان چند، مشمول ماہنامہ "سورج" لاہور، بابت جنوری ۲۰۰۱ء، صفحہ ۱۹، ۲۰)

ڈاکٹر حسین فراقی نے نسخہ خوبہ کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا مسروقہ نسخہ ثابت کرنے کے لیے جو بہت سے دلائل دیے ہیں، ان میں یہ بھی ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری اپنی ہر کتاب کے صفحہ ۲۲ پر "ایکسیشن نمبر" (Accession No.) لکھتی ہے۔ چنانچہ "نسخہ خوبہ" کے صفحہ ۲۲ پر نیچے کے حصے کو کھرا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ایکسیشن نمبر" منادیا گیا ہے۔ اسی طرح نیچے کے آخر میں جہاں یونیورسٹی لائبریری کی نمبر تھی اس پر "نئے دین" یا "فتح دین" کی چٹ لگا دی گئی ہے۔ "ایکسیشن نمبر" اور یونیورسٹی لائبریری کی مہر کی تختی، نیچے کے چوری ہو جانے کے بعد کی گئی ہے اور یقیناً اسی نے کی ہو گی یہ جس کے پاس رہا ہو گا۔ پھر ڈاکٹر گیان چند نے اس حصے کو بھی حل کر لیا ہے اور انہوں نے سراغ لگا لیا ہے کہ قاضی عبدالودود نے ۱۹۵۷ء کے آخر میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے جس "دیوان غالب" کا رولہ کراف بنوایا تھا، وہ ابھی تک رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ وہ اپنے مقالے مشمول ماہنامہ "سورج" لاہور، بابت جنوری ۲۰۰۱ء، کے صفحہ ۱۸ پر رقم طراز ہیں:

"میں نے رضا لائبریری رام پور کے ڈائریکٹر کو لکھ کر درخواست دی کہ وہ رولہ کراف میں دیکھ کر صحیح صورت حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو رام پور کے ڈائریکٹر طہیر علی صدیقی کو جا کر یہ کام اس کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر حسین کا جواب آ گیا ہے۔

معین الرحمن نے اپنے کتابچہ میں لکھا ہے کہ "نسخہ لاہور" میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعہ کی صورت یہ ہے "جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑاگاں ہوگا" جب کہ صحیح ردیف "ہوتا" ہے۔ "ہوگا" نہیں۔

رام پور میں موجود کئی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت عرشی صاحب کے مشابہے کے مطابق ہے یا ان سے پاک ہو گئی۔ اگر کس کی شہادت عرشی صاحب کے مشابہے کی تائید نہ کرے تو گویا پھر "نسخہ خوبہ" کے میں میں "نسخہ لاہور" ہونے کے بارے میں کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا (صفحہ ۴۰)۔ ردو گراف دیکھ کر ڈاکٹر ظہیر نے میرے استفسارات کا جو جواب دیا ہے میں "نسخہ خوبہ" کا نسخہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں۔

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر ظہیر کے جواب سے فیصلہ کر دیا کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا "دیوان غالب" ہی "نسخہ خوبہ" ہے کیونکہ ردو گراف کے انتظام پر مدور میر میں "پنجاب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن ۶۸۱۲" لکھا ہوا ہے اور ردو گراف کے صفحہ ۲۲ پر "Accession No. 6812" تحریر ہے جو "نسخہ خوبہ" میں کھرجی دیا گیا ہے اور آخر میں مدور میر کی جگہ پر "نسخہ دین" کی چھپی لگا دی گئی ہے تاکہ یہ ثابت نہ ہو سکے کہ یہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اسی مقالے میں لکھتے ہیں

۳۔ دونوں نمبروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ "نسخہ خوبہ"، لائبریری کا کم شدہ "نسخہ لاہور" ہی ہے۔ قاضی صاحب نے ردو گراف ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں حاصل کیا۔ اس کے بعد کسی نے مخلوطے کو لائبریری سے اڑا لیا۔ دونوں مہموں کی جگہ کھرجی۔ آخری میر کی جگہ "نسخہ دین" کی چھپی لگائی۔ میر سے نزدیک "فتح دین" وجود خارجی سے محروم ہے۔

ڈاکٹر گیان چند نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے جو ردو گراف، "دیوان غالب" کا، قاضی عبدالودود ۱۹۵۷ء میں لے گئے تھے، وہ ادب "نسخہ خوبہ" ایک ہی ہیں، یعنی "نسخہ خوبہ" ہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی کاوش نے ڈاکٹر سید معین الرحمن کی تمام مسامی جیلے کو، جو وہ "نسخہ خوبہ" کو "نسخہ لاہور" سے مختلف ثابت کرنے کے حیلے میں کر رہے تھے، بالکل ناکام بنا دیا اور

ثابت کر دیا ہے کہ "نقطہ خولید" ہی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ تمام بحث ختم ہو جاتی ہے جو "نقطہ خولید" اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو دہ اور ایک ثابت کرنے کے لیے کی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کے بعد معین الرحمن صاحب کا کتابچہ آیا اور اس کے بعد سید قدرت نقوی کا کتابچہ اور آخر میں ڈاکٹر عارف ثاقب کا کتابچہ آیا، جس میں ڈاکٹر حسین فراقی اور ڈاکٹر سید معین الرحمن کے کتابچوں کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں نے جب معین صاحب کا جواب دیکھا کہ انھوں نے تو فراقی صاحب کے کسی ایک اعتراض کا بھی سنجیدگی سے جواب نہیں دیا ہے۔ میں خود یہ کام کرنا چاہتا تھا کہ فراقی صاحب کے اعتراضات کی فہرست ایک، دو، تین کر کے مرتب کروں اور انھوں کو اسلئے اعتراضات میں سے کسی ایک کا جواب بھی نہیں دیا گیا ہے۔ مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ یہ کام نوجوان محقق ڈاکٹر عارف ثاقب نے کر دیا۔ انھوں نے حسین فراقی صاحب کے اعتراضات ایک ایک کر کے علاحدہ علاحدہ لکھے تو ان کی تعداد ۲۶ ہو گئی۔ ان میں سے چند کے ناکافی اور غیر سنجیدہ جوابات معین صاحب نے دیے اور بیشتر اعتراضات کو ل کر گئے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید معین الرحمن نے ایک اور کتاب بعنوان "برسبیل غالب" ستمبر ۲۰۰۰ء میں مچاپ ڈالی۔ اس میں اچھا خاصا ایسا مواد شائع ہوا ہے جس کی بنا پر معین صاحب کے خلاف اڑواہ حیثیت عرفی کے سلسلے میں دواہ ۵۰۰ قیودرات پاکستان کے تحت مقدمات درج کرائے جاسکتے ہیں۔ اس کتاب میں بھی مسب عادت معین صاحب کی خود ساختہ کی اچھا ہے اور خود اپنی شان میں دوسروں کے قصائد نقل کیے ہیں۔ یہ کتاب کیا ہے، گند کی ایک بوٹ ہے اور غالب کا زبان میں "لیڈر جنرل" ہے جسے پڑھنے سے تھکی آتی ہے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے عظیم لوگوں کی ذلت و رسوائی کا انتقام کیا گیا ہے جن کے شانوں پر چڑھ کر معین صاحب اپنی ہالا قاضی کا ڈھنڈھا پیٹتے رہے ہیں اور اپنے حق میں حاصل کیے ہوئے ان کے بیانات کے اقتباسات ہر مشکل و انتہاء میں پیش کرتے رہے ہیں کہ دیکھیے ان جیسے فضلا نے تو میرے متعلق اس درجہ جیسی کلمات لکھے ہیں۔ میری مراد مجلس ڈاکٹر وحید قریشی اور مشتاق مشتاق خولید سے ہے جو اپنے اپنے میدان میں پورے برصغیر میں پکنا و پکاتہ ہیں۔ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ان کے خلاف گند اچھلا گیا ہے اور اس کی جی بھر کر تشہیر کی گئی ہے۔ اسے معین کئی

کہا جاتا ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس کوئی شخص آیا کہ فلاں شخص آپ کو سب دشمن کر رہا ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس نے میرے سامنے آکر تو کبھی ایسا نہیں کیا۔ البتہ تم ضرور کر رہے ہو۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے ہدایت فرمائی کہ کسی بات کو اس کی مکمل تصدیق کے بغیر آگے کسی سے نہ کہو کیونکہ اگر وہ بات غلط نکلے تو تم مایوس ہو گے۔ لطیف الزماں خاں صاحب نے اگر ان دونوں حضرات کے خلاف کوئی خط لکھا تھا تو اس خط کو سامنے لائے بغیر اس کی تصحیر بھی اسی زمرے میں آتی ہے، جس کے لیے نبی کریمؐ نے سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ آج تک وہ خط تو سامنے نہیں آیا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جعلی ہے اور ایک جعلی خط کی تصحیر کے سلسلے میں جن حضرات کی تصحیک و توثیق ہوئی ہے، وہ اس کی تصحیر کرنے والوں کو کیڑا کر دار تک پہنچانے کا حق رکھتے ہیں۔ کسی کے نام سے کچھ چھاپ دینا آسان ہے اور اگر اس کی اشاعت میں بدعتی بھی شامل ہو جائے تو کسی کے نام سے سب کچھ چھاپا جاسکتا ہے۔ اس کی تصحیر ہی سب سے بڑی بددیانتی ہے۔ اگر بمرض محال لطیف الزماں خاں صاحب نے ان دونوں حضرات کے خلاف کچھ لکھ بھی دیا تھا تو وہ کسی اختیار کے کالم میں چھپا تھا۔ معین صاحب کا وہاں سے اسے اپنی کتاب میں نقل کر کے اس کی دوامی تصحیر کا انتظام کرنا کون سا کارِ خیر ہے۔ ایسا کر کے معین الرحمن صاحب نے ان دونوں حضرات سے نہ جانے کون سی دشمنی نکالی ہے۔ لوگ گھج کہتے ہیں بھولی بھالی معصوم شکل والے مسینے ہوتے ہیں۔ مینا ہاتھانی لفظ ہے جس کا اردو میں یک لفظی ترجمہ، جو اس کے تمام مفہومات کو بخوبی ہے، مجھے نہیں معلوم۔ لطیف الزماں خاں صاحب کا کوئی خط اگر کسی روزنامے کے کالم میں چھپا تھا تو اس کا مطالعہ صرف اس کے چار کین تک محدود رہا اور وہ بھی ایک روز کے بعد ذہن سے نکل جاتا ہے، لیکن معین صاحب نے اسے اپنی کتاب میں شامل کر کے بڑی لمبی زندگی اور بڑا بخت دی ہے۔

کتاب ”بریکل غائب“ اسی نوعیت کی گندگی سے بھری ہوئی ہے۔ اسی کتاب میں عجیب عجیب متوج الذہن لوگوں کی ملاحیاں بھری ہوئی ہیں۔ صفحہ ۲۱۳ پر پروفیسر طیب منیر دہلوی سے رقم طراز ہیں:

”میری ڈاکٹر معین صاحب! ”فیضِ خلیفہ“ کے سلسلے میں ایک بزرگ بارہ دیا (کہتا) نے جب یہ فرمایا کہ وہ بخیردستی سے اڑایا گیا ہے تو میں نے دو تین کتابیں جو

فورت ولیم کالج کلکتہ کی لائبریری کی مملکت تھیں، ان کے سامنے رکھ دیں اور انتظار کیا کہ ان کتابوں کے بارے میں ارشاد ہو کہ یہ کہاں سے اڑائی گئی ہیں؟ اڑانے والا کون قرار پائے گا؟ اور ذمہ داری کا قصین کون کرے گا؟ ان کے پاس سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ تھا۔" جناب پروفیسر طیب منیر صاحب! ذرا معافے کو سمجھنے کی کوشش فرمائیے۔ فورت ولیم کالج کلکتہ کبھی کامر چکا ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہے۔ اس کا دعویٰ کون کرے گا۔ تانیا یہ کہ وہ ہندوستان میں تھا۔ ہر ملک کے قانون اس کی حدود میں ہی لاگو ہوتے ہیں۔ پاکستانی پولیس کسی زندہ ادارے کی شکایت پر فوجداری مقدمات قائم کرتی ہے۔ معین صاحب کے پاس یونیورسٹی کا پچرایا ہوا نسخہ "دیوان غالب" تھا۔ بے شک انھوں نے خود نہیں چھاپا تھا لیکن مال مسروقہ تو ان کی تحویل میں تھا۔ ان کے خلاف زیر دہ ۳۱۱ تعزیرات پاکستان کا ردوائی ہو سکتی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ایک زندہ ادارہ ہے۔ اس کی لائبریری کی کتابوں کے امین چیف لائبریرین اور وائس چانسلر ہیں۔ یہ صرف وائس چانسلر صاحب کی مہربانی ہے کہ معین الرحمن صاحب آج آزاد پھر رہے ہیں، مگر پروفیسر طیب منیر صاحب! آپ کے پاس پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی کوئی مسروقہ کتاب ہے تو وہ قابل دست اندازی پولیس ہے۔ اگر آپ کے پاس کسی پاکستانی قومی ادارے کی کوئی مسروقہ کتاب ہے تو آپ مجھے بتائیے اور پھر دیکھیے کہ قانون کس طرح حرکت میں آتا ہے۔ معین صاحب نے بھی اپنے مکتوب نگاروں کے خطوط شائع کیے ہیں کہ ان کھاڑیوں سے بہت سے اداروں اور شخصیتوں کی منسلکی کتابیں ملی ہیں، لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ وہ ادارے ختم ہو چکے ہیں اور وہ شخصیتیں وفات پا چکی ہیں۔ اگر کوئی ان کا دعویدار ہوتا تو ان کی مسروقہ چیزیں رکھنے والے سرکاری مہمان ہوتے۔ بے شک کھاڑیوں سے پرانی اہم و نادر کتابیں مل جاتی ہیں۔ اب تو یہ سلسلہ بہت کم ہو گیا ہے۔ میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۶۳ء تک بلا تادم پورے پندرہ سال، ہر اتوار کو لاہور کے مختلف مقامات پر ریڑھیوں سے پرانی کتابیں خریدتا رہا ہوں۔ تقسیم کے فوراً بعد بہت بڑے بڑے کتاب خانے ریڑھیوں پر فروخت ہوئے ہیں۔ اب تو ایسا نہیں ہے، لیکن اس زمانے میں قلمی کتابیں بھی کھاڑیوں سے مل جاتی تھیں۔ مجھے کھاڑیوں سے اچھائی نادر مطبوعہ کتابیں تو بہت ملی ہیں اور سادہ قلمی نسخے بھی خریدے ہیں لیکن مجھے کبھی کوئی مذہب، مرثعہ اور حرین شاہانہ نسخہ کسی کھاڑی سے

نہیں ملا، اور مجھے یقین ہے کہ پورے پاکستان میں کسی شخص کو بھی ایسا مذہب شامانہ مخلوط کبھی کسی کباڑی سے نہیں ملا ہو گا۔ سید مصین الرحمن صاحب کا یہ دعویٰ کذب بیانی ہے کہ انھیں اتنا مذہب شامانہ نسخہ ۱۹۸۱ء میں کسی کباڑی سے ملا تھا جس کا ڈی گس ایڈیشن وہ ڈیڑھ ہزار روپے میں فروخت کر رہے ہیں۔ پورے پاکستان میں مجھے کوئی شخص یہ قاعدے کہ اتنا مذہب، مرصع اور حریں نسخہ اسے کبھی کسی کباڑی سے ملا ہے؟ کبھی نہیں ملا ہو گا۔ مصین الرحمن صاحب جھوٹ اور افترا سے کام لے رہے ہیں۔ بے شک نسخہ انھوں نے خود نہیں چرایا لیکن مال مسروقہ کو اپنی تحویل میں رکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے جرائم ان سے سرزد ہوئے ہیں۔ وائس چانسلر صاحب اور چیف لائبریریئر پنجاب یونیورسٹی کی بطور امین اپنے فرائض کی بجا آوری کی کوتاہی اور جذبہ رزم ہے کہ مصین الرحمن صاحب کے خلاف ابھی تک تعزیری کارروائی عمل میں نہیں آئی ہے۔

”برسبیل غالب“ کے آخری حصے میں دو تصاویر بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان تصاویر میں مصین صاحب ”نسخہ خوبہ“ کو اپنی ملکیتی کتاب کے طور پر ایک تقریب میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب للعلیٹ جنرل (ر) ارشد محمود کو تحفہ ارشاد دے رہے ہیں۔ یہ تقریب ۲۱ اگست کو وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں انعقاد پذیر ہوئی۔ اس وقت تک پورے ملک کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا مسروقہ ”دیوان غالب“ ڈاکٹر مصین الرحمن کے پاس ہے اور انھوں نے اسے ”نسخہ خوبہ“ کے نام سے شائع کر کے لاکھوں روپے بھی کمائے ہیں۔ اس کا عام ایڈیشن ۳۵۰ روپے کا اور ڈی گس ایڈیشن ۱۵۰۰ روپے کا ہے جو ہزاروں کی تعداد میں بچھا کر ملک سے باہر ایکسپورٹ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے پنجاب یونیورسٹی کے اس چوری کے نفع سے لاکھوں روپے کمالینے کے بعد اسے یونیورسٹی کو ہی بطور عطیہ پیش کر دیا گیا ہے۔ وائس چانسلر صاحب کو یہ دھوکہ دیا کہ مصین صاحب اپنا لاکھوں روپے کا ملکیتی نسخہ یونیورسٹی کو بطور عطیہ پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ چند اصحاب کی سازش سے ایک مال مسروقہ رکھنے والا شخص واجب الاحرام معطلی بن گیا اور اس کی شان میں قصیدے پڑھ کر اسے ہم دوش پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر وقار عظیم اور پروفیسر خوبہ منظور حسین بتاتے ہوئے اس چوری کے مال کو خیر کثیر اور خیر جاریہ کہا گیا۔ مصین صاحب نے یونیورسٹی لائبریری کے اس نسخے کو لمپیٹ کرا کے چاندی کے خوبصورت کیس میں سما

ترقیات کیا۔ یہ تقریب ۲۱ اگست ۲۰۰۰ء کو وائس چانسلر صاحب کے دفتر میں ہوئی۔ ۲۳ اگست ۲۰۰۰ء کے روزنامہ ”دن“ لاہور کے کالم میں ڈاکٹر اسماعیل نیازی نے لکھا: ”کیا کوئی کسی انخواہ شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلہن بنی ہوئی ہو اور اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔“ وائس چانسلر صاحب پنجاب یونیورسٹی کے لیے یہ الفاظ لائق توجہ ہیں۔

۲۱ اگست ۲۰۰۰ء کو جب یہ مسروقہ نسخہ یونیورسٹی کو ہی بطور بدیہ وار معائنہ واپس کیا گیا اس وقت تک ہر ایک کو یہ علم ہو چکا تھا کہ یہ یونیورسٹی کا ہی مسروقہ نسخہ ہے۔ چیف لائبریریئر پنجاب یونیورسٹی لائبریری بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تقریب میں مال مسروقہ رکھنے والے شخص کو سیر دھایا جا رہا ہے لیکن اسے بھی اپنا فرض منصبی یاد نہیں آیا کہ وہ وائس چانسلر صاحب سے کہہ دے کہ یہ تو ہمارا اپنا نسخہ ہے جو ہاؤس کے تحت واپس کیا جا رہا ہے۔

ایک صاحب نے یہاں تک مبالغہ فرمایا کہ معین صاحب اپنا ملکیتی ذاتی نسخہ جو ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ قیمت کا ہے یونیورسٹی کو بطور بدیہ پیش کر رہے ہیں۔ اس تقریب کے تمام شرکاء اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھے کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہی مسروقہ نسخہ ہے لیکن تقریب میں شریک ہونے والے کسی شخص نے بھی وائس چانسلر کو اصل صورت حال سے آگاہ نہیں کیا کہ آپ اپنی ہی محتاج مسروقہ کو اس اعزاز و اکرام سے واپس لے رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار کا تو یہ فرض ہونا چاہیے تھا کہ معلوم ہو جانے پر وہ ملک کے موجودہ قانون کے تحت زیر دفعہ ۴۱۱ ت پ مقدمہ درج رجسٹر کرا کے نسخہ برآمد کراتے اور پھر تفتیش کر کے معلوم کیا جاتا کہ یہ نسخہ کس طرح یونیورسٹی لائبریری سے معین صاحب تک پہنچا اور معین صاحب کو اس نسخے کی اشاعت سے لاکھوں روپے کا فائدہ کسی طرح ہو گیا۔ اس نسخہ کی اشاعت صرف یونیورسٹی کی اجازت سے کی جاسکتی تھی۔ بصورت دیگر جو اشاعت ہوئی ہے وہ غیر قانونی ہے۔ اس سے حاصل کردہ تمام رقم یونیورسٹی کو واپس ملنی چاہیے۔ اب یہ احتساب ٹریل کا کیس بن گیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی رقم دلوائے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے بے شک وہ نسخہ خود تو نہیں چھپایا اس لیے اس کی برآمدگی کی وجہ سے دفعہ

۳۸۰ ت پ کے مجرم تو بنتے تھے لیکن مال مسروقہ ان کی تحویل میں تھا اس لیے اس کی برآمدگی کی وجہ سے ۳۷۱ ت پ کے مجرم ضرور تھے کہ چوری کا مال ان کی تحویل میں تھا اور اس سے انھوں نے لاکھوں روپیہ بھی کمایا ہے، اور اب تو صورت حال ہی بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ معین الرحمن صاحب نے اعتراف جرم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس طرح کہ انھوں نے ڈاکٹر حسین فراقی کے تمام اعتراضات اور تصحیحات کو قبول کر لیا ہے۔ ان میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہے کہ وہ علی الاعلان اس کا اعتراف فرمائیں لیکن فراقی صاحب نے ”نسب خونیہ“ کے عام ایڈیشن پر جو اعتراضات کیے تھے اور تصحیحات تجویز کی تھیں، معین الرحمن صاحب نے اس کے بعد تیار ہونے والے ڈی ٹکس ایڈیشن میں وہ تمام اعتراضات قبول کرتے ہوئے تمام تصحیحات کر دی ہیں۔ ان کا یہ امر کتنا سپر اندازی نہیں تو اور کیا ہے۔ مثلاً ”نسب خونیہ“ کے صفحہ ۲۲ پر یونسودینی لاہوری کی سرور انجلیکیشن نمبر کو کھر پٹنے کی وجہ سے جدول کا جو حصہ ختم ہو گیا تھا، ڈی ٹکس ایڈیشن میں وہ بحال کر دیا گیا ہے۔ دونوں ایڈیشنوں کے متعلق صفحات کے فوٹو ماہنامہ ”سورج“ لاہور ہفتہ فروری ۲۰۰۱ء کے صفحہ ۱۸ پر شائع ہو چکے ہیں۔ ہر شخص ملاحظہ کر سکتا ہے، لیکن ڈاکٹر سید معین الرحمن صاحب بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے جرائم کرتے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بکارتا۔ ”نسب خونیہ“ کے قضیہ کے دوران ان پر یہ الزام بھی لگا کہ انھوں نے اپنی ایک طالبہ بشری باسط کے ایم اے کے مقالے ”ادب جعفری، شخصیت اور شاعری“ کا کچھ حصہ اپنے نام سے ”رسالہ نقوش“ لاہور میں شائع کر دیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مقالے کے آغاز و اختتام کے اجزا ان کے لکھے ہوئے ہیں، جو ایک جرم ہے۔ ”نسب خونیہ“ کے جوابی کتابچہ میں معین الرحمن صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ ”اگر کسی نے کسی طور ان کا تحقیق مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم اے کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آ پاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں والدہ سے دور، تین برس کی طویل مدت گزار دینے کے بعد اور باوجود صرف بی۔ اے کی بی۔ اے وہ جاتیں۔“ (صفحہ ۵۵) یعنی یہ اعتراف کر لیا ہے کہ بشری باسط کے مقالے کا بڑا حصہ خود انھوں نے لکھ کر اسے ایم اے کی ڈگری دلائی ہے۔ یہ مقالہ ۲۰۰ نمبروں کا ہوتا ہے۔ امتحانات میں نقل کرنے پر سزا نہیں دی جاتی ہیں۔ یہ تو نقل کرنے سے بھی بڑا جرم ہے کہ کوئی محقق خود مقالہ لکھ کر نمبر ۱۰ سے دے، لیکن معین الرحمن

صاحب اس اعتراف کے باوجود کسی قسم کے سواغذے سے آزاد ہیں۔

بہر حال پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سرورق ”دعوان غالب“ (Accession No. 6812) پلاٹر یونیورسٹی کو واپس مل گیا ہے۔ اس کا سہرا جناب ڈاکٹر حسین فراتی کے سر ہے۔ دراصل وہ نسخہ ایک قومی ادارے کی ملکیت تھا اور اس کی بازیابی کے جہاد میں متحدہ سرفردشوں اور جاں بازوں نے سرحد کی بازی لگا دی تھی جن میں ڈاکٹر اسماعیل نیازی، لطیف الزماں خاں صاحب (ملتان)، ڈاکٹر عارف ثاقب، سید قدرت نقوی، رفیع احمد نقوی، حلیم احمد تصور صاحب اور پروفیسر جعفر بلوچ صاحب نے اپنے اپنے تاریخی کردار ادا کر کے دیے ہیں۔ جب کہیں وہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو واپس ہوا ہے۔ ورثہ مصین الرحمن صاحب تو اسے ہضم کرنے کے لیے اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری والا نسخہ ہی نہیں ہے۔ ان کی بدبختی کہ اس کا ریڈیو گراف ”نسخہ خوبہ“ کے عین مطابق نکلا۔ ”نسخہ خوبہ“ کے صفحہ ۲۲ سے ایکسیشن نمبر اور آخری صفحہ کی حدود مہر کو تو ختم کر دیا گیا ہے لیکن ریڈیو گراف میں یہ دونوں چیزیں یکجہ و سالم صورت میں محفوظ ہیں۔ جب کہیں جا کر مصین الرحمن صاحب اسے واپس کرنے کے لیے تیار ہوئے۔ لیکن مصین صاحب نے اس سرورق نسخہ سے دو ایڈیشن شائع کر کے لاکھوں روپے بنوڑ لیے ہیں جو یونیورسٹی کو واپس ملنے چاہئیں۔ یہ عیب (اعتساب) کا بہت مضبوط کیس ہے جو لوگوں سے قومی اداروں کی بڑپ کی ہوئی رقم نکالنے پر مامور ہے۔ اسے حرکت میں آنا چاہیے اور سید مصین الرحمن صاحب سے وہ تمام رقم نکالنی چاہیے جو انہوں نے اس نسخہ کی ناجائز اشاعت سے غیر قانونی طور پر کمائی ہے۔

(ماہنامہ ”سورج“ لاہور۔ اپریل ۲۰۰۱ء، ص ۱۷ تا ۲۵)

حصہ اول : کتابچے

- دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق ڈاکٹر حسین فراقی
- دیوان غالب، نسخہ خوب یا نسخہ مسروقہ سید قدرت نقوی
- ”دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق“ اور ”دیوان غالب، نسخہ خوب۔ صحیح صورت حال۔“ ایک تقابلی جائزہ ڈاکٹر عارف ناقد

دیوانِ غالبؔ نسخۂ خواجہ — اہل حقانق

ڈاکٹر حسین فراقی

مارچ ۲۰۰۱ء

بار دوم

جولائی ۱۹۵۵ء کے ماہ نو (کراچی) میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے دیوان غالب کے ایک ایسے نادور قلمی نسخے کا تعارف کرایا تھا جو کم و بیش ایک سو دو برس قبل معرین شہود میں آیا تھا۔ یہ نسخہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ سید عبداللہ کے نوشتہ تعارف کے چوالیس برس بعد یہ کاملاً طباعت سے آراستہ ہو کر غالب کے حقائق تک پہنچ گیا ہے، بدقسمت اس اعتبار سے ہے کہ پنجاب یونیورسٹی کا ملوکریہ نسخہ اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود نہیں۔ ہاں یہ لاہور شہر سے باہر نہیں گیا، اس کا ٹھکانا معین ہے چنانچہ اس دُرِ بلے ہما کی بازیافت ممکن ہے۔

۵ یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنہاں غم مخد

اس قیمتی قلمی نسخے کو متعارف کرانے سے پہلے سید عبداللہ نے ایس ایم اعرام کے علاوہ مولانا امتیاز علی عرشی سے خط کتابت کی اور ان کی توضیحات کی روشنی میں اس نسخے کے سنہ کے تعین کی کوشش کی۔ سید صاحب نے اس قلمی نسخے کے مندرجہ ذیل کوائف بتائے تھے :

”ادراق ۶۳، تقطیع ۸ x ۵۔ سیر لوح و تعویذ مطلقاً شگرت ولاجرو سے منقش، مسطیغ نقاشی کے انداز پر۔ پہلے دو صفحے مطلقاً۔ حاشیہ اور بین السطور مطلقاً بیل بوٹے۔ ہر نئی غزل سے پہلے بیل بوٹے شگرتی۔ خاتمے پر بھی بیل بوٹے طلاکاری سے“

”سب سے پہلے فارسی ویجا چ ہے جس کا اٹھارہاں ہوتا ہے :

شام شمیم آشنایاں راصلا و نہاد انجمن نشینان را مشرودہ کہ
 نختے از سامان مجر و گردانی الخ - یہ دیباچہ مرزا غالب کا
 لکھا ہوا چنانچہ ان کا نام عرف اور مختص سب کچھ اس میں موجود ہے
 اس میں دیباچہ بلاتارنختہ ہے - اس نختے کے آخر میں
 "خاتمہ" کے عنوان سے ایک تقریظ ہے جو نواب محمد ضیاء الدین
 خان بہادر کی لکھی ہوئی ہے - اس کا سرنامہ یہ ہے :

و میدانی سپیدہ سحری از تیرہ شب سوا و اوراق بقرہ فردوخ
 گسری جبارت تقریظ کہ پیدائی آں اثریت از آثار خرام غمزد
 مبار اور ہل نزدیک بجاں برابر، عالی و دو مان والا گھر، نواب
 محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ

"اس تقریظ میں یہ بھی لکھا ہے :

"ہمگی اشعار شعری شعار غزل و قطعہ و رباعی ہزار و پانصد
 و پنج و اند یا ختم" تقریظ کا آخری جملہ یہ ہے جس پر یہ نسخہ ختم ہو
 جاتا ہے : از سن یادگارے و برائے و گران تذکارے باد -

دیوان غالب کے اس نادر قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے مرقومہ تعارف نامے
 کے چار برس بعد قاضی عبدالوود نے "متفرقات" کے زیر عنوان "مخطوطہ
 دیوان غالب" کے سرنامے کے تحت پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اسی نسخے
 پر مختصر تعارفی شذرہ لکھا جو نقوش کے شمارہ ۶۹-۷۰ بابت اکتوبر ۱۹۵۸ء
 میں شایع ہوا - اس شذرے کے خاص نکات یہ تھے :

(۱) یہ قلمی نسخہ بشمول صفحہ اول ساوہ و دیباچہ غالب و تقریظ نیز ۱۲۸ (ایک
 سو اٹھائیس) صفحوں پر مشتمل ہے -

۱۔ سید عبداللہ سے خزل کے بعد قصیدہ کا لفظ درج ہونے سے رہ گیا -

۲۔ ماہ (کرچی) جولائی ۱۹۵۴ء ص ۱۵، ۱۶ -

(۲) دیباچہ ۲ تا ۴ (تین صفحات) پر مشتمل ہے۔

(۳) غزلیں صفحہ ۴ سے ۱۰۶ تک ہیں اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۳۱۲ ہے۔

(۴) قصاید ص ۱۰۶ سے ۱۱۷ تک ہیں۔

(۵) کل اشعار ۱۵۴۸ ہیں مگر تقریظ میں ہزار و پانصد و پنچ و اندھے۔

دورانِ غالب کے اسی نادر مخطوطے کو مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "نسخہ لاہور کے نام سے موسوم کرتے ہوئے اپنے مرتبہ و دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) میں اس کی جو خصوصیات بیان کی تھیں ان کا خلاصہ یہ ہے :

(۱) اس نسخے کے کل مکتوبہ ذوق ۶۴ ہیں۔

(۲) مسطر ۵ اسطر کا ہے۔

(۳) ذوق وب پر سنہری، سفید، آبی، نیلی، سُرخ اور زرد رنگ کی لوح کے نیچے فارسی دیباچہ شروع ہوتا ہے۔ اس صفحے اور اگلے صفحے کے حاشیوں میں باریک اوزناؤں کی قلم سے سُطلا اور طوائیل بنائی گئی ہے۔ نیز ان دونوں صفحوں کا بچن استور مذہب ہے۔ پوری کتاب میں چھ رنگ کی جمل ہے۔ ہر دو نظموں کے درمیان ایک سطر کے بقدر جگہ چھوڑی گئی ہے۔ اور اسے رنگین پیل سے بھرا گیا ہے۔ جہاں کہیں آخری شعر کو دو سطروں میں لکھا گیا ہے وہاں دونوں جانب کی جگہوں کو خوبصورت پیل بوٹوں سے بھرا دیا ہے۔

(۴) خط بتاتا ہے کہ قزاق فخر الدین محمد خان بہادر کا لکھا ہوا ہے جو میرزا کے مشہور اور پسندیدہ کاتب تھے۔

(۵) شعر میں ہند سے کو لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ انھوں نے ایسی جگہوں میں

لفظ کے اور پردہ کی شکل بھی بناتی ہے۔

(۶) میرزا کی ہدایت کے مطابق کاتب کی جگہز لکھتے ہیں اور محمد شہید میں آؤ نہیں لکھتے۔

(۷) فرق ۲ ب کی چوتھی سطر سے دوسری لوح کے نیچے غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ فرق ۵۲ ب سے قصیدے، فرق ۵۸ الف سے قلعے اور فرق ۶۰ الف سے رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ آخر میں بعنوانِ خاتمہ سیر کی تقریظ ہے جو فرق ۶۲ ب سے شروع ہو کر ۶۳ ب پر ختم ہوتی ہے۔

(۸) تقریظ میں اشعار کی تعداد ہزار پانصد و پنچہ و اند بتائی گئی ہے۔ میں نے شمار کیا تو ۱۵۳۷ اشعار نکلے۔

۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سید معین الرحمن نے دیوانِ غالب کا ایک قلمی نسخہ مرتب و مدون کر کے اسے دیوانِ غالب۔ نسخہ خواجہ کے عنوان سے شایع کیا۔ اس نسخے کو انہوں نے اپنے ذخیرۂ غایبیات کی "بیش قیمت ستاح" قرار دیا ہے۔ یہ قلمی نسخہ مع ایک در قلمی نسخے اور چند مطبوعہ نامہ و کتابوں کے "انہیں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے" (ص ۵) بلا۔ بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہونے والا یہ قلمی نسخہ بقول سید معین الرحمن "غالب ہے کہ نواب منیا الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گہرہ گم شدہ جز" (دیوانِ غالب نسخہ خواجہ ص ۶)۔ دلچسپ بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے کا تعارف کرتے ہوئے چوالیس برس پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اسے منیا الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے نسخے ہونے کا دعوٰی کیا تھا (ماہِ نوجوالی ۱۹۵۳ء، ص ۱۵، ۱۷) میری رائے یہ ہے کہ معین الرحمن صاحب

نے عرشی صاحب نے دیوان میں شامل مختلف اسناد و اشعار کا مطالعہ کی جو تفصیل الگ الگ دی گئی ہے ان کی کل میزان ۱۵۳۸ بنتی ہے ۱۵۳۷ نہیں عرشی صاحب کو سہو ہو رہا ہے

پیش کردہ یہ گہر گم گشتہ“ اور سید عبداللہ کا نشان کردہ یہ ”قد بلجہ بہا“، کوئی الگ الگ دوسری نہیں بلکہ ۱۸۵۲ء کے نصف اول کے کلام غالب کا حامل دوسری ”قد بلجہ بہا“ ہے جسے آخری حادثہ دہلی کی راہدہائی کے بجائے لاہور کے صوبائی دارالحکومت میں پیش آیا اور یوں یہ ٹٹ پٹ کر موجودہ تدوین کا رنگ بچھپا۔ اس ضمن میں شواہد کی تفصیل ذرا آگے چل کر پیش کی جاتی ہے۔

اس قلمی نسخے کو، جسے نسخہ خواجہ کا نام دیا گیا ہے، مرتب نے ذیل کے الفاظ میں متعارف کرایا ہے :

”۱۲۴ صفحات مشتمل نسخہ خواجہ کی جہد دل چھے (۶) رنگ کی ہے۔ پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک سظلا اور مذہب، خوشنایل ملٹے انتہائی دیدہ زیب، باریک، نفیس طلائی کام سے مزین“

(ص ۱۵)

معین صاحب نے اس نسخے کی صنف و ارتعداد و اشعار کا جو گوشوارہ مرتب کیا ہے، اس کی نوے غزل کے کُل اشعار ۱۳۱۲ (تیرہ سو بارہ) قصائد کے اشعار ۱۶۲ (ایک سو باسٹھ)، قطعات کے اشعار ۵۰ (پچاس) اور رباعیات کے اشعار ۲۳ (چوبیس) ہیں۔ مجموعی تعداد اشعار ۱۵۳۸ (پندرہ سو اڑتیس) ہے۔ معین صاحب مزید فرماتے ہیں :

”نسخہ خواجہ کے پہلے صفحے پر غالب کے فارسی دیباچے کی اکثر سطر اُٹھ چکی ہیں۔ اس صفحے کا تقریباً نصف اول وکٹش اور رنگ بنگلہ شمع نے گھیر لیا ہے۔ غالب کا یہ فارسی دیباچہ جس پر کوئی تاریخ درج نہیں، صفحہ ۲ کی پہلی سطر پر تمام ہوتا ہے۔ اس کے مابعد پھر خود عبودت درج ہے جس کے کچھ غزلیں شروع ہو جاتی ہیں“ (ص ۱۶)

۱۔ اتنی ہی سطر سید عبداللہ کے متعارف دیوان غالب کے قلمی نسخے کے پہلے صفحے کی ہیں۔

”نسخہ خواجہ کے صفحہ ۱۲۳ (ایک سو تیس) کے آغاز میں ”سرخ روشنی“ سے بخطِ جلی خاتمہ کا عنوان و لکشل لوح میں درج ہے۔ فارسی میں یہ تقریباً نو اب ضیاء الیہی نیر رخشاں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تقریباً ص ۱۲۴ (ایک سو ستائیس) کی آٹھویں سطر تک لکھی گئی ہے۔ اس آخری صفحے کا قریب نصف آخر ایک و لکشل لوح سے مزین ہے جس کے وسط میں ایک کاغذ چپا ہوا ہے جو اگرچہ اپنے رنگ و روپ (۹) کے اعتبار سے معاصر اور قدیم معلوم ہوتا ہے اور اہل نسخے کے کاغذ کا ہم رنگ اور ہم عمر ہے لیکن بظاہر یہ بعد کا اضافہ ہے۔ اس پر کسی ”فتح دین“ کے دستخط ہیں۔ ایک دوسرے قلم سے ”فتے دین“ بھی لکھا گیا ہے۔ (ص ۱۷)

آگے چل کر لکھتے ہیں :

”نیر رخشاں کے خاتمے“ کی یہ عبارت تعداد اشعار کے سلسلے میں ہماری جہنمائی کرتی ہے، ہنگی اشعار شعری شعائر غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و پانصد و پنچ و اندیافتہ اصلاً متن کے اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۳۸ بنتی ہے۔“

مرتب کا موقف ہے کہ ان کا مستعار و قلمی نسخہ غالب کے پاس اور ان کے پیش نظر رہا ہے اور انمول نے کہیں کہیں اس پر اپنے قلم سے اغلاط کا تب کی تصحیح کی ہے، اگرچہ نسخے میں موجود ہست سی غلطیاں اُن کی نگاہ سے چوک بھی گئیں۔ بالکل یہی موقف مولانا امتیاز علی عرشی کا دیوان غالب کے نسخہ تلاموز کے بارے میں ہے۔ مرتب کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ایک آتشلی کے سوا عرشی کی بتائی ہوئی سب غلطیاں نسخہ خواجہ میں موجود ہیں۔

مرتب نے اپنے ویبا پے میں نسخہ خواجہ کی کتابت کی خصوصیات گنوائے ہوئے لکھا ہے کہ ”ٹ کے لیے ہر جگہ ”ط“ کے نیچے دو نقطے ڈالے گئے

ہیں اور ”اک“ کو ”اکہ“ بدولن فحاط لکھا گیا ہے۔ پورے نسخے میں ہر صفحے پر ”ترک“ کا التزام بھی کیا گیا ہے۔
امتیاز علی عرشی کے متعارف ”نسخہ لاہور“ کا ذکر کرتے ہوئے زمیندار نے لکھتے ہیں :

”نسخہ لاہور کے تحت مولانا امتیاز علی عرشی نے دیوان غالب (نسخہ عرشی طبع دوم ۱۹۸۲ء دہلی) کے [کے] مقتضے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بعض غیر اہم تجزیاتی اختلافات کے ساتھ اپنے مضمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے زیر نظر نسخہ خواجہ کے کم و بیش عین مطابق ہے۔“

یہی بات وہ آگے چل کر ویسا پے کے ہر ہاشم کے آغاز میں لکھتے ہیں :
”تقاضی عبدالودود نے ”مخطوطہ دیوان غالب“ مکتب خاندان فاضل گانہ پنجاب لاہور اور مولانا امتیاز علی عرشی نے ”نسخہ لاہور“ کے طور پر چھ مخطوطے کے کوائف پیش کیے ہیں، بڑی حد تک جزئیات سمیت اس کی تفصیلات اور علامات یہی ہیں جو زیر نظر نسخہ خواجہ میں موجود ہیں۔ یونیورسٹی لائبریری (لاہور)۔“

کے جس نامور نسخے کا ڈاکٹر مسید عبدالمنہ نے تعارف کرایا ہے وہ بھی نسخہ خواجہ سے مماثل ہے لیکن اس میں کچھ اختلافات اور فرق تعداد اشعار اور مضمولات کا ہے۔“ (ص ۲۵)

ص ۳۸ پر مرتب کا اعتراف بابر الفاظ سامنے آتا ہے :

”جسے مولانا امتیاز علی عرشی ”نسخہ لاہور“ کہہ رہے ہیں وہ اپنے کوائف اور مضمولات کے اعتبار سے قریب قریب وہی ہے

”کم و بیش“ کے لفظ مرتب کے ذہنی نگہبان کے آئینہ دار ہیں۔

جو "نسخہ خواجہ" کے طور پر پیش نظر اور ہر تہ ناظرین ہے ؟
 واضح رہے کہ "نسخہ - لاہور" کا روٹو گراف مولانا عرشی کو قاضی عبدالودود
 نے اپنے دورۂ پاکستان (۱۹۵۷ء) کے بعد فراہم کیا تھا۔ حال ہی میں ہندوستان
 سے اس روٹو گراف کی ایک تجزوی نقل (بصورت فوٹو اسٹیٹ) راقم کو فراہم
 ہو گئی ہے جس کے چند صفحات سے زیر نظر مقالے کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے۔
 ڈاکٹر معین الرحمن کے مرتبہ "دیوان غالب نسخہ خواجہ" کے ضمن میں میری (اور
 پاک و ہند کے کئی اہل علم کی) رائے یہ ہے کہ یہ نسخہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا
 امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے متعارفہ "نسخہ لاہور" (ملوکہ پنجاب یونیورسٹی
 لاہور) سے الگ کوئی نسخہ نہیں، عین عین وہی نسخہ ہے۔ اس ضمن میں
 "دیوان غالب نسخہ خواجہ" کی نسخہ لاہور سے غیر معمولی مماثلت کی طرف غور و اکثر
 معین الرحمن قراتر سے اشارہ کر چکے ہیں اور ان کے ارشادات سابقہ صفحات میں
 نقل کیے جا چکے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ نسخہ خواجہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور کی
 ہی کا گم شدہ یا مسروۃ نسخہ ہے تو میرے پاس اس ضمن میں متعدد جزیل دلائل
 ہیں :

- (۱) سید عبداللہ، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی اور محمد معین الرحمن کی
 نشاندہی کے مطابق اس قلمی نسخے کے ۶۴ (چونٹھ) اوراق یا ۱۲۸ (ایک
 سو اٹھائیس) صفحات ہیں۔ معین الرحمن صاحب نسخے کے صفحات ایک
 سو اٹھائیس بتاتے ہیں کیونکہ وہ قلمی نسخے کے پہلے خالی صفحے کو شمار میں
 نہیں لاتے۔ یہی بات ہندوستان کے ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر سفین
 نقوی نے لکھی ہے کہ معین صاحب نے مخطوطے کے جس صفحے کو صفحہ نمبر
 ایک قرار دیا ہے، وہ دراصل اس مخطوطے کا صفحہ نمبر دو ہے۔ (دیکھ
 دیوان غالب نسخہ خواجہ - تجزیہ و تحقیق مرتبہ معراج نیو / اصغر ندیم
 سید، ص ۴۹) گویا اسلاف اس مخطوطے کے کل اوراق چونسٹھ صفحات

ایک سواشائیس ہی ہیں ایک سوتائیس نہیں جیسا کہ معین صاحب نے مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) اس قلمی نسخے کی مطلقاً اور مذہب جدول اور اس کی منتقش لوح اور دیگر بیان کردہ تمام جزئیات مشمولہ تحریرات سید عبداللہ، مولانا عرشی و معین الرحمن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

(۳) اس قلمی نسخے کا سائز اور مسطر کی سطریں (پندرہ) سید عبداللہ، مولانا عرشی اور معین الرحمن صاحب کے یہاں ایک ہی ہیں۔ اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ سید عبداللہ نے اگرچہ مسطر کی سطروں کی تعداد نہیں بتائی مگر ہماری خوش قسمتی ہے کہ اصول نے اس ناواقف قلمی نسخے کے پہلے دو صفحات کا بڑا عمدہ مگر منقصرو (Reduced) عکس ماہ نو (جولائی ۱۹۵۴ء) میں اپنے مضمون کے ساتھ شایع کر دیا تھا۔ لوح والے پہلے صفحے کو چھوڑ کر اگلے مکمل مسطر کے حامل صفحے کی سطروں کو گنیں تو تعداد پندرہ نکلتی ہے۔ علاوہ ازیں سید عبداللہ کے دو صفحات کے پیش کردہ عکس اور معین الرحمن صاحب کے نسخے کے متعلقہ دو صفحات کے عکس میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ملتا اور شوشے تک کا فرق نہیں۔ یہی حال مذکورہ روٹو گرائٹ کے دو صفحات کے فوٹو اسٹیٹ کا ہے۔ اگلے صفحات میں نسخہ سید عبداللہ، نسخہ لاہور (مستعار و عرشی) اور نسخہ خواجہ (مستعار و سید معین الرحمن) کے عکس تارقین کے مشابہے کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ ان کے عین میں نسخہ واحد ہونے کی گواہی دے سکیں۔

(۴) نسخہ خواجہ کے نسخہ لاہور (یا نسخہ پنجاب یونیورسٹی مستعار و سید عبداللہ) ہونے کی ایک ناقابل تردید دلیل یہ ہے کہ اس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے نیز کی تقریظ کے امتناعی پیرے کے جواغذا نقل کیے ہیں وہ یہ

جس :

”مجموع بہ احصائی افراد ایں حمایتوں معیضہ شاعری ہنگی اشعار شعری
شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ہزار و پانصد و پنچہ و اند
یا فتم۔“

یعنی ”جب میں اس مبارک مجموعے کے اشعار کی گنتی پر آمادہ ہوا تو جب
روشن نقاشی اشعار از قسم غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی ایک ہزار پانچ سو پچاس
سے کچھ اوپر نکلے۔“ اصلً ان اشعار کی تعداد جیسا کہ سابق میں مذکور ہوا، ۱۵۴۸
(پندرہ سو اٹالیس) ہے۔

تقدیریں ! یہاں میری دلیل کو نظر انداز کر کے پہلے سید معین الرحمن صاحب
کے اس اختلاف پر ترجیح دیتا ہوں جس کی رو سے انھوں نے اپنے نسخے کو سید عبد اللہ
کے مستعار و نسخے سے مختلف ثابت کرنا چاہا ہے اور لکھا ہے کہ نسخہ خواجه میں
اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۴۸ ہے۔ ان میں ۱۳۱۲ (تیرہ سو بارہ) شعر غزلیات کے
ہیں اور باقی دوسری اصناف کے جبکہ سید عبد اللہ کے بقول ان کے زیر بحث نسخے
میں ۱۵۶۸ (پندرہ سو اڑسٹھ) اشعار ہیں۔ ان میں ۱۲۴۲ (تیرہ سو تیس) اشعار
غزل کے ہیں اور باقی دوسری اصناف کے۔ سید عبد اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ
ان کے مستعار و نسخے میں دو غزلیں جن کے اولین مصرعے یہ ہیں موجود نہیں :

”دو ذوں جہان دے کے وہ بکھے یہ خوش رہا“ اور

(ب) ”لازم تھا کہ دیکھو مرا دستہ کوئی دن اود“ جبکہ بقول سید
معین الرحمن یہ دونوں نسخہ خواجه میں موجود ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دونوں غزلیں
نسخہ لاہور (مستعار و عرشی) میں بھی موجود ہیں۔ بنظر سید معین الرحمن صاحب کی دلیل
بہی و ذنی معلوم ہوتی ہے لیکن خود کیا جلتے تو تجھ لی اندازہ ہوتا ہے کہ سید
عبد اللہ سے اشعار شمار ہی میں غلطی ہوتی ہے۔ اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ
انھوں نے مخطوطے کی اشعار شماری کا غیر تخلیقی کام اپنے کسی شاگرد سے لیا۔

اور اس کی فراہم کردہ شماریات پر بھروسہ کر لیا ہو۔ اگر ان کے قلمی نسخے میں پندرہ سواڑ سٹھ اشعار تھے تو پھر نیز کے ان الفاظ کے کیا معنی ہیں جو خود سید عبداللہ نے اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں اور جن کے مطابق اشعار کی تعداد "ایک ہزار پانچ سو سیاس سے کچھ اوپر ہے۔ علاوہ ازیں اگر مذکورہ بالا دو غزلیں جن کے اشعار کی کل تعداد تیرہ بنتی ہے ان کے نسخے میں موجود نہیں اور ان کے یہاں غزلوں کے کل اشعار تعداد میں ۱۳۳۲ ہیں تو تیرہ کی تعداد منہا کر دینے کے بعد تو بقیہ اشعار غزل کی تعداد سترہ خواجہ کی تعداد کے مطابق ۱۳۱۲ ہو جانی چاہیے تھی مگر تعداد پھر بھی سترہ خواجہ سے زیادہ ہی رہتی ہے یعنی ۱۳۱۹ (تیرہ سو انیس)۔ اس قیضے کا حل سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سید عبداللہ کے شمار کردہ اشعار کی تعداد کو نظر انداز کر کے تقریظ میر میں بیان کردہ تعداد پر توجہ مرکوز کی جائے۔ جب قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور محمد معین الرحمن صاحب کے متعارف نسخوں میں اشعار کی تعداد تقریظ کے آخری پرے میں ایک ہی بیان ہوتی ہے تو یہ نسخے الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ غالب کی زندگی میں دیوان غالب کا نگار شایع ہوا۔ چوتھے ایڈیشن (مطبوع نظامی کانپور ۱۸۶۲ء) کے سوا ہر ایڈیشن کے آخر میں نیز کی تقریظ شایع ہوتی رہی۔ ہر بار اس تقریظ میں سہل انگاری کے باعث اولین اشاعت کے سن کو تو بعینہ باقی رکھا جاتا رہا لیکن تعداد اشعار پہلے ایڈیشن سے مختلف دی جاتی رہی اور ایسا ہونا فطری تھا اس لیے کہ اس عرصے میں جتنے اشعار کھے جاتے تھے وہ نئے ایڈیشن میں شامل کر لیے جاتے تھے اور لامحالہ تقریظ میں ان اشعار کی قریب قریب صحیح تعداد کی نشاندہی ضروری ہو جاتی تھی۔ مثلاً دیوان غالب کے پہلے مطبوعہ ایڈیشن کی تقریظ میں اشعار کی تعداد "ایک ہزار و نو سو اند" (حالانکہ ہشت کے بعد "اند" کی گنجائش نہ تھی) مرقوم ہے۔ اسی طرح دیوان غالب کے دوسرے ایڈیشن (سنی ۱۸۳۴ء) کی تقریظ میں اشعار کی تعداد

ایک ہزار ویک صد و اندہ بتائی گئی ہے (ص ۹۸)۔ تیسرے ایڈیشن (۱۸۶۱ء) کی تقریظ میں تعداد اشعار ”ایک ہزار و شش صد و نو و پینچ اندہ“ ورج کی گئی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ دیوان غالب کا پہلا ایڈیشن (۱۸۴۱ء) پانچ سو کی تعداد میں شائع ہوا اور اس کی تقریظ (نیر) میں تعداد اشعار ایک ہزار اٹھارے (۱۰۹۸) بتائی گئی۔ تو کیا معین الرحمن صاحب یہ ثابت کر سکیں گے کہ ان پانچ سو صحیح و سالم نسخوں میں کوئی ایک نسخہ بھی ایسا ہو جس میں اشعار کی تعداد اسی ایڈیشن کے کسی اور نسخے کے مقابلے میں کم یا زیادہ ہو؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں الا یہ کہ کوئی نسخہ ناقص ہو۔ اسی مثال پر ان چار قلمی نسخوں (بظاہر چار اصل و واحد) کو قیاس کریں۔ اگر ان نسخوں کے آخر میں لکھی گئی تقریظ میں چاروں جگہ ”ہزار پانصد و پینچ اندہ“ ہی کے الفاظ ملتے ہیں تو اس بات کا کیا امکان رہ جاتا ہے کہ نسخہ لاہور متعارفہ قاضی عبدالودود، نسخہ متعارفہ سرشی اور نسخہ متعارفہ معین الرحمن میں تو اشعار کی تعداد یکساں ہو مگر نسخہ متعارفہ سید عبداللہ میں بیس اشعار زیادہ ہوں اور کل تعداد ۱۵۴۸ کے بجائے ۱۵۶۸ (پندرہ سو اڑسٹھ) نکلے و رائج ہو؟ یہ چاروں نسخے ہر طرح مشکل و سالم ہوں۔ اودان چاروں نسخوں کا ساتھ ایک ہو، سطر کی سطر ایک ہوں، کاتب کے قلم کا پورا سنٹ ایک ہو، صفحات کی تعداد ایک ہو۔ سید عبداللہ کے متعارفہ قلمی نسخے کے ابتدائی دو صفحوں کے محفوظ عکس کے ساتھ نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور (متعارفہ سرشی) میں موجود انہی دو صفحوں کو ملا کر دیکھیے ایک حرف تو کجا ایک نقطہ اور شوشے کا ذوق بھی نظر نہیں آتا۔ دو صفحوں پر سطروں کی تعداد بالکل وہی ہے جو دوسرے دو صفحوں میں ہے۔ ان دو محفوظ صفحوں کی ہر سطر جس لفظ سے شروع ہو کر جس لفظ پر ختم ہوتی ہے مبنی علی نسخہ لاہور (متعارفہ سرشی) اور نسخہ خواجہ میں ہر سطر اس میں ہر سطر اسی ابتدائی لفظ سے شروع ہو کر اسی اختتامی لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حال قن اشعار کا ہے مبنی علی نسخہ لاہور (متعارفہ سرشی) اور نسخہ خواجہ میں سطر ہر صفحہ بالکل ایک ہی پشین پر اشعار کا انداز ملتا ہے۔ جس جس صفحے پر ترک ہے

وہاں نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور (عشری) میں فرقہ برابر فرق نظر نہیں آتا۔ تقابل کے لیے نسخۂ خواجہ اور نسخۂ لاہور سے شعری متن درج کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ جب تمام نسخوں کا سائز ایک ہے، مسطر ایک ہے، صفحات ایک ہیں، قلم کا پرائنٹ ایک ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اگر سید عبد اللہ کے متعارف نسخے میں شعریادہ تھے تو پھر وہ کس جگہ کھپاتے گئے کیونکہ عملاً ایسا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ مجھے ڈاکٹر حنیف نقوی صاحب کے اس تبصرے سے حروف پر حروف اتفاق ہے کہ مولانا عشری، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے اپنے طور پر دیوان غالب کے جس نسخۂ لاہور کا تعارف کرایا ہے وہ معین صاحب کے شایع کردہ نسخے سے مختلف نہیں اور یہ کہ اشعار کے شمار میں سید عبد اللہ سے سو ہوا ہے۔ کم و بیش ایسے ہی قیاس کا اظہار بر عظیم کے ممتاز محقق رشید حسن خاں نے کیا ہے۔ انھوں نے سید عبد اللہ کے تعارف کو ناقص بتایا ہے اور معین الرحمن اور کے متعارف نسخۂ خواجہ کو ”عین بین نسخۂ لاہور“ سے تعبیر کیا ہے۔ آپ معین الرحمن اور رشید حسن خاں کی مراسلت پڑھ جاتیے مجسوس ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں ایک لمحے کے لیے بھی اس بات کے قائل نظر نہیں آتے کہ نسخۂ خواجہ نسخۂ لاہور سے الگ کوئی نسخہ ہے۔ چونکہ اپنے طویل علمی تجربے اور گہری بصیرت کے باعث وہ اصل شدتِ حال سے واقف ہیں اس لیے انھوں نے معین صاحب کی کاوش کو خرابیِ تحقیق پیش کرنے کے بجائے نسخۂ خواجہ کی دیدہ زیبی کی داو دی ہے۔ نسخۂ خواجہ کے بارے میں ان کا یہ جملہ آج کل لاہور اور کراچی کے بعض اہل علم میں گردش کر رہا ہے کہ ”ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا۔“

۱۔ ڈاکٹر رفیعہ حنیف نقوی اور رشید حسن خاں کے مذکورہ خیالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ”دیوان غالب۔ نسخۂ خواجہ، تجزیہ و تحقیق“ کے ص ۲۸ تا ۳۹ اور

سید معین الرحمن اس بات کو ماننے پر آمادہ نظر نہیں آتے کہ اشعار شامی میں سید عبداللہ سے غلطی ہو سکتی ہے حالانکہ سید عبداللہ کے زیر نظر مضمون میں اشعار شامی کی غلطی کے علاوہ اور بھی کئی سو نظر آتے ہیں۔ مثلاً اسی مضمون میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں :

”دیوان اردو طبع اول کی تقریباً نصف تعداد اشعار ۱۰۷۲، طبع ثانی میں ۱۷۹۳۔ پھر اس نسخے میں جو خود مرزا نے ۱۸۵۷ء سے قبل شاید (۱۸۵۳ء/۱۲۷۱ھ) نواب محمد یوسف علی خان والی رامپور کے مہد گزرا نا تھا، اس میں کل ۱۶۹۰ اشعار بتاتے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ نظامی ایڈیشن)“

..... یہ تو ظاہر ہے کہ غالب کے اشعار کی تعداد میں ہر دور وقت اضافہ ہوتا گیا۔ ان کا پرانا دیوان تو خیر پانا ہوا..... منتخب دیوان کے مختلف نسخوں کے اشعار میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق بالکل قدرتی ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ۱۲۵۳ھ کے نسخے میں تعداد اشعار ۱۰۷۲ ہے، رامپور کے نسخہ میں ۱۶۹۰ اور طبع ثانی میں ۱۷۹۳۔ یہ تعداد اشعار ہر نسخے کے زمانے کے لیے کلید کا درجہ رکھتی ہے یعنی کم اشعار والا نسخہ اقدم ہو گا اور زیادہ اشعار والا نسخہ متاخر ہو گا اس لحاظ سے موجودہ نسخہ رامپور والے نسخے سے پہلے کا ہونا چاہیے۔

اب آپ تضاد و ملاحظہ فرمائیے کہ زیر بحث مضمون میں ایک جگہ تو بحوالہ عرشی پہلے ایڈیشن (سید المطالعین) کی تقریباً نصف اشعار کی تعداد ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ (انما) بتاتے ہیں۔ اور اگلے صفحہ پر اس تقریباً نصف مذکور اشعار کی تعداد ۱۰۷۲ بتاتے

ہیں۔ طرزِ تزیین ہے کہ صفحہ ۱۶ پر دوسرے ایڈیشن میں اشعار کی تعداد بحوالہ عرشی گیارہ سوتلاتے ہیں اور اگلے ہی صفحہ میں سابقہ بیان کو نظر انداز کر کے اسی دوسرے ایڈیشن (طبع ۱۸۴۷ء) کے اشعار کی تعداد ۹۳ بتاتے ہیں۔ راپپور والے ایڈیشن کا جس کے اشعار کی تعداد سید صاحب نے ۱۶۹ بتائی ہے، سب سے ترتیب ۱۸۵۴ء ہے۔ اب اگر سید صاحب کے استنباط کو کام میں لایا جائے تو اس کے مطابق راپپور کا نسخہ آقدم ہونا چاہیے اور طبع ثانی جس میں اشعار کی تعداد ۹۳ ہے اسے تو غر ہونا چاہیے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ دیوان غالب کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں شایع ہوا اور اس کے اشعار کی تعداد تقریباً ۱۶۹ ہے۔ سو درج ہے۔ گویا ثابت یہ ہوا کہ راپپور والا نسخہ جس میں اشعار کی تعداد ۱۶۹ ہے، دوسرے ایڈیشن سے تو غر ہے نہ کہ آقدم۔

معنوں کے آخر میں سید صاحب نے لکھا ہے: ”تہ جہن ممکن ہے کہ اس نسخہ کے گہرے مطالعے سے کچھ اور انکشافات بھی ہوں؟“ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب دیوان غالب کے نسخہ لاہور کو بوجہ بنظرِ غائر نہ دیکھ سکے۔ اسی وجہ سے ان سے اشعار شماری میں بھی غلطی ہوتی۔

سید معین الرحمن سید عبداللہ کے سہو کو تو ماننے پر تیار نہیں مگر بعض دیگر حضرات کی اشعار شماری کی غلطیوں کی وہ ٹھو ایک سے زیادہ مقامات پر نشاندہی کر چکے ہیں مثلاً اسی نسخہ خواجہ میں وہ بتا چکے ہیں کہ عرشی صاحب سے اشعار گننے میں غلطی ہوتی (دیکھیے ص ۲۶، حاشیہ نمبر ۹) اسی طرح وہ دیوان غالب طبع دوم کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کی اشعار شماری میں بھی غلطیاں ہوتیں اور بڑے اہم لوگوں سے، مثلاً عرشی صاحب کے نزدیک دیوان غالب

طبع دوم میں اشعار کی کل تعداد ۱۱۰۹ (گیارہ سو نو) تھی۔ سید اسد علی انوری اس ایڈیشن کے اشعار کی تعداد ۱۱۶۰ (گیارہ سو ساٹھ) بتاتے ہیں، مالک رام کے بقول اس نسخے میں اشعار کی تعداد گیارہ سو گیارہ تھی جبکہ محمود معین الرحمن نے اس طبع دوم کے اشعار کی تعداد ۱۱۵۵ (گیارہ سو اٹھاون) بتائی ہے۔ اگر عرشی اور مالک رام کے پائے کے لوگ گنتی میں غلطی کر سکتے ہیں تو سید عبداللہ سے غلطی کیوں نہیں ہو سکتی؟ تحقیق میں کوئی چیز حروفِ آخر نہیں ہوتی۔ محمود معین الرحمن صاحب سے بھی پیشِ نظر دیوانِ غالب کی تہذیب میں بیسیوں غلطیاں ہوتی ہیں کا ذکر اس مقالے میں آگے چل کر آئے گا۔

سید معین الرحمن صاحب نے اس قیاس کا بھی اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور دونوں نسخوں کی اصل کوئی ایک ہی مسودہ رہا ہو جس سے ایک ہی کاتب نے ایک ساتھ دو نقلیں تیار کی ہوں۔ اسی لیے دونوں میں بہت سی غلطیاں مشترک ہیں۔ یہ قیاس اس لیے بے بنیاد نظر آتا ہے کہ نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور اگر الگ الگ نسخے ہوں اور ان میں ایک ہی کاتب نے ایک ساتھ لکھا ہو تب بھی ان میں تھوڑے بہت فرق کا پیدا ہونا لازم ہے جبکہ ان دونوں میں اس قدر حیرت انگیز مماثلت ہے کہ ان میں ایک دوسرے کا عکس قرار دیا جاسکتا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ کاتب اور پرنٹنگ پریس متراش نہیں ہوتے! اب رہا یہ سوال کہ نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور میں بعض مقامات پر فرق ہے تو کیوں۔ سو آئیے پہلے اس فرق کی نوعیت معلوم کر لیں۔ اس میں معین الرحمن صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے زیرِ نظر نسخہ خواجہ میں بعض جگہ نسخہ لاہور (متعارف عرشی) سے انحراف ملتا ہے مثلاً عرشی صاحب کے نزدیک پوئے

۱۔ دیکھیے ”غالب کا علمی سرمایہ“، ص ۳۰، ۳۱۔

۲۔ دیکھیے ”دیوانِ غالب نسخہ خواجہ، تجزیہ و تحقیق“، ص ۳۲

نسخہ لاہور میں ”اک“ کو ”امک“ بدل دیں نقاط لکھا ہے (ب) شعر میں ہند سے کو نقطوں میں لکھا جاتا ہے، کاتب نے ایسی جگہوں میں لفظ کے اوپر عدد کی شکل بھی بنائی ہے۔ (ج) کاتب میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق ”خورشید“ میں واؤ نہیں لکھتا۔ معین صاحب کا دعویٰ ہے کہ ان کے نسخہ خواجہ میں (و) صفر نمبر ۱، شعر ۶ کے دونوں مصرعوں میں اک نقطوں کے ساتھ ہے، (ب) نسخہ خواجہ میں یہ اہتمام (یعنی لفظ کے اوپر عدد کی شکل) ایک آدھ جگہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ (ج) نسخہ خواجہ میں ص ۲۰، شعر ۶ کے دوسرے مصرعے میں ”خورشید“ میں واؤ لکھا گیا ہے۔ معین صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے نسخے میں نسخہ لاہور (عرشی) کے برعکس مرثاں ہوگا ”کے بہائے“ مرثاں ہونا ”ہی ضبط ہوا ہے۔ (ص ۲۷)

معین صاحب کے پہلے اعتراض کے ضمن میں دیربان غالب نسخہ خواجہ کو منا پر کھولے اور شعر نمبر ۶ کے دونوں مصرعے ملاحظہ فرمائیے۔ متنی عکس میں شعریں لکھا ہے :

یا دکر وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے وام کا
انتظار صید میں امک دیدہ بے خواب تھا

پہلے مصرعے میں ”اک“ کا لفظ نہیں ”یک“ کا لفظ ہے، لہذا معین صاحب کا ارشاد غلط ثابت ہوا۔ دوسرے میں ”اک“ ہے مگر اسے کاتب نے ”امک“ (بدون نقاط) ہی لکھا ہے اور یوں معین صاحب کے برعکس عرشی صاحب ہی کے توقف کی تصدیق کی ہے۔

معین صاحب فرماتے ہیں کہ ان کے نسخہ خواجہ میں ص ۲۰، شعر ۶ کے دوسرے مصرعے میں ”خورشید“ میں واؤ لکھا گیا ہے۔ عرض یہ ہے کہ نسخہ لاہور

(مستعار و عرشی) میں بھی اسی صفے کے اسی شعر کے دوسرے مصرعے میں خود شید
میں داؤد موجود ہے اور اس کی نشاندہی خود عرشی کہ چلکے ہیں۔ (دیکھیے دیوان غالب
نسخہ عرشی ص ۱۱۴، دیباچہ) لگتا ہے نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کے اختلافات
نمایاں کرنے کے اضطراب میں معین صاحب عرشی صاحب کا نسخہ لاہور پر لکھا ہوا
مختصر تعارف نامہ بھی غور سے نہیں پڑھ سکے۔

اب روگتیں دو باتیں۔ اول یہ کہ بقول معین صاحب صفحہ ۱۹ شعر ۱۹ اور ص
۳۱ شعر ۶ میں لفظ ایک کو ”ایک“ لکھا گیا ہے۔ تو یہ بات درست ہے، ان کی
یہ بات بھی درست ہے کہ نسخہ خواجہ میں لفظ کے اوپر عدد کی شکل کا اہتمام نسخہ
خواجہ میں ایک آدھ جگہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ ان کا یہ ارشاد بھی سمجھا ہے کہ نسخہ
لاہور (عرشی) کے برعکس ان کے نسخے میں ”مڑگاں ہوگا“ کے بجائے ”مڑگاں
ہونا“ درست لکھا گیا ہے۔ بس یہ ہے ان انتہائی معمولی اختلافات کی کل کائنات
ان اختلافات کے ضمن میں دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ اگر مال شکوک
(یا مال سرود) ہاتھ لگ جائے تو اسے اپنا ثابت کرنے کے لیے اس میں ترمیم
کنا لازم ہوتا ہے۔ جس فتنے دین نے نسخہ لاہور کے آخری دقیق پر تقریظ
کے خاتمے کے معانی نیچے بنے ہوئے مرتب چوکور کے اندر لگی ہوئی مدور نمبر کو چھپانے
کے لیے اپنی چھپی (چٹ) لگا دی ہو اس سے کیا بعید ہے کہ اس نے دو جگہ
دو دو نقطے بڑھا دیے ہوں؟ ”ہوگا“ کے دو مرکزوں کو بیڈ کے ساتھ بڑی لغت
سے کھینچ کر اور ایک نقطہ بڑھا کر ”ہونا“ کر دیا ہو اور جن مقامات پر کاتب نے
ہندسی لفظ کے اوپر عدد کی چند اشکال بنائی تھیں انہیں کھینچ دیا ہو۔ بدگمانی
تو نہیں کرنی چاہیے مگر چونکہ تحقیقی و تدوینی معاملات میں بدقسمتی سے خود معین صاحب

۱۔ دیکھیے ”نسخہ لاہور“ کے آخری صفحہ کا عکس جو اسی مقالے میں شامل کیا جا رہا
ہے اور جس میں مدور نمبر صاف نظر آتی ہے۔

کی شہرت ابھی نہیں اس لیے بعید نہیں کہ یہ "کارِ خیر" انہی کے ہاتھوں انجام پایا ہو۔ آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اُسے چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "جدید اردو غزل" ۱۹۸۷ء کا بیگ ٹائٹل)، جو شخص پرستوی چندر کی "جاگیرِ غالب" اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے "سورج کا غالب نمبر ۱۹۹۶") جو شخص اپنی ایم اے اردو کی شاگرد بشری باسط کے مقالے "اداءِ جفری — شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ اپنے نام سے "نقوش" میں چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "نقوش" شمارہ ۱۳۹، ص ۶۶۲ تا ۶۹۷) اور اسی قبیل کے دیگر کئی انوس ناک کام جن کی تفصیل بھی آئندہ) کر سکتا ہو، اُس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کمزور لمحے میں اس سے یہ ترانہ بھی "سرزد" ہو گئی ہوں! بس، خطا نمودِ ام و چشمِ آفریں دارم، والا معاملہ ہے، معاملہ نہیں المیہ ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھانا بے محل نہ ہو گا کہ معین الرحمن صاحب کو یہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا؟ محمد معین الرحمن صاحب کا ارشاد تو یہ ہے کہ انھیں یہ نسخہ ۱۹۸۱ء کے پسِ پیش "پرائی کتابوں کے ایک کاروباری" (ص ۵) سے مع ایک قلمی نسخے اور تعین ناؤر طبوئر کتب کے ہاتھ لگا۔ سوال یہ ہے کہ "پرائی کتابوں کا یہ کاروباری" کون ہے؟ جب تک معین صاحب اس کی صراحت نہیں کرتے تو یہاں غالب کے نسخہ خواجہ کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار فقط ٹھیکھا جاتا رہے گا۔ بعض حلقوں نے یہ قیاس کیا ہے کہ معین صاحب کو یہ ناؤر نسخہ ایس ایم اکرام (م ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) کی لاتبری سے ملا ہے جن تک یہ نسخہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے توسط سے پہنچا، کیونکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی مولانا امتیاز علی عرشی کے علاوہ ایس ایم اکرام سے بھی اس ناؤر نسخے کے باب میں خط کتابت رہی تھی۔ لیکن ہے اکرام صاحب کے ملاحظے کے لیے سید صاحب نے یہ نسخہ انھیں روانہ کیا ہوا اور پھر کسی وجہ سے وہاں سے واپس نہ

اسکا ہوتا آٹھ معین الرحمن کو ایس ایم اکھاسم کی وفات کے بعد ان کی کچی لائبریری کی کتب کی فہرست سازی کا موقع ملا اور یوں یہ تاؤر شُخّان کے ہاتھ لگے۔ یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ تخلیق پاکستان کے ابتدائی برسوں میں بعض قابل اعتماد حضرات کو، ایک اقرار نامہ (BOND) بھر کر دے دینے کے بعد یونیورسٹی لائبریری سے قلمی نسخہ جاری کر دیا جاتا تھا۔ یہ روایت کافی برس بعد تک بھی رہی۔ چنانچہ دیوان غالب کا نسخہ شیرانی (قلمی) مکتی بار حمید احمد خاں کے نام جاری ہوا چنانچہ اسی ضابطے کے تحت دیوان غالب کا زیر بحث قلمی نسخہ سید عبداللہ کی تحویل میں رہ کہ ایس ایم اکھاسم تک پہنچا ہو گا۔

میں نے دیوان غالب کے نسخہ خواجہ کے باب میں متعدد و اہل نظر سے تبادلہ خیالات کیا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ نسخہ خواجہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہی کے گم شدہ نسخے کا ظہور ثانی ہے۔ سب کی یہی رائے تھی کہ نسخہ خواجہ، سید عبداللہ کے متعارف نسخے میں مبتدہ فرق کی بنا پر، اس سے الگ نسخہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ فرق محض اس لیے نظر آتا ہے کہ سید عبداللہ سے اس تاؤر نسخے کے اشعار کی گنتی میں غلطی ہوئی۔ میں نے اس ضمن میں پاکستان کے ممتاز قریب مخطوط شناس اور صاحب نظر محقق جناب خلیل الرحمن واقدی سے استفسار کیا تو ان کا جواب یہ تھا کہ میرا پچاس برس کا مخطوطہ شناسی کا تجربہ مجھے بتاتا ہے اور میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے (انہوں نے اس موقع پر انگریزی الفاظ "CONSIDERED OPINION" استعمال کیے تھے) کہ ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کا متعارف نسخہ دیوان غالب (نسخہ خواجہ) عین یمن اور تہو بہو دہی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی ۱۹۵۳ء کے ماہ نو (کراچی) میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے کرایا تھا اور جو بدقسمتی سے اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو

چکا ہے۔

(۵) نسخہ خواجہ کے نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ نسخہ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا عکس دیکھیں تو جدول کا زیریں حصہ صاف کھجکھیا نظر آتا ہے۔ غالباً ہمیں اس نسخے کا ایکٹیشن نمبر درج تھا۔ لائبریری سائنس کا علم رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ ہر لائبریری کی کتاب پر ایک متین سیکرٹ پیج ہوتا ہے جہاں Acc No لکھا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ اگر کتاب چوری ہو جائے تو اس کے سیکرٹ پیج پر لکھے ایکٹیشن نمبر کی بنیاد پر اس کی بازیافت ہو سکے۔ چنانچہ یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا سیکرٹ پیج از روئے منابطہ ۲۲ ہے۔ اگلے صفحہ میں نسخہ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا عکس پیش کیا جا رہا ہے۔

معین الرحمن صاحب نے رشید حسن خاں کے نام اپنے ایک خط میں نسخہ خواجہ کو سید عبداللہ کے متعارف نسخے سے مختلف قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے :

”میرا احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی [لائبریری] لاہور میں اردو دیوان غالب کے دو محقق نسخے رکھے ہیں (یادِ دہل موجود نہیں) ایک وہ جسے قاضی عبدالودود نے دیکھا اور جسے عرشی صاحب نے ”نسخہ لاہور“ بتایا ہے۔ اس سے مختلف دوسرا نسخہ وہ تھا جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے متعارف کرایا ہے۔“

”نسخہ خواجہ نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا قوام تو مزود ہے لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے۔“

”نسخہ خواجہ کے بارے میں میرا نچتہ یقین ہے کہ یہ غالب کی

نظر سے گزرا ہے اور اگر یہ آپ کے ابتدائی اندازے کے مطابق
 ”تجین میں نسخہ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے“ تو پھر اس کے بارے
 میں عرشی صاحب کا بھی مشاہدہ یہ ہے کہ اندرونی شہادت
 ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے
 پڑھا ہے اور اکثر جگہ اختلاط کا بت کی اصلاح بھی کی ہے۔
 ”مولانا قیاز علی خاں عرشی مرحوم نے جن سات مقامات
 پر غالب کے قلم کی گواہی دی ہے وہ ساتوں صورتیں ”نسخہ
 خواجہ“ میں بھی من و عن موجود ہیں۔“

مندرجہ بالا مکتوب میں کا یہ ٹکڑہ قابلِ توجہ ہے: ”نسخہ خواجہ نسخہ لاہور
 ہی نہیں ہے تو اس کا تو ام تو مزد ہے“ (ص ۷۵)۔ اس جملے کا مطلب سوائے
 اس اعتراض کے کچھ نہیں کہ یہ نسخہ لاہور ہی ہے۔ اب اگر ایک لمحے کو معین الرحمن
 صاحب سے اتفاق کرتے ہوئے یہ بھی مان لیا جائے کہ نسخہ لاہور (مستعار ذہن)
 عرشیؒ، سید عبداللہ کے متعارف نسخے سے الگ کوئی نسخہ ہے تو اتنی بات تو خود
 عرشیؒ نے کہی ہے کہ اس نسخے کی نقل پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے قاضی
 عبدالودود کے ذریعے بصورت روٹوگراف انجین فراہم کی گئی تھی۔ اس کا مطلب
 سوائے اس کے کیا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا یہ نسخہ، لائبریری سے
 کسی وقت چوری ہو کر یا کسی اور ذریعے سے معین الرحمن صاحب تک پہنچا ہوا
 یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس مشکوک (یا مسدود) مال کی خرید و پُرانی کتابوں کے
 ایک کاروباری سے ”کس اصول کے تحت کی گئی اور کیا اندریں حالات اس کا
 موجودہ مالک قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے؟“

معین الرحمن صاحب کو چونکہ اصل صورت حال کا علم ہے اسی لیے انھوں

نے پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو "پنجاب یونیورسٹی سے اپنے ویرسٹہ تعلیق کی بنا پر"، ایک ذرا سی شرط کے ساتھ "منہانت حاصل کرنے کے بعد، یہ قلمی نسخہ دہرے کرنے کی پیش کش کی تھی تاکہ یہ گم شدہ نسخے کی جگہ لے سکے۔" ذرا سی شرط "یہ لگائی ہے کہ یونیورسٹی لائبریری میں اس نسخے کی حفاظت کا کوئی مستقل انتظام فرمایا جائے" تاکہ یہ پچھلے نسخوں کی طرح معدوم یا ضائع نہ ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس پیش کش پر قربان ہونے کو بھی چاہتا ہے۔ ان سے پوچھا جاتے کہ حضرت! اگر نسخہ خواجہ اسلاً دیوان غالب کا نسخہ لاہور ہی ہے جیسا کہ خود آپ نے خواہی خواہی احترام کیا ہے تو کیا آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ آپ اسے دہریے کے طور پر نہیں سترقے کے کٹاسے کے طور پر یا کم از کم امانت سمجھ کر پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو لوٹا دیں تاکہ یہ متاعِ بردہ وہیں پہنچ جائے جہاں سے کسی دستِ گستاخ نے اُسے چُپک لیا تھا یا کسی مروجہ نویس نے اسے ملاحظہ کے لیے مستعار لیا تھا اگر لے واپس نہ کر سکا؟

(۲)

دیوان غالب نسخہ خواجہ کی تدوین و تحقیق مرتب کے بقول ان کی برسوں کی محنت کا حاصل ہے۔ فرماتے ہیں :

"دیوان غالب نسخہ خواجہ کی بازیافت کو میں خود بھی اپنے کاموں

میں اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی تدوین و تحقیق میں مجھے پندرہ سترہ

۱۔ اس پیش کش کی تفصیل کے لیے دیکھیے: "دیوان غالب نسخہ خواجہ - تجزیہ و

تحقیق" ص ۳۱۹ تا ۳۲۱۔

۲۔ یہ ترکیب غالب ہی کے ایک مصرعے کی یاد دلاتی ہے: متاعِ بردہ کو بکھے ہوئے
جس قرصِ زمیں پر۔

برس گئے۔

نسخہ خواجہ کے دیباچے میں رشا دھوتا ہے :
 "مستی تحقیق و تدوین کا یہ کام برسوں کی ریاضت اور محنت کے بعد
 پاتہ تکمیل کو پہنچا۔" (ص ۷)
 آگے چل کر فرماتے ہیں :

"ان سب معاملات و مراحل پر اب پرہیز کر نظر ڈالتا اور خود کرتا
 ہوں تو حیرت ہوتی ہے اور باور نہیں آتا کہ دیدہ ریزی اور سوزن
 کاری کا یہ مشکل کام برسوں کے رنگوں اپنی کمزور صحت اور دودھری
 ذمہ داریوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ سے بن آیا ہے یہ شاید 'شش' شغف'
 اور لگن ہی ہے جس کے بل پر گویا میں اُن ہونے کا کام ہو کے ہوں۔"
 (ص ۸)

ان اذاتی بیانات اور شاعرانہ تعلیوں کے بعد جب ہم دیوان غالب نسخہ خواجہ
 (جو اصل نسخہ لاہور ہی ہے) کے دیباچے اور تذقن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو قدرتا
 مایوسی ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مرتبہ مصنف بڑی عجلت میں تھے۔ انہوں
 نے عکسی تمین کے بالمقابل ہر صفحے کے اشعار کو جدید کتابت میں بھی لکھا کر شایع کیا ہے
 تاکہ جو لوگ قدیم خط سے مانوس نہیں وہ بھی دیوان کو بہ سہولت پڑھ سکیں اور اس کے
 مطالب سے واقف ہو سکیں مگر انوس یہ ہے کہ وہ نہ تو قلمی نسخے کا تمین زیادہ توجہ
 سے دیکھ پاتے اور نہ اس کی اطمینان بخش بازداشت (Transcription) ہی
 کر سکے۔ ان کے سامنے دیوان غالب کی مستفی ثدوین کے کسی قدر اچھے نمونے نسخہ
 عرشی اور نسخہ حامد علی خاں کی شکل میں موجود تھے اور انہوں نے ان پر مشر و تذوینی
 کارناموں سے فائدہ بھی اُٹھایا، پھر بھی انہوں نے جا بجا غشو کریں کھائی ہیں۔

معین الرحمن صاحب کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ موزوں طبع نہیں ایسا شخص جو مصرع وزن میں نہ پڑھ سکتا ہو اسے کم از کم تدریس متن شعر سے حتی الوسع گریز کرنا چاہیئے، دیوان غالب کے نسخہ خواجہ کی متنی تحقیق و باز نوشت کے ضمن میں ان کا مادل عرشی کا مترسبر دیوان غالب (طبع ثانی) رہا ہے مگر اس کی اندھا و حند تقلید سے (خصوصاً رثوذ اوقات کے باب میں) تدریس کے تقاضے بخرم ہوتے ہیں اور بعض جگہ غلط مفہوم کی صورتیں بسا ہوتی ہیں۔ ان کے تیار کردہ نسخہ میں بھی کئی تسمیحات ہیں! اصناف واد کلام غالب کی توقیت کے ضمن میں پیش کردہ مصرعوں تو صیغات و تعلیقات میں بھی اور فارسی متن کے ارد و ترجمہ میں بھی۔ جہاں کہیں تلاوت کا اہتمام لازمی تھا وہاں کہیں بھی ایسا اہتمام نظر نہیں آتا۔ ہم سب سے پہلے شعری متن کی باز نوشت (Transcription) میں ان سے ہونے والی غلطیوں نیز کلمات کی خامیوں کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں :

(پہلا عدد صفحے کو، دوسرا شعر نمبر کو اور تیسرا مصرعے کو ظاہر کرتا ہے۔)

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	غلط/ ناقص	صحیح
۹	۱۰	۱	چراغاں آبجو	چراغاں آبجو (یہ ترکیب)
۱۳	۸	۱	ترے وعدے پر	ترے وعدے پر
۱۵	۱۲	۲	دوام کلفت خاطر	دوام کلفت خاطر
۱۸	۲	۱	صیقل آئینہ ہنوز	صیقل آئینہ ہنوز
۲۰	۳	۲	دل آرزو دگاں کا	دل آرزو دگاں کا
۲۲	۹	۲	عرش سے اوجھرتا	عرش سے اوجھرتا
۲۹	۳	۲	قدم پیشتر	قدم پیشتر
۳۲	۷	۲	مہر گیا	مہر گیا
۳۵	۱۱	۱	خط ایک اور	خط ایک اور

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	خط/ ناقص	صحیح
۴۶	۴ : ۴	۲	سیلی استاد	سیلی استاد
۵۱	۳ : ۳	۲	یا بہ حنا	پا بہ حنا
۵۹	۳ : ۳	۲	ہشت	ہشت
۶۳	۳ : ۳	۱	سیلی	سیلی
۶۸	۹ : ۹	۲	سیکڑوں	سیکڑوں
۷۶	۱۰ : ۱۰	۲	اگر بد سے	اگر بد سے
۷۶	۱۳ : ۱۳	۱	اس نیچے کے پیچے	اس کے نیچے کے پیچے
۷۷	۱۲ : ۱۲	۲	کوڑگی	کوڑگی
۷۸	۳ : ۳		[اہل تم سے شعر کی بازداشت ہو کر شہید عشق میں پناہ لے رہا]	
			میں کی گئی شعر اگلے کالم میں ہر سوج گردن مگر گردن	
			دیکھیں]	
۷۹	۳ : ۳	۱	گم یہ نکالے ہے تری بزم سے	گم یہ نکالے ہے تیری بزم
۸۰	۱۰ : ۱۰	۱	دلِ ناداں	دلِ ناداں
۸۱	۶ : ۶	۲	کسی	کسو
۸۳	۱۳ : ۱۳	۲	ہماری جیب	ہمارے جیب
۸۸	۳ : ۳	۱	ہو جو	ہو جو
۸۹	۷ : ۷	۱	میاوت کو تم آتے	میاوت کو تم آتے ہو
۸۹	۷ : ۷	۲	طالع بیدار بستر	طالع بیدار بستر
۹۰	۵ : ۵	۱	نہ ہووے	نہ رہوے

۱۔ شاید مرثی کی تقلید میں "تیری" کو "تری" لکھا اور مصرع وزن سے خارج ہو گیا۔
دیکھیے مرثیہ ص ۲۶۳

صفحہ	شعر نمبر	صفحہ نمبر	خط/ناقص	صحیح
۹۳	۷ : ۶	۲	سر رشتہ سلامت	سر رشتہ سلامت
۹۶	۶ : ۶	۲	برقِ نظارہ سوز	برقِ نظارہ سوز
۱۰۱	۱۱ : ۱۱	۱	بناو میں	بناو میں
۱۰۳	۱۱ : ۱۱	۲	جھل حسیں خاں	جھل حسیں خاں
۱۰۵	چوتھی سطر		علیہ التییدہ	علیہ التییدہ
۱۰۶	۱ : ۱	۱	لعل سی کی ہے	لعل سے کی ہے
۱۰۶	۵ : ۲	۲	برقِ حہ بال پری	برقِ حہ بال پری
۱۰۷	۱۰ : ۲	۲	آئینہ	آئینہ
۱۰۸	۱۲ : ۱	۱	آستان پر ہے ترے	آستان پر ترے ہے
۱۱۶	چودھویں سطر		چمن سرا یہ کوئی گفتار بتائیں کلکتہ	چمن سرا یہ کوئی گفتار بتائیں کلکتہ
۱۱۷	۱۰ : ۱	۱	مشاہد	مشاہد
۱۱۸	۷ : ۱	۱	فلک منظر بے مثل و نظیر	فلک منظر بے مثل و نظیر
۱۱۸	۱۱ : ۲	۲	داغ نہ ناصید	داغ نہ ناصید
نورِ خواجه کے بارے میں سید مصیبن الرحمن صاحب کا عرضی کی تعلید میں یہ موقوف				

۱۔ ”فلک منظر بے مثل و نظیر“ غلط نہیں مگر غالب نے اس شعر کے دوسرے مصرعے میں دو غلطوں کا اہتمام کر کے ابہام کی تاثیر میں جو اضافہ کیا تھا وہ پہلے مصرعے میں ضائع لگانے سے کم ہو جاتا ہے۔ ”نورِ عرش و عہد میں ضافت ہی کے ساتھ ہے مگر نورِ خواجه کے متن میں ذیل کی شکل میں ہے اور یہی مرصع ہے :

اے شہنشاہِ فلک منظر بے مثل و نظیر

اے جہاندارِ کرم شیوہ و بے شبہ و عدیل ، ص ۱۱۸

ہے کہ اس پر خود غالب نے اپنے قلم سے اصلاحیں لیں اس کے باوجود کتابت کی متعدد اغلاط سے ان کی نگاہ بچ کر گئی۔ ایسی بعض غلطیوں کی نشاندہی عرشی نے بحوالہ نسخہ لاہور کر دی تھی۔ مزید اغلاط کی نشاندہی نسخہ خواجہ کے مرتب نے کی ہے مگر اس کے باوجود بہت سی اغلاط متن پر ان کی نگاہ نہیں گئی۔ ملاحظہ فرمائیے :

صفحہ	شعر نمبر	مصرع نمبر	غلط / ناقص	صحیح
۶	۱۲	۲	کلمہ ستہ	کلمہ ستہ
۶	۱۲	۲	باغ نسیاں	طابق نسیاں
۷	۵	۲	ہیوولی	ہیوولی
۹	۱۳	۱	ناکھاں	ناکھاں
۱۰	۷	۲	کعب سیلاب کا	کعب سیلاب تھا
۱۵	۶	۱	کر نگاہ گرم	گر نگاہ گرم
۱۹	۹	۱	تیرے وحشی کو	تیرے وحشی کو
۱۹	۹	۲	کچھ ایک دینچ گرا باری	کچھ ایک دینچ گرا باری
۲۷	۶	۲	کفتار دوست	کفتار دوست
۳۲	۱	۲	ہوتی رواں اُرد	ہوتی ہے رواں اُرد
۳۳	۳	۱	سینگمش	سینگمش
۳۵ (تحرک)			جگر تشنہ	چکر تشنہ
۳۷	۱۱	۱	ہر ایک تیز رو کے ساتھ	ہر ایک تیز رو کے ساتھ
۸۹	۱۱	۱	خطر ہے رشتہ الفت	خطر ہے رشتہ الفت
۹۱	۸	۲	گر گئی	گر گئی
۹۶	۱	۲	طرہ یلا	طرہ یلا
۸۲	۱۱	۲	ذرا	ذرا

تدوین تین شعر میں مرتب نے غالب کے منشائے املا کو پیش نظر رکھا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مصرع غالب : بال تذرو عطیہ مریج شراب ہے میں بال
”تذرو“ کو غالب کے منشاء کے مطابق ”بال تذرو“ لکھا ہے مگر مرتب کے ساتھ
مشکل یہ ہے کہ وہ غالب کے تصورات لغت و املا سے زیادہ واقعہ معلوم نہیں
ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ”تذرو“ کو تو ”تذرو“ لکھتے ہیں کہ غالب کے نزدیک ”تذرو“
”تذرو“ کا معرب ہے (دیکھیے ”قاری برطان“ مرتبہ قاسمی عبدالودود ص ۵۹) لیکن
یہ قبول جاتے ہیں کہ اسی ”قاری برطان“ میں انہوں نے آذر (آتش) کو ”آذر“ لکھا
ہے اور قطعی انداز میں کہا ہے کہ ”آذر بال منقوطہ زہار نیست (قاری، ص ۳۴) اس
کے باوجود مرتب موصوف نے غالب کے اس مصرع :

ہے عارِ دل، نفس، اگر آذر فشاں نہیں، میں آذر کو ”آذر“ لکھا ہے حالانکہ
ان کے مُرشد، عرشی نے اس موقع پر ”آذر“ ہی لکھا ہے۔ (دیکھیے نسخہ عرشی ص ۲۳۲)
مُراد یہ ہے کہ مرتب کہیں تو غالب کے منشائے املا کی پیروی کرتے ہیں اور کہیں اس
سے انحراف۔ پہلے تین میں تین مقامات پر جہاں لفظ ”ذرا“ آیا ہے، لکھتے ہیں کہ
کاتب کو منشائے غالب کے مطابق ”ز“ لکھنا چاہیے یعنی لیکن خود اپنا یہ حال ہے کہ
قیوں مقامات پر باز نوشت کرتے ہوئے ”ذرا“ ہی لکھا ہے۔ دیکھیے نسخہ خواجہ
۸۲ : ۱۱۱ : ۱۸۹ ، ۲ : ۳ : ۹۴ ، باز نوشت کے صفحہ ۱۰۹ کے
ساتویں شعر کا مصرع ملاحظہ فرمائیے : ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز۔ اس
ایک مصرعے کا طرزِ املا یہی مرتب کے تذبذب اور تضاد کو نمایاں کرنے کے لیے کافی
ہے۔ ”ذرہ“ تو منشائے غالب کے خلاف ذال ہی سے لکھا ہے مگر ”خورشید“
غالب کے تتبع میں بغیر واؤ لکھا ہے۔ ص ۸۱ کے چھٹے شعر کا دوسرا مصرع یوں لکھا
ہے : ”جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے“ جبکہ اسی مقام کے عکسی نمونے میں
لے گ کا آؤ پرو اللہ کو جگہ جگہ سے غائب ہے۔ کہاں تک فشاں نہی کی جاتے۔

”کسی کی جگہ ”کسو“ ہے۔ قاری سمجھتا ہے کہ مرتب نے ”کسو“ کو ”کسی“ اس لیے لکھا
 ہر گاہ کہ ”کسو“ متروک ہو چکا ہے مگر اسے سخت حیرت ہوتی ہے جب وہ صفحہ ۱۱۹
 پر غالب کے ایک مشہور مصرعے کی بازوخت ہرگز کبھی ”کسو“ سے عداوت نہیں مجھے
 کی صورت میں دیکھ کر ”کسو“ سے دوچار ہوتا ہے! متروکاتِ اطلاق کے ضمن میں
 مرتب اور بھی کئی مقامات پر اسی تذبذب اور تضاد کا شکار نظر آتے ہیں۔
 صفحہ ۷ پر مشہور غزل ”پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے“ کی نقل خُرنی کہتے
 ہیں تے لفظ ”دہی“ کو دو مقامات پر ”دوہی“ اور دو شعر بعد اسی لفظ کو ”دوہی“
 لکھا ہے بایں صورت :

دوہی صدرِ رجب نارِ مند سائی دوہی ضدِ گوناغاب باری ہے
 پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں پھر وہی زندگی ہماری ہے
 بننا ہر ایسا لگتا ہے کہ مرتب نے اہلِ قن کی پیروی کرتے ہوئے دو جگہ ”دہی“ کو
 ”دوہی“ لکھا ہے مگر اس قیاس میں ترسیم یوں لازم آتی ہے کہ اسی غزل کے اگلے
 دو شعروں کے بعد ”دہی“ کو ”دہی“ لکھا ہے حالانکہ عکسی قن میں اس مقام
 پر بھی کاتب نے ”دوہی“ لکھا تھا ”پھر وہی زندگی ہماری ہے“۔ ویوانِ غالب
 نسخۂ حامد علی خاں اور ویوانِ غالب نسخۂ عرشی میں بھی ان دو مقامات پر لفظ ”دہی“
 کو ”دوہی“ لکھا گیا ہے لیکن یہ کیا مندری ہے کہ مرتب کم و بیش ہر جگہ عرشی
 ہی کی پیروی کو اپنا وظیفہ بنا لیں۔ ایک اور مثال لفظ ”جیب“ کی ہے جس کا

نہ یا مثلاً ۷۰ جب ترقیع ہی اٹھ گئی غالب۔ کیوں کسو کا گھلا کرے کوئی، ص ۹۰
 تلخ پیچھے میں نے ”کسو“ اور ”کسی“ کے ضمن میں نسخۂ خواجہ سے جو مصرع درج کیا
 تھا یعنی جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے اُس میں بھی ”کسو“ کی جگہ
 ”کسی“ اسی لیے آیا ہے کہ نسخۂ عرشی میں بھی ”کسی“ مرقوم ہے۔ دیکھئے ویوانِ غالب
 (نسخۂ عرشی) ص ۳۱۸۔

پر اسے "ہمارے جیب" لکھا ہے اور درست لکھا ہے :

یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

مگر تین صنفے بعد ہمارے جیب کی جنس بدل کر "ہماری جیب" ہو گئی اور
یوں شعر کے معانی خبط ہو گئے :

۷۰ چپک رہا ہے بجلن پر لٹو سے پیرا ہن - ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

ص ۸۲ -

واضح رہے کہ اس موقع پر حامد و عرشی دونوں کے نسخوں میں "ہمارے"

لکھا گیا ہے اور یہی صحیح ہے، دیکھیے دیوانِ غالب نسخہ حامد ص ۱۳۶، نین
دیوانِ غالب نسخہ عرشی ص ۳۲۲۔ عرشی نے خوب نشاندہی کی ہے کہ غالب کا
مندرجہ بالا اُردو شعر ان کے ذیل کے فارسی شعر کی یاد دلاتا ہے۔ (میرے خیال
میں یہ شعر لفظِ جیب کی وضاحت بھی کرتا ہے)

۷۱ بہ تن چسپید بازم از نیمِ خونا بہ پیرا ہن

خراشِ سینہ، سطرِ خنجر شد چاکِ گریباں را

میں عرس کر چکا ہوں کہ دیوانِ غالب نسخہ خواجہ کے متن کی باز نوشت

میں مولانا امتیاز علی عرشی، معین صاحب کے لیے نوٹہ تعقید بنے ہیں۔ عرشی کے

مرتبہ دیوانِ غالب کو متنی تحقیق کی یقیناً ایک عمدہ کاوش قرار دیا جاسکتا ہے

مگر اس میں اوقات خصوصاً ادا و مقلوب (۱) کی بھرمار سے بعض جگہ قاری سہولت کے

بہانے الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ معین صاحب کے یہاں چند جگہوں کو چھوڑ کر ہر جگہ

عرشی کی چشم بستہ تعقید کے شواہد ملتے ہیں۔ اوقات کا اہتمام نسخہ حامد علی خاں میں بھی

کیا گیا ہے مگر وہاں توازن کا احساس ہوتا ہے اور یہاں تندی رکا۔ حد تو یہ ہے کہ بعض

جگہ ایک مصرعے کے دو ایسے لفظوں کے بیچ بھی اٹا و اتہ عامل ہو گیا ہے جہاں ساتھ

حلف بھی آتا ہے مثلاً،

دائے محرومی تسلیم، و ہا! حال وفا۔

حالِ نگہریاں صاف : دانے محرومی تسلیم و بردا حالِ وفا ، ہونا چاہیے تھا۔
 یا مثلاً صفحہ ۸ پر ایک شعر کی قرأت میں آٹا واؤ اس طرح مزاحم ہوا ہے :
 نطفِ خرام ساقی ، و ذوقِ صدمتے چنگ
 اسی طرح کی صورت حال ص ۹۹ ص ۱۰۰ ص ۱۰۶ اور ص ۱۰۷ پر ہے جس سے
 مبصر حمل کی روانی کو سخت دھچکا لگتا ہے :

(i) دل مدعی ، و دیدہ بنامہ عالیہ

(ii) غفلت بخیل عمر ، و اسد ضامن نشاط

(iii) یک طرفہ نازش مرثکان ، و دگر سو غم خار

(iv) لاف و دانش خلط ، و نفعِ جہادت معلوم

بعض جگہ داوین کا غیر ضروری اور بے محل اہتمام کیا گیا ہے مثلاً صفحہ ۸ کی ایک غزل
 کے مطلع میں داوین کا یوں اہتمام کیا ہے :

”شکوے کے نام سے بے ہر خفا ہوتا ہے“

یہ داوین اور بعد کے منظوم واؤ قطعاً بے محل ہیں۔ حماد و عرشی نے بھی اس موقع
 پر داوین نہیں لگاتے۔ اسی صفحے پر درج پہلی غزل کے دوسرے شعر کے صریح اول
 پر بھی داوین کو خواہ مخواہ زحمت دی گئی ہے :

قصا نے تھابھ چاہا ”خراب بادۃ الغت“

یہاں ”خراب بادۃ الغت“ کو آواز اور کھا جاتا تو بہتر تھا۔ اس موقع پر حماد و عرشی نے
 بھی داوین کا التزام نہیں کیا۔ (دیکھیے نسخہ حماد، ص ۱۴۴، نسخہ عرشی صفحہ ۲۹۷)۔
 ایک مثال اور۔ ص ۲۰ پر صریح ہے : کہتے ہیں ”اگھے زمانے میں کوئی میر بھی تھا“ یہاں
 بھی داوین غیر ضروری ہیں۔

تعلیق حماد سے متن و معنی کی سطح پر کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی مثال میں
 صرف تین مثالیں ہی کفایت کریں گے : نسخہ خواجہ کے ص ۷ پر غالب کی ایک غزل کے
 تیسرے شعر کی باز نوشت کی گئی ہے جبکہ عکسی متن میں شعروں کی تعداد چودہ ہے ۔

جو شعر درج ہونے سے رہ گیا، وہ ہے: ”ہو کر ظہیدِ عشق میں الخ“۔ یہ شعر چھوٹ اس لیے گیا کہ عرشی کے نسخے میں ص ۲۰۲ پر جہاں یہ غزل درج ہے وہاں بھی اشعار کی تعداد تیرہ تھی اور نشانِ رد شعر اس میں شامل نہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ”ہو کر ظہیدِ عشق میں الخ“ والا شعر نسخہ عرشی کے پہلے چھپنے لگنیتہ معنی ”میں بصورتِ فرد درج ہوا ہے (دیکھیے نسخہ عرشی ص ۱۲۳) کیونکہ تقریبی ترتیب میں یہ ”گنیتہ معنی“ ہی میں شامل ہو سکتا تھا، ”نوائے سروش“ میں نہیں۔ چونکہ معین صاحب کے چشم و گوش ”نوائے سروش“ پر لگے تھے اس لیے وہ گنیتہ معنی کے فرد سے بلے نیاز رہے۔ دوسری مثال غالب کے قصیدہ راتید کے ایک شعر کی ہے جو نسخہ عرشی (ص ۱۳۸) میں بصورتِ ذیل درج ہے:

لعل سی، کی ہے پئے زمر مرہ صحتِ شاہ

طوبی سبز کسار نے سپہ ۱، منتظر!

معین صاحب نے بھی اس شعر کو من و عن اسی طرح درج کر دیا ہے یعنی ”لعل سے کی ہے“ کے بجائے ”لعل سی، کی ہے الخ“ لکھا ہے۔ نسخہ ہوپال اور نسخہ حمید یہ (اول) دونوں میں لعل سے کی ہے الخ درج ہے۔ نسخہ حمید دوم (مترقبہ: پروفیسر حمید احمد خاں) میں بھی ”لعل سے کی ہے ... الخ“ مندرج ہے۔ نسخہ حامد علی خاں میں بھی ”لعل سے کی ہے“ ... منبط ہوا ہے۔ میری رائے میں یہی ”لعل سے کی ہے الخ“ ہی کا محل تھا شعر کا مفہوم واضح ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ مدحتِ شاہ (یعنی مہر حضرت علیؑ) کے لیے کسار کے ہنرے نے کو اپنے ہنر رنگ کے باعث اسے طوبی فرما دیا جاسکتا ہے اپنی چونکی لعل سے تراشی ہے۔ لعل سے مراد سرخ رنگ کے پتھر ہیں۔ اگر ہم ”لعل سی“ منظر پیدا کی ہے ”کہیں تو یہ ایک پامال اور بے معنی بات ہوگی اس لیے کہ لعل سی منظر تو عام طور پر سب طوطیوں کی ہوتی ہے۔ طوبی سبز کسار کی کیا تخلصیں رہی؟“ پیدا کا لفظ یہاں گواہی دے رہا ہے کہ طوبی سبز کسار کو یہ سرخ چونکی ایسے ہی میسر نہیں آگئی۔ اس کے لیے اُسے

کو ہمارا کاسینو سن کر ناٹھا ہوا۔ تب چھپے لعل سے اپنی منقار پیدا کی۔

تیسری مثال ص ۱۰۱ پر درج اس مصرع کی ہے: ایک خوشچکان گھن میں کر ڈوڑوں
 بناؤں۔ یہاں کر ڈوڑوں سماعت پر سنگ باری کرتا ہے مگر جوں دیں کیونکہ
 عرشی نے بھی ”کر ڈوڑوں“ لکھا ہے۔ (ص ۲۲۴) سوال یہ ہے کہ کیا ”کر ڈوڑوں“
 بھی غالب کے منشا کے علاوہ کے مطالبہ ہے؟ اگر ہے بھی تو اس کا ترک لازم تھا
 کہ یہ کرخت بھی ہے اور غلط الہام بھی۔

نسخہ خواجہ کے متن کو عام طور پر مرتب نے ضبط کیا ہے مگر قریباً ہر جگہ مبیار
 نسخہ عرشی ہی کو بنا یا ہے۔ عرشی صاحب کی ترتیب متن کی داد کون نہ دے گا مگر
 ہر جگہ اسی کا تتبع، جیسا کہ پیچھے کہہ آیا ہوں، مناسب نہیں۔ چنانچہ نسخہ خواجہ میں
 چند مقامات ایسے بھی نظر آتے جہاں اضافت کا التزام زیادہ فیض تھا مگر چونکہ
 عرشی نے ایسا نہیں کیا سو معین صاحب نے بھی نہیں کیا مثلاً ”معین صاحب نے ایک
 مصرع یوں ضبط کیا ہے: بعد یک عمر درج، بار تو دیتا، بازے، (ص ۱۷)۔
 میرے خیال میں یہاں ”بعد یک عمر درج“ کا محمل تھا۔ عرشی کے یہاں بھی ”عمر“
 بغیر اضافت ہے۔ (ص ۱۸۵)۔ پھر نسخہ خواجہ کے متن میں کہیں کہیں استغناء
 (۹) کا استعمال ضروری تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا، مثلاً ذیل کا مصرع دیکھیے:

تو بچے بھول گیا ہوا تو پتا بتلا دوں

(اول تو یہاں ہو کے بعد وارث مقلوب کا کوئی جواز نہ تھا، مزید ستم یہ کہ ”دوں“
 کے بعد استغناء (۹) نہیں لگایا گیا)

یا مثلاً ذیل کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں اور اگلے شعر کے
 پہلے مصرعے کے آخر میں سوا لہر نشان کا ہونا ضروری تھا:

(۱) سے قیامت ہے کہ سن لیلی کا دشت قیس میں آنا
 تعجب ہے وہ بولا۔ یوں بھی ہوتا ہے نہ لے میں

ہے ہے ، خدا نخواستہ وہ اور دشمنی !

(۲۱)

اے شوقِ منفعل ، یہ تجھے کیا خیال ہے

تدوینِ متن کا یہ سترِ اصول ہے کہ اگر اہلِ متن میں کوئی لفظ رہ جائے تو اس
متن کی بارِ نوشت کرتے وقت وہ جانے والا لفظ فلا جہن [] میں لکھا جائے۔
نسخہ خواجہ میں مرتب نے اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا۔ مثالیں ماضی ہیں۔ فلا جہن لگا کر
چھوٹ جانے والے لفظوں کی نشاندہی کی جا رہی ہے :

۷ نہ ہو ہر زہ بیا بال نورد و ہم وجود

ہنوز تیرے قصید میں [ہے] نشیبِ فراز (ص ۳۳)

۸ غمِ ہستی کا آئندہ کس سے ہو جھڑا مرگِ علاج

شعشع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر جوتے تک (ص ۳۸)

۹ ہستی [کا] اعتبار بھی غم نے مٹا دیا

کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے (ص ۶۳)

۱۰ رحمِ کرِ ظالم [کہ] کیا ہو دو چراغِ کشتہ ہے

نبضِ جیہاں و فادو دو چراغِ کشتہ ہے (ص ۶۶)

۱۱ سزۂ دُچمن [و] ایک محطِ پشت لب بام

رفعتِ بہت صد عارف و یک ادبِ حصار (ص ۱۰۶)

۱۲ نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خط [میری] چھاتی پر کھلا (ص ۱۱۵)

۱۳ شاہ [کے] آگے دھرا ہے آئندہ

اب بآلِ سخی اسکندر کھلا (ص ۱۱۶)

نسخہ خواجہ کے ہرۂ رباعیات میں غالب کی وہ مشہور رباعی بھی شامل ہے
جس کا پہلا مصرع یہ ہے : دُکھ جی کے پسند ہو گیا غالبؔ اس رباعی کے
دوسرے مصرعے میں غالب سے ایک عروسی تسارع ہوا ہے یعنی اس میں ایک

سببِ خفیف زائد ہے :

دلِ ترکِ ترک کہ بند ہو گیا ہے غالب ۔ مرتب نے اس مصرعے کو اختلافاً قرار دیا ہے حالانکہ یہ مصرع بد امتزاجی کے مسئلہ اوزان سے خارج ہے (رک "رموز غالب" (گیان چند) ص ۲۶۳-۲۶۵)

مذہبِ نسخہ خواجہ کے باب میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس سے فہرستِ اشعار غیر جانسر ہے جس کے باعث قاری سخت اُنھیں کا شمار کرتا ہے۔

مذہبِ تین پرگنہ کو برہنہ کی آہستہ اب نسخہ خواجہ کے دیباچے کی طرف ایک بار پھر لوٹتے ہیں بمعین صاحب کو "پُرانی کتابوں کے ایک کاروباری" سے جو دو قلمی نسخے ملے ان میں ایک فارسی مخطوطہ "معارف النبوة" ہے جس کا سنہ اُصول نے ۱۳۸۶ ورج کیا ہے حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ قلمی نسخوں پر کسی نہیں قری سال ورج ہوتا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی ۱۳۸۶ء کے بجائے ۸۹۱ھ ورج ہونا چاہیے تھا۔

یا پھر دو ذیل میں کا اندراج کیا چاہیے تھا۔ حیرت یہ ہے کہ مرتب

نے "معارف النبوة" کے مصنف کا نام ملا معین الدین واعظ الکاشغری لکھا ہے جبکہ مصنف کا نام ملا معین الدین فراہی ہے۔ پھر ملا معین الدین کی وفات کا سنہ ۱۵۰۱ ورج کر دیا ہے حالانکہ اس کا سال وفات متعین نہیں۔ اس کی وفات ۹۰۴ تا ۹۱۰/۱۵۰۱ء سے ۱۵۰۳ء کے دوران بھی وقت ہوتی تھی۔

دیوانِ غالب نسخہ خواجہ (جوا سلا نسخہ لاہور ہی ہے) میں اشعار کی کل تعداد کے ضمن میں فرماتے ہیں :

۱۰ سلا متن کے اشعار کی قلمی تعداد ۱۵۳۸ بنتی ہے۔ قطعات کے

۱۱ جناب شمس الرحمن فاروقی ان سے بھی چار ہفتہ آگے نکل گئے اور اس کتاب کا پورا پورا اقتساب ملا حسین واعظ الکاشغری سے کر دیا۔ دیکھیے :

"قومی زبان" (کراچی) کا شمارہ فروری ۲۰۰۰ء (ص ۱۷)

۱۲ میں ان قیمتی معلومات کے لیے جناب علیل الرحمن واقدی کامنوں ہوں۔

منظوم فارسی عنوانات کو شامل کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵ سے کچھ اوپر بن جاتی ہے۔

معین صاحب کی یہ بے خبری نہایت قابل افسوس ہے۔ اس بے خبری کا نتیجہ ہے کہ وہ شرکی تصنعی عبارات کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین کرنے والے وہ شخص چار یا پانچ جو شعر اور شعروں (امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔ مرتب نے جن عنوانات کو منظوم قرار دیا ہے وہ یہ ہیں :

(۱) قطعہ در نمایش عنوان دلاویزی گفتار

و آسان کردین اندوہ پیشانی بر دلدار

(۲) چمن سرا یہ کردین گفتار بتائیش بکنت

اگر فردوس نتوان گفت ارم است البتہ

(۳) بادوست از سپاس عطاے دینہ سخن راندن

و متاع گزینہ سخن در برابر آں افشاندن

کاتب نے ان فارسی عبارات کو مصرعوں کی شکل میں مندرجہ بالا صورت میں اوپر نیچے لکھا اور یوں تدوین کار کے لئے چھپنے اور قارئین کے لئے تفسیر طبع کا سامان پیدا کر دیا۔ دیوان غالب کے نسخہ خواجہ میں مرتب کے نامزد مل طبع ہونے کے مستعد و شواہد ملتے ہیں۔

۱۔ اور یہ معاملہ محض اس ایک تدوینی کام تک محدود نہیں۔ عرصہ نما انھوں نے غالب اور انقلاب ستاروں کے زیر عنوان ”دستنبذ“ کو مرتب کیا تھا۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ میرے پیش نظر اس کا ۱۹۸۸ء کا ہندوستانی ایڈیشن ہے۔ اس کے ”ختمے چند“ میں مرتب نے رشید حسن خاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی دانست میں ایک مصرع لکھا ہے جو یہ ہے: ”یکوں کر شکر ادیکجیے اس لطیف خاص کا۔“ واضح رہے کہ یہ مصرع ”امنی غالب کا ہے جن سے معین صاحب کا تعلق خاطر ایک تہائی صدی پر پھیلا ہے۔ (جاری ہے)

ذیل میں سنو خواجہ سے دو مصرعے (یا ان کے ٹکڑے) نقل کیے جاتے ہیں جو ان کے ناموزوں طبع ہونے کی مزید شہادت دیتے ہیں۔ ان ناموزوں مصرعوں کو سہو کاتب "قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

ناموزوں / غلط / ناقص	موزوں / صحیح
تب کوئی ایسا حسد، صاحب نظر طے ہے (تیرا)	تب کوئی ایسا صاحب صاحب صاحب نظر طے ہے
م ۱۰	
نریا میں ہے بیدا و دوست جاں کے لیے	نریا میں ہے بیدا و دوست جاں کے لیے
رہی نہ طر نہ ستم اور کوئی جاں کے لیے	رہی نہ طر نہ ستم کوئی آسمان کے لیے
م ۳۳	
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے، م ۳۵	اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

(گزشتہ سے پورست) اور جن پر پاکستان میں پی ایچ۔ ڈی کی پہلی "منہ فضیلہ" حاصل کرنے کا "اعزاز" انھیں حاصل ہوا (سنو خواجہ، م ۳) شعر یوں ہے:

مکس رنڈ سے شکر کیجیے اس ملک میں خاص کا
چشم کشش ہے اور پاکے سخن درمیاں نہیں

اسی طرح انہوں نے ایک مصرع یوں تحریر فرمایا ہے: یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کتاب میں (دیکھیے "دیوان غالب" سنو خواجہ، تجزیہ و تخریج، م ۳۲۱، جبکہ صحیح مصرع یوں ہے: یہ بات بھی ہے لکھنے کے قابل کتاب میں۔

لے مرتب نے یہ دوسرا کو جاں "کا قافیہ" جاں "نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر انھوں نے "اطراف غالب" (سید عبدالرشید) سے نقل کیا ہے: "ماہ نو" میں جہاں یہ شعر، سید صاحب کے مضمون میں "اولا" نقل ہوا تھا، صحیح تھا، دیکھیے "ماہ نو" جولائی ۱۹۵۴ء

ناموزوں / غلط / ناقص

بزم شہنشاہ دفتر کھلا
 میں اور بزم سے
 کھتے ہو تم آتے ، ص ۳۹
 نے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر

ص ۳۰

پتے نذر کرم ، تخت ہے شرم نارسائی کا

ص ۳۰۰

لب خشک و تشنگی مُردگان کا ، ص ۲۰۱
 ہے آرا میدگی میں کوشش بھما ، جگھے

ص ۳۰۲

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گھوڑا جنبانی

ص ۳۰۳

بسا بجز میں متا ایک ل ایک قطرہ خون بھی

ص ۳۰۵

محرم نہیں تو ہی فرما تے راز کا ، ص ۳۰۶
 کھتے ہو تم سب کہ بُتِ خالیہ مو آتے

ص ۳۰۸

ہاں میر تو ہم نہیں اس کا نام ، ص ۳۱۰
 بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور

ص ۳۱۶

کھتے ہو تم سب کہ بُتِ خالیہ مو آتے

ص ۳۲۵

موزوں / صحیح

بزم شہنشاہ دفتر کھلا
 میں اور بزم سے
 کھتے تو ہم تم آتے
 اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر

پتے نذر کرم ، تخت ہے شرم نارسائی کا

لب خشک و تشنگی مُردگان کا
 ہے آرا میدگی میں کوشش بھما جگھے

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گھوڑا جنبانی

بسا بجز میں متا ایک ل ایک قطرہ خون بھی

محرم نہیں ہے تو ہی فرما تے راز کا
 کھتے تو ہو تم سب کہ بُتِ خالیہ مو آتے

ہاں میر تو ، نہیں ہم اس کا نام
 بچوں کا بھی نہ دیکھا تماشا کوئی دن اور

کھتے تو ہو تم سب کہ بُتِ خالیہ مو آتے

<p>خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز ص ۳۲۵</p>	<p>خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز ص ۳۲۶</p>
--	--

شکوہ خواجہ کے مقدمے میں مر قب نے دیگر کہنے والوں کی متعدد و تحریروں سے اقتباس کیا ہے مگر کئی جگہ عبارتیں نقل کرتے وقت بعض لفظ ان سے چھوٹ گئے اور بعض مقامات پر تصدیقاً احوال صحیح طور پر نقل نہیں ہو سکے حالانکہ صحبتِ مشن کا تقاضا تھا کہ ان الفاظ و عبارات کو صحیح طور پر نقل کیا جاتا۔ ذیل میں ایسے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے :

(۱) "بہ ثنائے ابدالایہ..." (ص ۱۶)

صحیح : "بہ ثنائے ابدالایہ..."

(۲) "ہمگی اشعارِ شعری شاعر..." (ص ۱۸)

صحیح : "ہمگی اشعارِ شعری شاعر..."

(۳) "اس نئے کے ورق ۲ ب کی چوتھی سطر..." (ص ۲۵)

صحیح : "اس نئے کے مشقات کی ترتیب سابق نسلوں جیسی ہے چنانچہ ورق ۲ ب کی چوتھی سطر..."

(۴) "اس تقریظ میں دیوانِ غالب (طبع اول)..." (ص ۲۶)

صحیح : "اس تقریظ میں نسخہ (طبع اول)..."

(۵) ۹۶۰۰۰۰ (ص ۲۶)

۱۔ دو ستاروں کا نام ہے جنہیں "شعری العیضا" اور "شعری العبود" بھی کہتے ہیں، "شعراۃ شامی" اور "شعراۃ یانی" بھی اور فارسی میں "دو خواہر" یا "دو خواہران" بھی کہتے ہیں۔ حمید، جلد دوم۔ مراد روشن ترین ستارے کے ہیں۔

صبح : ۶۹۰۰۰۰۰۰

(۶) تاریخ ۱۸۴۸ء تا تاریخ ۱۸۳۸ء... (ص ۲۶)

صبح : تاریخ ۱۸۴۸ء تا تاریخ ۱۸۳۹ء

(۷) "دیدن سپیدہ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بغیر ذریعہ گسری عبارت تقریظ
....." (ص ۳۰)

صبح : "دیدن سپیدہ سحری از تیرہ شب سواد اوراق بغیر ذریعہ گسری
عبارت تقریظ....."

(۸) "ہر نئی غزل سے پہلے یل بوٹے شگرفی خاتے پر بھی مرتج یل بوٹے..
..." (ص ۳۲)

صبح : "ہر نئی غزل سے پہلے یل بوٹے شگرفی - خاتے پر بھی مرتج
یل بوٹے....."

(۹) "... کہ لختے از بحر گردانی..." (ص ۳۲)

صبح : "... کہ لختے از بحر گردانی....."

(۱۰) "بغیر ذریعہ گسری عبارت تقریظ کو پیدائی آن....." (ص ۳۲)

صبح : "بغیر ذریعہ گسری عبارت تقریظ کو پیدائی آن

(۱۱) "عالی دودمان والا گہر....." (ص ۳۲)

صبح : "عالی دودمان والا گہر....."

(۱۲) "..... ہنگل اشعار شعری شعار" (ص ۳۲-۳۹)

صبح : "..... ہنگل اشعار شعری شعار

(۱۳) "..... ہنگل اشعار شعری شعار" (ص ۳۲)

صبح : "..... ہنگل اشعار شعری شعار

(۱۴) "نسخہ عربی زادہ ۱۳۲۱ھ/۱۸۱۶ء

صبح : "نسخہ عربی زادہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء

(۱۵) دل مرا سو نہ نہاں سے بے مہا با جل گیا، (ص ۳۰۴)

صحیح : دل مرا سو نہ نہاں سے بے مہا با جل گیا

(۱۵) "اس مقدمے میں بادشاہ نے اپنے بیانِ صفائی میں..." (ص ۳۲۹)

صحیح : اس مقدمے میں بادشاہ کے اپنے بیانِ صفائی میں.....

فارسی زبان سے ناواقفیت کے سبب مرتب نے غالب کے مختصر فارسی دیباچے اور نیز رخشاں کی تقریظ کی بازوخت میں بھی کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انھوں نے فارسی عبارتوں میں بعض ایسی جگہوں پر اضافوں کا اہتمام کیا ہے جہاں کچھ قطعی بے محل تھیں اور جن کے نتیجے میں معنوم خط ہر گیا ہے اور بعض جگہاں خلافِ اہتمام ضروری تھا وہاں بعض الفاظ و تراکیب کو اس سے محروم رکھا ہے کئی مقامات پر دو مقلوب کی ضرورت تھی مگر وہاں واحد مقلوب بار نہیں پاسکی اور بعض جگہاں ضرورت نہ تھی وہاں اس کا التزام کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں ساتھ ہی صحیح متن بھی درج کر دیا گیا ہے :

(۱) از سنگ بروں تافتہ..... واد نفس و مر بر آں نہادہ.... امید کہ

سخن سرا بیانِ سخنور ستای پراگندہ اہلستے را..... بر اسدائے خان

موسوم..... فرد ہام کار بخفی مدفن نیز یاد..... ص ۳۶، ۳۷

صحیح متن : "از سنگ بروں تافتہ..... واد نفس و مر بر آں نہادہ....

امید کہ سخن سرا بیانِ سخنور ستای پراگندہ اہلستے را..... بر اسدائے خان

موسوم..... فرد ہام کار بخفی مدفن نیز یاد"

(۲) "جہالت تقریظ کو پیدائی آں..... نواب محمد منیا اللہ تعین احمد خاں بہادر.

..... و دامن بکمرزدہ..... فراخ سماطی نہادہ است و گزشتہ

چشمائے سخن....." ص ۲۸۷

لے یہاں جہالت کے صرف دو ہی حصے درج کیے گئے ہیں جہاں غلطیاں تھیں۔ پوری عبارت طوالت کا باعث ہوئی اس لیے اس سے اجتناب کیا گیا ہے۔

صحیح جہارت : جہارت تقریظ کہ پیدائی آن فواب محمد ضیاء الدین خاں
 بہادر دواکن بکر برز وہ فراخ سما علی نہادہ است و گزشتہ
 چشمان سخن ؟

(۳) ”پروہ گیانند جملہ نشین سُر ادق مریم کرداری - شوخ چشماند پروہ در قراڑ
 شاہان بازار آزادگاندا پادری گل دہلی نژادانسنہ
 صفایان پروہ - بان و بان معیار نقد گراں مایگی فرمان
 فرمانی گیان خنوری ؟“ ص ۲۸۹
 صحیح متن : پروہ گیانند جملہ نشین سُر ادق مریم کرداری - شوخ چشماند پروہ
 در تر از شاہان بازار آزادگاندا پادری گل دہلی نژادانند
 صفایان پروہ - بان و بان معیار نقد گراں مایگی
 فرمان فرمانی گیان خنوری ؟

(۴) ”کوہش بکوہ ستایش ستای - ص ۲۹۱

صحیح متن : ”کوہش بکوہ ستایش ستای

(۵) ”بختی و بختی واپسین و خشتور“ ص ۲۹۳

صحیح متن : ”بختی و بختی واپسین و خشتور“

(۶) ”اللَّهُمَّ كَمِّلْ الْكَلَامَ بِدَيْمُومَةٍ بَقَائِهِمْ

وَحَصِّلِ الْأَمْرَ بِحَيْنُونَةٍ لِمَتَائِهِمْ“ ص ۲۹۳

صحیح متن : ”اللَّهُمَّ كَمِّلْ الْكَلَامَ بِدَيْمُومَةٍ بَقَائِهِمْ

وَحَصِّلِ الْأَمْرَ بِحَيْنُونَةٍ لِمَتَائِهِمْ“

(۷) ”..... کہ یک ازان یکیں سامیہ شخص خود و قلا توڑی بخت

بیدار داندہ تزد و گرد آوری“ ص ۲۹۳

۱۔ مرتب نے اس جہارت کو شعر کے طور پر اوپر نیچے مصرعوں کی شکل میں رچ کیا ہے
 بنا اور لقا اور دیگر اندرونی قوافی لے انہیں دھوکے میں رکھا۔

صحیح معنی : ” کہ ہر ایک ازان سکین صاحبہ شخص ... وقت لاؤڑی بخت
بیدار ... داندو و ترو و گرو آوری ...

(۸) ... تذکار سے باد

صحیح : ... تذکار سے باد۔

مرتب نے جس طرح غالب کے شعری فن کی باز نوشت میں ملا کی دو جلی کو راہ دی
ہے، اسی طرح کا تضاد فارسی نثر کی باز نوشت میں بھی نظر آتا ہے۔ کہیں تو جدید ایرانی
طرزِ املہ کی پیروی کرتے ٹھہرتے جھول کے بھاتے صرف یا نئے معروف کو بتا ہے۔
اور کہیں اس کے برعکس یا نئے مجھول کو۔ اسی طرح کہیں نون (کامل) کا التزام کیا ہے
اور کہیں نونِ جُزء کا۔ اس تضاد سے فارسی سخت الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ غالب
کے فارسی ویساچے اور تقریظِ نیر کی باز نوشت سے صرف تین مثالیں :

(۱) ... ”لختے از سامان ... دامنے از محمود ہندی ...

نچو بہای سنگب ٹوپ خوردہ“ ص ۳۲، ہونا تو یہ چاہیے تھا
کو جب ”لختے“ اور ”دامنے“ لکھا ہے تو پھر جو بہای“ کے بھاتے بھی
”چہ بھاتے“ ... لکھا جاتا۔

(۲) ”در ہمای آن رخسندہ آفر“ آفر کو غالب کے منشا کے خلاف ”و“ کے بجائے
فال سے لکھا جس کا وجود ہی بقول غالب فارسی میں نہیں تھے۔

ذکر ذکر و تذکار، لہذا ”تذکار“ بر فتح اول ہے۔ خیال میں لکھا ہے :
”بالکسر خطاست چرا کو سواتے تمیان و بقیائی“ یہی مصدر سے ہر وزن آفعال
بالکسر نیامدہ۔“

وہیے غالب کا فارسی میں و مجر و ذال سے انکار و درست نہیں اس منس میں قاسمی
محمد اردو، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عبد الشار صدیقی کے مضامین پیش نظر تھے
چچا جیتیں۔ میرا سو قند یہاں صرف اس قدر ہے کہ یا تو غالب کے منشا کے
املہ کو کاملًا نظر انداز کر دیا جاتا یا پھر اسی کی پیروی کی جاتی۔ (جاری ہے)

(۳) ”یوسفانی است خود لقب رونق شارسانی است . . . حرز
 بازو سے فرزانہ سومانی است آدھنگی است ہماڑ
 نقشہای بدیع دد آن اندیشیے اندام سنجیے
 بارے کار ساز نیز و بزرگ الایا توانا ہوشانی ہوشے
 و شنوا گوشان، گوشے آرسے راست کی فرمایہ ازمین
 یادگار سے و برای دیگران تذکار سے ہا“ ص ۲۸۷ تا ۲۹۵

مرتب موصوف کو چاہیے تھا کہ جب یوسفانی، شارسانی، سومانی، آدھنگی،
 نقشہای بدیع نکھاتا تو پھر اسی ایرانی اسلوبِ بلاغہ کی کلیتہً پیروی کی جاتی تاکہ کیسایت
 کا حق برقرار رہتا مگر انہوں ایسا نہیں ہوا اور ”اندیشیے“، ”سنجیے“ بازو سے
 بارے، ہوشے، گوشے، آرسے، یادگار سے اور تذکار سے کی یا ہاتھ بھول نے
 معروف پر ایسی بیانی کی کہ جسے نام اشد کا۔ اسی تقریباً تیرہیں کچھ شعر بھی آئے ہیں
 وراں کا متغنا و صورتِ املا بھی دیکھتے چلیے کہیں نوکِ منقوطہ ہے، کہیں نوکِ خنڈ، کہیں
 یا تے بھول ہے، کہیں یا تے معروف، بھول و معروف اور منقوطہ و غیر منقوطہ کی ایسی
 افراط و تفریط ہے کہ : خاسرا گشت ہنذاں ہے اسے کیا کیجیے ؟ جواب : نقش
 لا حول کھولے خاتمہ بنیاں تحریر ! :

ہمیں فرزندِ ہند آبادی علوی ۔ ہمیں شاگردِ محض کل عالی !!
 جہاں راہے دریغ آموز گارست ۔ گزین معنی شناس روزگار است
 ہر جہاں لنگاو معنی یکتہ آنکے ۔ فلاطوں فطر تے حکمت ترانے (ص ۲۹)
 حیرت اس بات کی ہے کہ نسخہ ترا ج کے مرتب کی کاوش سے ایک سو چھیالیس
 قبلِ میلے نظامی کے شائع کردہ دیوانِ غالب (۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۲ء) میں غالبؔ کی فارسی

(گوشہ سے ہرست) یہی ہے دردِ نیچے ہر دل والا اندازِ ہر مال مرتبہ کا ہنکاؤ مہنی کو نکالہر
 کرتا ہے۔

دیباچہ کامل صحت کے ساتھ شائع ہو چکا تھا نیز ہمیں سے مد قول پہلے عرشی اپنے
 نسخے میں فارسی دیباچہ و تقریظ بہت حد تک اعلیٰ نالج بخش طریقے سے شایع کر چکے تھے
 مگر افسوس کہ نسخہ خراج مرتب کرنے وقت وہ ان کا دشمن سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا
 سکے، خود وہ فارسی جانتے نہیں کہ ان مشکل عبارات کو صحت کے ساتھ ضبط کر سکتے۔
 اب آخر میں چند باتیں غالب کے فارسی دیباچے اور نیز کی فارسی تقریظ کے
 اردو ترجمے کے ذیل ہیں۔ چونکہ مرتب فارسی نہیں جانتے اس لیے یہ بات غامض و باہر ہے
 کہ یہ تراجم ان کے اپنے قلم سے نہیں۔ آئیے ذرا ان کے ”اسند داں“ کا ایک اقتباس
 دیکھتے چلیں جس میں انھوں نے مذکورہ فارسی عبارتوں کے تراجم کی تشکیل کا ذکر فرمایا
 ہے :

”دیباچے اور خاتمے کے اردو تراجم، ڈاکٹر فتویٰ کو بطور خاص
 پسند آتے۔ یہ امر میرے لیے راحت اور مسرت کا باعث ہوا
 اور اس سے طویل عرصہ تک اور مشقت و ترو و کی وہ کسل جاتی رہا
 جو ان تراجم کی تشکیل میں مجھے اٹھانا پڑی۔“
 ”دیوان غالب نسخہ خراج۔ تجزیہ و تحسین“

ص ۴۱

تراجم کی تشکیل کا محکما بڑا مسنی خیز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں صاحب
 کے پیش کردہ اردو تراجم سے پہلے غالب کے فارسی دیباچے کے تراجم اور
 نیز کی فارسی تقریظ کا ترجمہ اردو میں ہو چکے تھے؟ جی ہاں مستعد و بہ تفصیل ذیل :
 (۱) غالب کے فارسی دیباچے کا ایک (شاید پہلا) اردو ترجمہ ۱۹۴۲ء میں
 پروفیسر جیلانی کامران نے، جو ان دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں طالب علم تھے
 اعظم علوی نامی ایک فارسی دان سے کروایا جو لاہور کے کسی دفتر میں ملازم
 تھے۔ یہ ترجمہ اسلامیہ کالج کی ٹرانسلیشن سوسائٹی میں پڑھایا گیا اور رفیق خاور
 نے یہ معلومات راقم الحروف کو خود پروفیسر جیلانی کامران سے دریافت کیں۔

نے اسے پسند کیا۔ بعد ازاں یہ "کرسینٹ" کے سانامے میں شائع ہوا۔
ریک "کرسینٹ"، سانامہ ۱۹۴۶ء، جلد ۳۷، نمبر ۲۔

(۲) ڈاکٹر اُردو ترجمہ ڈاکٹر غلام الدین احمد نے کیا تھا جو پروفیسر جیلانی کامران
کی کتاب "غالب کی تہذیبی شخصیت" (۱۹۷۲ء) کے حواشی میں شائع کیا
گیا تھا۔

(۳) تیسرا اُردو ترجمہ پروفیسر جابر علی سید نے کیا، جو ان کی کتاب "تقدیر اور
بیرل ازم" (۱۹۸۲ء) میں شائع ہوا۔

(۴) چوتھا ترجمہ پروفیسر سینا شاہد کی "تائینٹ" ویباپ سے فلیپ بک،
میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ احمد سعید انصاری نے کیا۔ (پروفیسر سینا شاہد
کی "تائینٹ" عنوان کے بقول، "سختہ خواجہ سے ذرا پہلے شائع ہوئی)، آپ
چاہیں تو اسے سختہ خواجہ میں شامل ترجمے کا معاصر کر لیجیے۔

جہاں تک نیرِ رخشاں کی تقریظ کا تعلق ہے، اس کا بھی کم از کم ایک نام
عہدہ رواں اور با محاورہ ترجمہ، ۱۹۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی شائع کردہ
کتاب "تقدیر غالب کے سوسال" میں شائع ہو چکا تھا۔ مذکورہ مجموعے میں شامل
اس اُردو ترجمے کے اوپر سر سید احمد خان کا نام درج ہے اور حاشیے میں
"آثار الصنادید ۱۸۴۷ء (اُردو ترجمہ) کی عبارت درج ہے۔ اس سے شبہ ہوتا
ہے کہ نیرِ رخشاں کی اس تقریظ کا سر سید نے اُردو ترجمہ کیا ہو گا جو آثار الصنادید
کے پہلے ایڈیشن (۱۸۴۷ء) میں شائع ہوا۔ یہ بات درست نہیں۔ میرے خیال
میں اس تقریظ کے اُردو ترجمے کا سر سید سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ اُردو ترجمہ

۱۔ ایک مفصل و مشروح ترجمہ ہندوستان کے ممتاز ماضی ڈاکٹر ذریعہ احمد نے کیا جو جنوری
۱۹۹۱ء کے "غالب نامہ" (نئی دہلی) میں شائع ہوا ہے۔ مگر یہ ایک ترجمہ ہے جو
نورِ خواجہ میں شامل ترجمے سے تو غفر کہا جاسکتا ہے۔

بالکل جدید اردو زبان میں ہے اور اس کا سرسید کی زبان سے کوئی اُسلوبی میل نہیں۔ مجھے گمان ہے کہ یہ اردو ترجمہ فارسی زبان کے ممتاز عالم وزیر الحسن عابدی نے کیا ہوگا۔

خیر کنایہ ہے کہ غالب کے مختصر ویسا ہے کے کم از کم تین اردو ترجمے معین صاحب کے پیش نظر تھے اور نیز کی تقریب کا مذکورہ بالا ترجمہ بھی ان کے پیش نظر رہا ہوگا۔ ان تراجم ہی کو سامنے رکھ کر انہیں بقول خود ”تراجم کی تفصیل“ کا رد کرنا پڑا۔ جب عضو بندی کا یہ کام مکمل ہو گیا تو اس غالب میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نجم الاسلام اور منظر محمود شیرانی نے کسی قدر رُوح چھڑکی تب جا کر ان دونوں ترجموں میں زندگی کی رمت پیدا ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ ان اساتذہ کی نگار بندی کے باوجود کہیں کہیں ”وَرُو حنا“ کی سیل آنکھ اپنے بے میل وجود کے ساتھ قادی کی پریشانی خاطر کا موجب بھی بنتی ہے مگر بحیثیت مجموعی ویساچہ غالب کا معین صاحب کا پیش کردہ ترجمہ سابقہ تراجم کے مقابلے میں زہاں اور کبھی قدر زیادہ کامیاب ہے۔ ہزار ڈشوکا مشہور قول یاد آتا ہے: میں شیکسپیر سے بڑا ہوں کیونکہ میں اس کے کندھوں پر کھڑا ہوں !!

میری ان معروضات سے یہ سمجھ لیا جائے کہ نسخہ خواجہ میں موجود ان دو نثر پاروں کے اردو ترجمے کے بالمقابل سابقہ ترجمے بے کار محض ہیں ہرگز نہیں یہ تینوں تراجم اپنی اپنی خوبیاں رکھتے ہیں مثلاً اعظم علوی کے ترجمے کا ابتدائی حصہ بہت عمدہ اور اہل متن سے بہت قریب ہے مگر درمیان و آخر میں کہیں کہیں ناقص اور کہیں کہیں غلط ہے۔ اسی طرح پروفیسر جیلانی کا مزان کی کتاب غالب کی تہذیبی شخصیت میں شامل ڈاکٹر منظور الدین احمد کا اردو ترجمہ بڑی مددگار صاف اور درست ترجمہ ہے۔ صرف تین چار مقامات ایسے ہیں جہاں وہ غالب کے مفہوم کو صحیح طور پر نہیں پاسکے مگر مجموعی حیثیت سے اسے غالب کا میاب ترجمے کی فہم میں رکھا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ معین صاحب نے اپنے نسخہ خواجہ کے لیے

اس مختصر دیباچے کا جو ترجمہ "تشکیل" دیا اس کی بنیاد زیادہ تر اسی ترجمہ پر رکھی ہے بلکہ کہیں کہیں تو معین صاحب کا ترجمہ منظور صاحب کے ترجمے کا محض چربہ ہے۔ اس ضمن میں بعض مباحث جہلوں کا تقابلی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

ترجمہ از ڈاکٹر منظور الدین احمد

تشکیل ترجمہ از معین الرحمن

(۱) جلتی جہتی خوشبو کو روشن رکھنے کا کچھ سامان دیا ہو گیا ہے۔
ص ۲۷

خوشبو از زانی پر آمادہ انگووان کے لیے کچھ سامان فراہم ہو گیا ہے۔
ص ۲۴۰

(۲) چھری سے باریک کیا ہے اور ریتی سے ہموار کیا ہے۔ ص ۲۸

چھری سے ریزہ ریزہ کیا ہے اور ریتی سے ہموار کیا ہے۔ ص ۲۴۰

(۳) اس آگ کی پاکیزگی ہر اعتبار سے ثابت اور مسلم ہے، ص ۳۸

اس (آتش پارسی) کی پاکیزگی مسلم ہے، ص ۲۴۰

(۴) جس نے مسٹی بھرا رکھ سے، ص ۳۸

جس نے مسٹی بھرا رکھ سے، ص ۲۴۰

(۵) جو ہوشنگ کی روشن آنکھوں کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی ہے، ص ۳۸

جو ہوشنگ کی روشنی چشم کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی، ص ۲۴۱

ڈاکٹر منظور الدین احمد کے اس ترجمے کی تقلید ہی کا نتیجہ ہے کہ جہاں مترجم نے غلطی کی، وہیں "تشکیل کنندہ" نے بھی غلط کر رکھا ہے۔ اس "وفا داری بشرط استوائی" کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں: دیباچے میں ایک جگہ غالب اس آگ کا ذکر کرتے ہیں جو ہند کی بھتیہ میں جل رہی ہے، اس آگ سے ان کی مُراد وہ معاصر اردو شاعری ہے جو پامال مضامین اور پیش پا افتادہ خیالات میں محسوس ہے چنانچہ اس شاعری کے ذکر میں لکھتے ہیں: "چہ بروئے سلم است از ناپاکی بہ استخوان مُردہ ناچار شکستی" گویا "چہ بروئے سلم است" کا تعلق معاصر اردو شاعری سے ہے، آتش پارسی

سے نہیں ہے جیسا کہ مترجم ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور ان کے مقلد کا خیال ہے۔

دیباچے میں آگے چل کر یہ عبارت ملتی ہے :

”پژدہ ہندہ در جواتے آن رخشنده آور نعل در آتش است کہ
چشم روشنی ہو شنگ از شنگ بدوں تافتہ۔“

مراد یہ ہے کہ جو تین شنگ آرزو مند شاعر اس روشن آگ کے حصول کے لیے بے چین ہے جو ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے لیے پتھر سے باہر نکل آئی تھی۔ فارسی متن میں ”چشم روشنی“ کی جو ترکیب استعمال ہوتی ہے اس کے معانی کی تفہیم نہ ڈاکٹر غریبا احمد کے یہاں درست ہے نہ ظہور الدین احمد کے یہاں نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی ستید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا اور ترجمہ یوں کیا : اس کا جو یا اس پچکنے والی آگ کے عشق میں بے قرار ہے جو ہوشنگ کی آنکھ کو روشن کرنے کے لیے پتھر سے باہر نکلی تھی“ (تفہید اور لبرل ازم ص ۳۶)۔ معین صاحب کے یہاں ترجمے کی صورت یہ ہے :

”یہ وہ آگ ہے جو ہوشنگ کی روشنی چشم کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی۔“ ص ۴۱۔

اس ٹھکے کا ترجمہ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اس طرح کیا ہے :

”اس آگ کی آرزو میں بے قرار ہے جو ہوشنگ کی روشن آنکھوں

کے ساتھ پتھر سے باہر نکلی ہے۔“ (ص ۴۸)

معین صاحب نے اپنے ترجمے میں محض یہ کیا ہے کہ غالب کی استعمال کردہ ترکیب ”چشم روشنی“ کو مقلوب کر کے ”روشنی چشم“ کر دیا تاکہ یہ ظہور الدین احمد کے ترجمے سے متنوں کا مختلف دکھائی دے۔ اصل میں چشم روشنی کے معنی ”تہنیت“ یا ”مبارک باد“ کے ہیں۔ ”ہمارے ہم“ میں لکھا ہے :

”چشم روشنی و چشم کسی روشن : چون چیزی عجیب و غریب بنظر آید
یا فتنی غیر مترقبہ ہم رسد چہین گویندہ در معنی تہنیت و مبارک باد

ہمارا، صائب کا یہ شعر بطور نظیر لاتا ہے :
گویند چشم روشنی ہم غزال کا - ہر جا کہ آں نگار بعزم شکار شد

ہمارا، جلد اول ص ۳۱۳

دلچسپ بات یہ ہے کہ ”چشم روشنی“ کی یہ ترکیب غالب کے یہاں متحدہ جگہ آتی ہے۔ یہیں مقامات میر کے علم میں ہیں : ”ہنچ آہنگ“، ”مہر نیمروز“ اور ”دستنبو“۔ پہلی کتاب یعنی ”ہنچ آہنگ“ کا ”آہنگ چنم“ اردو میں ترجمہ ہو کر شایع ہو چکا ہے۔ باقی دونوں کتابوں کے بھی میاں تریبھی نے اردو میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان تینوں ترجموں میں ”چشم روشنی“ کا صحیح ترجمہ ”مبارک باد“ درج ہے۔ میرزا حسام الدین حیدر کے نام خط میں ایک جگہ غالب لکھتے ہیں :

(۱) ایں چہار رباعی و چشم روشنی ز تو بامی صادق فرستادہ آمد : ”ہنچ آہنگ“ (مرثیہ عابدی) ص ۳۵۰

”مہر نیمروز“ میں خطاب زمیں بوس کے زیر عنوان ایک جگہ فرماتے ہیں :
(۲) ”بخت از خواب جست“ ”چشم روشنی گفت“ ”مہر نیمروز“ (مرتبہ عبدالشکور احسن) ص ۱۹

”دستنبو“ میں ایک جگہ جدوجہد ستاروں کی مذمت اور انگریز کی توصیف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر ناشکریے سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں نہ اجڑ جاتیں تو گلستانِ انگلستان سے صادق فرماں سے میری آنکھیں اور میرا دل ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے۔ اہل متعلقہ جہارت یہ ہے :

(۳) ”دل و دیدہ من چشم روشنی گوی ہمدگر گردیدہ بودی“ — غالب اور انقلاب ستاروں (دہلی) ص ۱۹۶۔

یہ آخری جہارت اسی کتاب (دستنبو) سے نقل کی گئی ہے جس کے تین ایڈیشن ڈاکٹر معین الرحمن مرتب کر کے شایع کر چکے ہیں اور جس کے مصنف

وہی غالب ہیں جن سے ان کے تعلق خاطر کا عرصہ ایک تہائی صدی پر پھیلا ہے
 وچپ تر بات یہ ہے کہ اسی کتاب کے ص ۱۲۳ پر چشم روشنی کے معانی صاف
 ”مبارک باد“ لکھے ہوئے ہیں۔ فارسی تین ترمین صاحب کے دائرہ تفہیم سے
 باہر تھا۔ کیا وہ اپنے مرتب کردہ ترجمہ شدہ متن سے بھی اس درجہ بے نیاز ہیں؟
 ایسا متن جسے وہ تین بار شایع کر چکے ہیں؟

معین صاحب کے پیش کردہ ترجمہ دیا چہ غالب میں چند اور مقامات پر
 بھی کوتاہیوں اور نارسائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ص ۲۲۰ پر یہ عبارت بطور
 ترجمہ سامنے آتی ہے :

”یہ خاصہ کسی طرح گداز کی قلب کا سامان نہیں بن سکتا اور نہ یہ
 بزم افروزی کے لیے مناسب (خیال کیا جاسکتا ہے)“

اصل جملہات یہ ہے : ”ہر آئینہ بہ دل گداختن نیز دود بزم افروختن را نشاید۔“
 ”ہر آئینہ“ یہاں ”ظاہر ہے“ کے معنوں میں آیا ہے۔ غالب کا اشارہ
 چونکہ معاصر اردو شاعری کی طرف ہے اس لیے صحیح ترجمہ یوں ہوگا : گویا واضح
 ہے کہ (یا واضح طور پر) یہ شاعری (اردو) کسی طرح اس لائق نہیں کہ اس سے
 دل چکھے نہ یہ بزم افروزی کے لیے مناسب خیال کی جاسکتی ہے۔

دیباچے میں غالب نے ”قد پاش آتش“ کا ذکر کرتے ہوئے جہاں یہ لکھا
 ہے کہ یہ آگ ہوشنگ کو مبارک باد کہنے کے لیے پتھر سے باہر حل آئی وہیں اس
 کی فیض رسانی کا یوں ذکر کیا ہے :

”خس را فروخت دلالہ دارنگ و مرغ را چشم و کدہ را چراغ“

اس کا ترجمہ نسخہ خواجہ میں یہ ہے :

”حسن کو فروغ، دلالہ کو رنگ، مرغ کو چشم و کدہ کو چراغ“ ص ۲۴۱

یہاں ”حسن“ کا لفظ بے محل اور ٹھیک ہے، ”خس“ ہونا چاہیے۔

چند اور مقامات ملاحظہ کریں جہاں ترجمہ ناقص اور ایک آدھ جگہ غلط ہے

اصل عبارات بھی درج ہیں :

اصل فارسی متن

(۱) بخشہ یزدان درون بسخن برافروز
راپاسم

(۲) بود کہ در اندک مایہ روزگارانی

(۳) همانا نگارندۂ این نامہ را آن رسر

است کہ پس از انتخابیہ یوان ریختہ

بہ گرد آوردن سرایتہ دیوانی فارسی

برخیزد۔

(۴) و چارم گرد آورد را

(۵) یارب این بوئے بستی ناشینہ از

نیمستی بہ پیدائی نارسیدہ یعنی نقوش

بضمیر آمدۂ نقاش کہ با اسد اللہ خاں

موسوم فرجام کار بخفی

دفن نیز باد۔

ترجمہ / نسخہ خواجہ

باطنی کو سخن کی گرمی بخشنے والے محبوب

کا شکر گزار ہوں، ص ۲۴۱

تاکہ کم مائیگی کے باوجود، ص ۲۴۱

اب راقم اسطور کا ارادہ ہے کہ

دیوان ریختہ کے انتخاب کے بعد

دیوان فارسی کے مجموعے کو مرتب

کرسے۔ ص ۲۴۱

اور راسم کو ص ۲۴۱

یارب یہ بوئے بستی ناشینہ اور

یہ پیدائی نارسیدہ یعنی ضمیر نقاش میں

ضمیر نقاش کہ جس کا نام اسد اللہ خاں ہے

..... انجام کار مدفن بخفی

بھی ہو۔ ص ۲۴۱

میرے نزدیک نمبر ایک میں سخن کی گرمی کے بجائے سنی / شعری روشنی

ہونا چاہیے تھا۔ نمبر ۲، میں ”تاکہ کم مائیگی کے باوجود“ غلط ہے۔ صحیح ترجمہ وہ ہے

جنذیر احمد اور دیگر حضرات نے کیا ہے، ”نذیر احمد نے لکھا ہے“ ”آئید ہے کہ کچھ

بھی دلوں میں“ (غالب نامہ، ص ۱۵)۔ ظہور الدین احمد نے لکھا ہے: ”آئید ہے

کہ تھوڑی مدت میں“ (ص ۳۸)۔ احمد سعید انصاری نے لکھا ہے: ”بہت ممکن

ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں“ (ص ۱۲۰)

نمبر ۲ ”مخانا“ کا ترجمہ نہیں آسکا علاوہ ازیں ”دیوان فارسی کے مجموعے“ میں

”مجموعے“ کا لفظ حشو ہے۔ نمبر ۳ میں چارم گرد آورد کا ترجمہ ”راقم“ ناقص ہے۔

یہاں "جامع دیوان" کا محل تھا جیسا کہ اس موقع پر جابر علی سید اور نذیر احمد نے لکھا ہے۔ احمد سعید انصاری نے "جامع کنندۂ ابیات" لکھا ہے۔ (ص ۱۲) یہ بھی درست ہے کہ گو ذرا ثقیل ہے نمبر ۵ میں "برے ہستی ناشیدہ" اور "پیدائی نارسیدہ" کو اصل متن کے مطابق لکھ کر اپنے مجز کا اظہار کیا گیا ہے۔ رقیقہ یہ ہے کہ غالب نے اپنی کئی تحریروں (نظم و نثر دونوں) میں خود کو وحدت الوجودی کہا ہے، اسی نسبت سے اس دیباچے میں بھی خود کو "ہوئے ہستی ناشیدہ" (یعنی وجود مہم) اور "پیدائی نارسیدہ" (وجود اعتباری) لکھا ہے چنانچہ اسی تناظر میں ان عبارتوں کا ترجمہ کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی نمبر ۵ میں "مہ فن بجفی" غلط محض ہے یا تو "بجفی مہ فن" ہی کی ترمیم قائم رکھی جاتی جیسا کہ نذیر احمد (غالب نامہ، ص ۱۵) نے کیا ہے یا یوں لکھا جاتا: "اس کی عاقبت ایسی ہو کہ اسے مہ فن بھی بخت میں نصیب ہو جائے" جیسا کہ انصاری نے لکھا ہے (ص ۱۲۱) یا پھر یوں کہ: اسے رب اس کا مہ فن بھی بخت میں ہو۔

اب آخر میں تیرہ خطاں کی تقریظ کے اردو ترجمے (مشورۂ نسخہ خواجہ) کے ضمن میں چند معروضات پیش کرتا ہوں :

نیر کی تقریظ کا یہ ترجمہ جو دیوان کے آخر میں شامل ہے مجموعی حیثیت سے کامیاب و در دوں دواں ہے لیکن پھر بھی کئی مقامات پر مترجم (تفصیل کنندہ) سے کفر شیں ہوتی ہیں۔ ذیل میں اصل عبارت اور اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے اور پھر تصحیحات کی نشاندہی کی جاتے گی۔

اردو ترجمہ (نسخہ خواجہ)

"ایک بے نیازانہ چہرہ قدمی کرتی چوتی
مستورہ ہے جس نے پردہ کبھی کے
انداز میں چہرے سے نقاب اٹھا کر
واہن کر کے باندھ لیا ہے" (ص ۲۴۴)

اصل عبارت

(۱) لا رہالی خرام مجبورہ امیت متقنہ از
کُتخ برداشتہ و دامن بگر بردہ

اسل عبارت

(۲) پہنا در پرند نیست مانند سپر ثوابت
گھر آئیں

(۳) ارتنگے است بنمایش نقشاتے دینے
پشت دست مانی وارڈنگ بر زمین
سای

(۴) فروزندہ چراغ دودہ آسم

(۵) بر شستہ پیش طاق شناسائی
بر آوزد

(۶) ہنگی اشعار شعری شعار

اردو ترجمہ (منو خواجہ)

ستاروں بھرے آسمان کی مانند مریخوں
بہرا ہوا ایک کشادہ ریشی پھریرا ہے
ص ۳۳۲

ایسا رقت ہے جس کی نادر تصاویر کی
نمایش دیکھ کر مانی وارڈنگ بھی کونش
بہا لاتے ہیں، ص ۳۳۲

دوات کی روشنائی کا چراغ روشن
کرنے والے، ص ۳۳۳

آگاہی کی محراب کے روزن پر مستحق
کر دے، ص ۳۳۵

مخلد اشعار ... ص ۳۴۵

مثال اول میں "دامن بکر بردہ" دامن کمرے باندھ لیا ہے کے بجائے
"دامن کمرنگ لے آئی ہے" کا محل تھا جب کہ "تنقید غالب کے سوال" میں مندرج
ہے (دیکھیے ص ۶۲۳) دامن بکرزدون اصلاً "دامن بالازون" کا مترادف ہے
مثال دوم میں "پہنا در پرند نیست" کا ترجمہ "کشادہ ریشی پھریرا" کیا گیا ہے جو درست
نہیں۔ پرندہ کا معنی "پارچہ ابریشی" ہے لہذا اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے: "اے
فروزنگ پھیلا ہوا ریشی کپڑا کیجیے"۔ مثال سوم میں "پشت دست مانی وارڈنگ بر زمین
سای" کا مفہوم "مانی وارڈنگ بھی کونش بہا لاتے ہیں" اور ج کیا گیا ہے جو درست
نہیں۔ کونش بہا لانے کو فارسی میں "پشت دست بر زمین بہا دن" کہتے ہیں جیسا کہ
ظہوری کے اس شعر سے ظاہر ہے :

پسیم چوں چاکران ہمیں فلک پشت دستے ہند بر زمین

مندرج بالا عبارت کا مفہوم یہ ہوگا: ”عجز کے اظہار کے طور پر اپنی پشت دست زمین پر دگرتے ہیں۔“ یہی مفہوم ”تنقید غالب کے سوسال“ میں ملتا ہے اور یہی فیض اور درست ہے۔

مثال چہارم میں فارسی عبارت کا صحیح مفہوم یہ ہونا چاہیے: ”دوات کے خانوادے کا چراغ روشن کرنے والے“ مثال خبسم میں ”شمر“ اور ”پیش طاق“ کے لفظ قابل غور ہیں۔ ان دونوں کا مترادف یہاں ”محراب“ اور ”روزن“ کے بجائے ”قبہ“ اور ”صحن خانہ“ یا ”دروازہ بلند“ ہونا چاہیے۔
مثال ششم میں ”شعری“ کا ترجمہ نہیں دیا گیا۔ پورے فقرے کا ترجمہ یوں ہوگا: ”مجلد روشنی بجا اشعار“۔

دیوان غالب کے اس نسخہ خواجہ کے آخر میں ”مزید ماخذ“ کے زیر عنوان آٹھ کتابوں کے نام درج ہیں ان میں سے تین کا اندراج قطعی بے محل ہے یعنی امیر کبیر نواب شمس الامراء بہادر کی ”علم جبرئیل و علم حیات“، رجب علی بیگ کی ”فناۃ جماعت“ (طبیع اذل) اور ملا معین الدین کی ”سماح النبوة“۔ کیا مرتب نے ان تینوں مذکورہ کتب سے کوئی حوالہ دیا ہے یا اقتباس کیا ہے۔ اگر انہیں ماخذ کا نام دیا ہے؟ کیا مرتب پر ”ماخذ“ کے صحن روشن نہیں؟ پھر یہاں کتب ”سماح النبوة“ (علمی نسخہ) کو معین الدین داعظہ الکاشغری سے منسوب کیا ہے حال آنکہ یہ کتاب ملا معین الدین فراہی کی ہے۔ فراہی ہرات کے نزدیک کا وہ معروف قریب ہے جو بڑا نرم خیز رہا ہے۔ البتہ فراہی مصنف ”نصاب الصبیان“ کا تعلق اسی قریب سے تھا۔

تقریبی کلام! مندرج بالا معروضات کی روشنی میں آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ دیوان غالب کی زیر نظر تدوین میں متن و مفہوم کی کس قدر نارسائیاں لغزشیں اور قصاصات ہیں۔ ان قصاصات کے پیش نظر مرتب کا یہ دعوئی کہ انہوں نے اس متن کی تدوین میں عمر عزیز کے پندرہ سترہ برس صرف کر دیے، سوائے شاعر و غلو کے اور

کیا ہے۔ جس کتاب میں اخلاط کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہو، اسے کسی درجے میں بھی تدوین کا قابل فخر کارنامہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ تدوین بھی ایک ایسے قلمی نسخے کی ہو جس کے مال مسودہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ستم یہ کہ اس نسخے کو خواجہ منظور حسین مرحوم جیسے شریف آدمی سے منسوب کر کے اسے "نسخہ خواجہ" کا نام دیا گیا ہے۔ مال مسودہ کو کسی مرحوم سے منسوب کرنا، اس کی ترویج کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔

پیش نظر مضمون کے آخر میں نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری (متعارف سید محمد امجد)، نسخہ لاہور (متعارف معرشی) اور نسخہ خواجہ (متعارف سمیع الرحمن) کے پہلے دو صفحات کے عکس شایع کیے جا رہے ہیں۔ اسی طرح نسخہ لاہور (متعارف معرشی) کے شعری متن کے پہلے ایک صفحوں کے دو صفحات کا عکس اور انہی دو صفحات کا عکس از نسخہ خواجہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ نیز نسخہ لاہور کے آخری رقی کا عکس بھی شایع کیے جا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں "ماؤڈ" جولائی ۱۹۵۳ء میں شایع شدہ یونیورسٹی لائبریری کے ماؤڈ نسخے کے پہلے دو صفحات کے مختصر عکس کا فوٹو بھی شامل کیا جا رہا ہے۔ نیز نسخہ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کے متن کا عکس بھی حاضر خدمت ہے جس کے زیریں جھتے سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا تقویر کردہ

Acc No چھپایا گیا ہے۔ شاید "نئے دین" کو اس مقام پر اپنے نام کی چٹ لگایا ورنہ۔

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ زیر بحث مخطوط کے مختلف حکوس کا جو اس مضمون کے ساتھ قارئین کے مطالعے اور مشاہدے کی غرض سے شایع کیے جا رہے ہیں، باہمی موازنہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عکس پر تکنیکی تبدیلیوں، جدول اور مشینوں کے سیار، مختلف کمپنیوں کے ماڈلز اور مختلف مراحل یعنی ENLARGEMENT اور تقصیر REDUCTION وغیرہ سے گزرنے کی بنا پر معمولی سا فرق پیدا ہو جاتا ہے حتیٰ کہ یہاں کے کاڑھے یا

پتلے ہونے اور کاغذ کے کم یا زیادہ جاذب ہونے یا اس کی سطح کے چمکدار یا کھرا ہونے سے کسی حد تک فرق پیدا ہو جاتا ہے، مگر اس سے سوا خط اور حروف و الفاظ کی نشست اور بیچ و خم میں مسخ و محو ہونے والا فرق بہر حال نہیں پڑتا۔

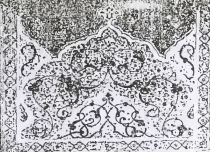
مرتب نے نسخہ خواجہ کا جو عکسی متن شایع کیا ہے وہ جدید ترین ٹیکنیک سے تیار کیا گیا ہے جبکہ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کے مضمون (ماہ فروری ۱۹۵۴ء) کے ساتھ شایع شدہ عکس چالیس برس پہلے غلطی کے فوٹو عکس سے پرزیشو بنا کر پلیٹ سے تیار کیا گیا تھا۔ اسی طرح عرشی مرحوم کو ۱۹۵۸ء میں اسی قسمی نسخے کا رٹوگرام فراہم کیا گیا تھا لیونوگرام میں تحریر سفید اور کاغذ سیاہ ہو جاتا تھا۔ یہ ٹیکنیک اب مدت سے متروک ہو چکی ہے۔

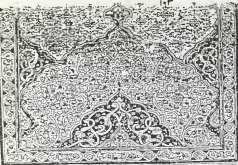
عبد جدید کی ٹیکنیک کی پیشرفت کے باعث فرنیچر ٹیکنیک اور انفراریڈ کیمیرے اور کیمیا کی تجزیوں بشمول کاربن ٹیسٹ وغیرہ سے دستاویزات میں نقصان برابر ہو چکا اور تحریریں و تعزیرات بھی ناقابل تردید تعین ممکن ہے۔ چنانچہ ان جدید ترین ٹیکنیکوں کا اطلاق نسخہ خواجہ کی چند تحریفات پر بھی بخوبی کیا جاسکتا ہے تاکہ حقیقت حال معلوم کر سامنے آجائے۔

امید داشت ہے کہ مندرجہ بالا گزارشات کے پیش نظر اور مذکورہ عکسی شواہد کی موجودگی میں قارئین خنداں مہسولت ادا نہ لگائیں گے کہ بغاوتیں مشغول کی یہ مزعومہ تثلیث اصل میں ایک ہی نسخے کی توحید کی داستان بیان کر رہی ہے اور یہ داستان ہے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے کی گم شدگی اور نسخہ خواجہ کی تصدیق میں اس کے ظہور ثانی کی۔ یہی بات کہ اس قلمی نسخے کی بازیافت کب تک ممکن ہے سو اس باب میں غالب ہی کا یہ شعر ڈیو اکسید دلاتا ہے:
 دیکھیے پاتے ہیں حُشاقی، بھٹوں سے کیا فیض
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے



مقام محترم ایشان را صلوات و نماز و تحنن ایشان را فرمود که الهی از
 سامان جبره گردانی ماده و فانی از خود سندی دست پنداده است
 نه چوبهای سنگ نوب خورده به چارنا بیست و یک سندی از امر شایسته
 بلکه به تیر سکا فتنه کار و بر سر نیز کرده بسویان خواستیده اند و بن
 که اصل شوق بجوی آتش پارسه است آتشی که در گنجهای غنی
 و خاموش و از کف خاکستر بر گشتن در شب پوش منی به روی مسلم
 از ناپاکی به استخوان مرده نماند یکسبب و از دیوانگی بر شعله شمع مرگش
 آویندن جرات بدل که صحنه خورده و بر تمام و در سن انشا بدین رخ آتش

[illegible]



مشتمل بر شش بیان را صلوات الله و علیهم اجمعین بیان افروید که یکی از
سازمان مجرب و عالی الماده و وامی از مردمندی دست بهداد و
نیز جوایز سنگین خوب خورد و بهجای یکصد ششصد فی انوار شریف
نظایر بهر کافیه کار و در زیر کرد و لیکن این خرافه و عیون
که اهل شوق و شجری است پس پاریسی است آشنی که در کجای عیون
و خاموش و از کف است و در میان خوش و بد و بی خبری و بی خبری
از با مالک بهر خوان و خواندگار است و این را از اولی ششصد و شش
و بیست و شش سال که در میان میرود و در میان این ششصد و شش



بصلح برافروزدند و آتش پرست را به باد افراهم در آتش سوزانست
 پس سید اندک نیز بودند در پیرای آن حشده آفرید و آتش پرست که
 بجز روحی بر سنگ سنگ نماند و در ایوان پادشاه بنشیند
 حسن افراسیاب و لاله زارنگ مرغ را چشم و کده را چراغ بکشند و نزد آن
 درون سخن برافروزد و اسباب هم که شکاری از آن آتش تاباک حکاکر خوش
 یافت به کلاه سپیدافشان و او نفس دمی بر آن بر نهاده بود که در آن کلاه
 رو کاران ایما به فراموشی تواند آمد که حجره را فرود شنای چراغ و رایحه
 جو در بال شناسای دماغ تواند بجنبید همانا نگارنده این نامه را آن
 در سرست که پس از آنجا به ایوان ریخته به گرد آفریدن سرمایه و ایوان خان
 بر خیزد و با سینه خاصه کمال این فرورین پس از نوی خوشن شیند
 امید که سخن بر زبان سخن در سنای پرکنده ابیاتی را که خارج ازین اوراق
 باشد از انار تراوش رنگ گلک این نامه سیاه شناسند و چاکر
 در سنایش و کیمیش آن اشعار بمنون را بخود کشاند یا رب بن بوی
 بهی ناستیده از بهی بهی بهی ناستیده یعنی نقش نموده
 نقاش که به پندار خان موسوم و به پندار خوشه موسوم به غالب

[illegible]

[illegible]

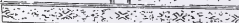
نوشته تارخ سید محمد
 کے دو صفحات
 مطبوعہ ماہ 'نوائے جلالی' ۱۹۵۳ء
 کے منقرعہ عکس



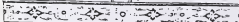
مخلص نیست چنانکه اگر آبادی مراد و دیو و پلوی کنست و جام کار بجای مدفن غیر باد



<p>اعش فرادی ہی کی شوخی محراب کا کا و کا و سخت چائینائی تنہائی بوجہ جذبہ اختیار شوق و کیا جا ہی اکبر نام شہیدان جہد جا ہی بچھا سکہ ہونے طالب اسیر میں ہی آ رہا</p>	<p>کاغذی ہی بہرین ہر پیکر تصویر کا صبح کو تاشام کالانا ہی جوشیہ کا سینہ شمشیری باہری تم شمشیر کا دعا غنائی اپنی عالم نقشہ کا سوئی شہزادہ ہی جہاد میری زنجیر کا</p>
--	--



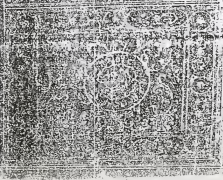
<p>جرا و بعد الارض منان داغ حکم دہ</p>	<p>مبارکباد سپہ مخوار جان دروند اما</p>
--	---



<p>فرس اور کوئی نہ آیا بروی کار آتش کے زلفش نہ کیا دست نہا خواہد بین خیال کو بخشی نہا ملہ لینا ہوں کتب غم و ملین سبق ہنوز</p>	<p>صحرانگرہ کی چشم صودغا ظاہر ہو کہ دلغ کا سر پایہ دو و تھا جب کہ کھل گئی شہزادان نہا نہا لیکن ہی کہ زینت گیا اور بود تھا</p>
--	--

این ملازم می باشد که در این شهر است و در این
 محله و در این کوچه و در این خانه و در این
 ایوان و در این سالن و در این کونیه و در این
 شرف و در این کونیه و در این شرف و در این
 قریه و در این کونیه و در این شرف و در این
 قریه و در این کونیه و در این شرف و در این

این ملازم می باشد که در این شهر است و در این محله و در این کوچه و در این خانه و در این ایوان و در این سالن و در این کونیه و در این شرف و در این کونیه و در این شرف و در این قریه و در این کونیه و در این شرف و در این	این ملازم می باشد که در این شهر است و در این محله و در این کوچه و در این خانه و در این ایوان و در این سالن و در این کونیه و در این شرف و در این کونیه و در این شرف و در این قریه و در این کونیه و در این شرف و در این
---	---



این باریون صحیح شناسیم یکی استعاره معنی شعار عرب و قصیده
عاطفه و رباعی هزار و با صد و پنجاه و اندک قسم
الایه و اما بهر شان پرسی و شد و گوشان گوشه پست هزاره
شماخت فراوانی حکیمه معانی با بدقت نه در مقوله معارفه در
خرد و بهر علت ایات گرفت چنانکه خود این و الا امور کار و در کار
این معارفه به پرسی نامه خویشین در سروده سازان گفتار خود میسر آید

از من یاد کناری بر من بماند
چو هم گشت اشعار من اند

فہرست و متن
صحاح

پس نوشت

”دوران غالب“ مشہور خواجہ۔ اصل حقائق کا پہلا ایڈیشن ادا اہل اہل سنت میں شائع ہوا تھا اور ایک ڈیڑھ ماہ کے تکلیف عرصے میں محترم ہر گیارہ اہل علم نے اسے پذیرائی بخشی۔ تب سے اب تک اس کی بڑھی مانگ رہی۔ اس دوران بہت سے نئے حقائق بھی سامنے آئے اس سب کا تقاضا تھا کہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو۔ سو اب یہ اہل نظر کے ہاتھوں میں ہے۔ تماشا تیروں سے ذہیلے غرض حق نہ اب ہے۔ امید ہے یہ نیا ایڈیشن بھی حسب سابق احسان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

کتاب کے شایع ہونے کے ایک ماہ بعد ہی سنت میں ڈاکٹر معین الرحمن نے اس کا جواب ”دوران غالب“ مشہور خواجہ۔ صحیح صورت حال کے نام سے اپنے ادا سے شائع کیا۔ اس جواب کو اہل علم نے عذر گناہ بدتراز گناہ جانا۔ اس دوران میرے موقوف کی حمایت میں پورے ملک میں پلے دپلے تحریریں شائع ہوئیں۔ ان میں مضامین بھی تھے، کالم بھی اور فلمیں بھی۔ سید قدرت نقوی بھی سنت میں ”دوران غالب“ مشہور خواجہ مشہور شد۔ ایک جاتزہ کے زیر عنوان ایک بڑا عالم از متناہ کتابچے کی صورت میں شائع کیا جس میں نہ صرف معین الرحمن صاحب کے متعدد تحقیقی تصامحات (پیر گرافے گئے تصامحات کے علاوہ) بتائے گئے تھے بلکہ قوی دلائل کے ساتھ (میرے موقوف کی تائید میں) یہ بھی ثابت کیا گیا تھا کہ معین صاحب کا شائع کردہ مشہور ہی نسخہ لاہور ہے جس کا اولین تعارف جلالی ۱۳۹۷ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے ماہ لغویہ کرایا تھا اور جس پر بعد ازاں قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے قلم اٹھایا تھا۔

سید قدرت نقوی کے کتابچے کے شائع ہونے کے ایک ماہ بعد ستمبر ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر عارف ثاقب نے ڈاکٹر معین الرحمن کے اور میرے کتابچے کا ایک محاکمہ دیوان غالب، شہزاد خواجہ اہل حقائق اور دیوان غالب شہزاد خواجہ، صیغہ صورت حال — ایک۔ تعابلی جائزہ کے عنوان سے شائع کیا جس میں شہزاد تجزیہ کر کے ثابت کیا کہ معین الرحمن صاحب میرے علمی اعتراضات میں سے اکثر کا جواب دینے سے قاصر رہا اور جن اعتراضات کے جواب انھوں نے دیئے ان کی حیثیت بے جان تاویل اور مضحکہ خیز جملوں کی ہے اور میں۔

مئی ۱۹۶۱ء میں کتابچہ لکھنے کے بعد بھی معین صاحب الطینان سے نہیں ملے وہ اپنے بے بنیاد موقف کو بعض اخباروں میں پیش کرتے رہے اور میں نہ ان کی تفسیر بنے رہے۔ مذکورہ کتابچے کے بعد انھوں نے ”برسبیل غالب“ کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی اور اس کے ایک مہ ماہ بعد دیوان غالب شہزاد خواجہ (اصلاً شہزاد لاہور) کا ڈی لکس ایڈیشن شائع کیا۔ اس ڈی لکس ایڈیشن پر سزا شامت اگست ۱۹۶۱ء درج ہے جو درست نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دیوان غالب کا قلمی نسخہ معین صاحب نے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کو ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو واپس کیا تھا۔ جب تک اس نے ایڈیشن کا نہیں پتا نہ تھا۔ اس میں نام امر یہ ہے کہ عرضہ الذکر کتاب اور ڈی لکس ایڈیشن دونوں کو فروخت کے لیے مارکیٹ میں نہیں رکھا گیا۔ ایسا کیوں تھا اس کا ذکر آگے چل کر ہوگا۔ لگے اوراق میں معین الرحمن کے شائع کردہ قلموں کا زاموں کا مختصر جائزہ لیا جا رہا ہے سب سے پہلے ان کی مختصر تالیف ”دیوان غالب شہزاد خواجہ — صیغہ صورت حال“ پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہو گا جسے میں نے اختصار کی خاطر کہیں کہیں ”.... صیغہ صورت حال“ لکھا ہے۔

معین الرحمن صاحب نے اپنے کتابچے میں اپنے دفاع میں کچھ دلیلیں اور زیادہ تراوہ اور دھر سے اقباسات درج کر کے اپنے موقف کو درست ثابت کرنا چاہا ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ایک مجھوٹ کر چھپانے کے لیے انھیں کئی مجھوٹ تعین

کنا پڑے ہیں اور ان کی وضاحتیں اکثر جگہ مضحکہ خیز ہو گئی ہیں۔ کئی جگہ وہ اپنی فطرت کے مطابق ترمیم کرتے ہیں۔ اقتباسات اور جگہ کرتے ہیں تو ان میں حسب منشاء قطع و جربہ کرتے ہیں کہیں طعن و تشنیع سے کام لیتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ کم حوصلہ عورتوں کی طرح کوسنے دینے اور طعنے دینے کا اسلوب اپنانے کے بجائے وہ ڈھنگ سے میرے اعتراضات کا سلسلہ وار جواب دیتے مگر ان کی حالت تو اس باب میں سعدی کے اس درویش کے مانند نظر آتی ہے جس نے ”واسن بیار“ کے جواب میں عالم بے سبی میں کہا تھا:

”واسن از کجا آرم کہ جاسر ندارم“ (جھولی کیسے پھیلاؤں کہ یہاں تو گونا گویا نہیں؟)

رفیق احمد نقشب نے معین الرحمن کے اس طرز عمل کے باب میں لکھا ہے:

”ڈاکٹر سید معین الرحمن پرجعل سازی اور غریب کاری کے نگین الزامات عاید کیسے گئے ہیں۔ الزامات میں سے کچھ کو انھوں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ کچھ کے جواب میں الزام لگانے والوں کو بد و عاقل اور کوسلوں سے تراز اچھے اور کچھ الزامات کے جواب میں جو عوقفت اختیار کیا ہے اس سے حذر گناہ بد تراز گناہ کا عملی نمونہ سامنے آتا ہے۔“

معین الرحمن صاحب نے اپنے کتابچے کے آغاز میں ایک جگہ پاؤنڈ کا قول نقل کیا ہے جس کی ٹو سے ناقص اور بے اثر ہوا ہیں (ہدایاں نہیں جیسا کہ معین الرحمن نے لکھا ہے) بنانے والا تو سماجی تجرم سمجھا جاتا ہے مگر ناقص رد قول اور خیالات اور معلومات کی اشاعت کرنے والا عالم اور دانشور صاف بچ نکلتا ہے جبکہ اس کا دار منافع خود اور جلی دہائی گھنپنیوں کے دار سے آگے جاتا ہے۔

اپنی کتاب کے ذریعے میرا کام دراصل انہی ناقص رد قول اور خیالات اور معلومات

کی اشاعت کرنے والے اس غالب سشناس "عالم" اور دانشور "کو بجے نقاب کرنا تھا۔ الحمد للہ میں اس میں کامیاب رہا اور ملک اور بیرون ملک کے متعدد محفل علم نے میرے اس تحقیقی کام کو سراہا۔ ان حضرات میں سے بعض کی آرا اس نئے ایڈیشن کے اختتامی صفحات میں نقل کی جائیں گی۔

کتابچے کے ص ۱۲ پر معین الرحمن صاحب نے خود کو ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جناب مشفق خواجہ کے قبیلے کا آؤنی فرد کہا ہے۔ میرے خیال میں یہاں ان کے حافظے نے خطا کی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے فرمان فتحپوری اور مشفق خواجہ کبھی دہلی سرحد کے مرگب نہیں ہوئے۔ معین صاحب کو تو خود کو کسی ایسے قبیلے یا طائفے میں شامل یا شمار کرنا چاہیے جس کا ذکر حضرت سعدی نے بایں الفاظ کیا ہے: "یکے از طائفہ کوزواں بہ گلتہ کہ نشستہ بودند" میں نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۱ پر ان کے بعض دہلی سرحد کا سرسری ذکر کیا تھا اور بعض کا ذکر آئندہ کے لیے اُٹھا رکھا تھا۔ بے محل نہ ہو گا اگر یہاں کم از کم ان کی ایک ایسی ہی دھاندلی کا ذکر کر دیا جائے۔ محترمہ عاصمہ وقار نے سماجی ارتکاز "کراچی کے شمارہ اکتوبر ۱۹۹۹ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک ناورد خط" کے زیر عنوان اپنی ایک مختصر سی تحریک پر شائع کی تھی۔ آغاز میں انھوں نے چند مختصر تمبیدی کلمات لکھے تھے اور سید عبداللہ کے خط کے اندراج کے بعد آٹھ مختصر حاشیے تحریر کیے تھے۔ نہ صرف یہی تمبیدی کلمات باؤنی تقریر معین الرحمن صاحب نے ماہنامہ "خلاست" لاہور کے نومبر ۱۹۹۹ء کے شمارے میں اپنے نام سے چھپوائے بلکہ عاصمہ وقار کے لکھے ہوئے آٹھوں کے آٹھوں مختصر حاشیے بھی ہتھیا کر ان دامن اپنے نام سے شائع کر دیے۔ قارئین ان دونوں تحریروں کے کامل عکس ملاحظہ فرمائیں اور پادوبہ کا ذکر وہ بالاقول بالبر و ہر باتیں۔ جو شخص عاصمہ وقار کے چند سطری مضمون پر دندان آذخیز کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ پر مغوی چند کی تہن سو سے زائد صفحات پر مشتمل "باغیر غالب" عصب کرنے میں کیونکر تامل کر سکتا ہے ؟

متعارف :- حاصرہ وقار

الوقار - ۵۰ - لوتر ہل - لاہور

ڈاکٹر سید عبد اللہ کا ایک نادر خط



ڈاکٹر سید حسین ارمن کے اضرہ نوادر کا ایک بڑا مضبوط حصہ (سیکشن) اکابرِ دل علم و ادب کے قلمی خطوط پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں سب سے قیمتی اور قدیم، غالب (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء) کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط ہیں۔ غالب کے تین سے خط انھوں نے ساٹھ سالہ نقوش لاہور ۱۹۹۳ء اور "لرننگز" کراچی کے چھٹے شمارے (۹۵ - ۱۹۹۳ء) میں پیش کیے۔ "غالب کے پانچ مزید خط انھوں نے شعبہ اوردو، گورنمنٹ کالج لاہور کے دیسچجر مجریل تحقیقی نامہ "کے غالب نمبر ۹۵-۱۹۹۳ء میں متعارف کرائے ہیں۔

آج، ڈاکٹر سید عبداللہ (ولادت منگور ضلع ہزارہ در اپریل ۱۹۰۶ء وفات لاہور ۱۳ اگست ۱۹۸۶ء) کے ایک خط کا متعارف مقصود ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم سید محمود کے محترم، معارف اور ممتاز ترین دل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید حسین ارمن کے پاس ان کے قلمی خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جس میں سے متعدد خط پہنچ برس سے بھی زیادہ چھپے کے ہیں۔

قارئین "لرننگز" کے لیے اگلے صفحات میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء کا ایک خط پیش کیا جا رہا ہے۔۔۔ کوئی اٹھاون (۵۸) برس چھپے کا لکھا ہوا یہ خط، غالب کے نامور استاد ڈاکٹر انیس۔ ایم۔ اکرم (ولادت چک جمرو، فیصل آباد، اگست ستمبر ۱۸۹۰ء، وفات لاہور ۱۷ جنوری ۱۹۷۰ء) کے نام ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ کا اس سے پہلے کوئی خط شاید ہی کہیں اور محفوظ ہو۔ خط کا متن جیسا کہ ہو۔۔۔ متن کے وفاق حوالی میرالصاف ہیں۔

حاصرہ وقار

یہ خط "قلمی زبان" (کراچی) - ہفت روزہ "مدنی زبان" (ملتان) - اور بھی "نقد و نظر" (علی گڑھ) اور "تحقیق" (کراچی) - غالب نمبر ۱۹۹۳ء کے شمارے کے ساتھ منسلک ہے۔ ڈاکٹر سید حسین ارمن نے اپنی کتابت سے اسے۔

سید باہی لرننگز کراچی
اکتوبر ۱۹۹۵ء

۹۰

مکرم و محترم الاسلام شکیم

اس غامضہ تعارف کی بنا پر جو مجھے آپ سے آپ کی ذریعہ کتب - غلاب نامہ - "۱" کی بنا پر حاصل ہے، حاضر ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ مجھے محض نہ خیال کیا جائے گا لطیف صاحب "۲" کی غیر مستحل تنقید جب پہلے پہل خارج ہوئی تو "۳" اس کے تیرہ فقرہ کو دیکھنے کے لیے میں نے انہی دونوں میں اس کا مطالعہ کیا تھا۔

مصنف نے اپنی افکار طبع، اور مطلب کے خط اثرات سے متاثر ہو کر بطور ایک تالیف پسند رخ کے جو فیصلہ غلاب کی عظمت کے مشعلق دیا ہے اس سے بہت نریغ ہوا۔ محسوس ہوا کہ سبہ چارے غلاب مرحوم کو جن کی زندگی مصر کی بے قدری اور اعلیٰ مصر کی بے بہری کے ماتم میں گزری، مرنے کے بعد بھی لپے حراکہ نگار نے جن کی بے بہری میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

مرنے کے بعد بھی جن نے پایا تو کہ مر جائیں گے ؟

ہمم جیسا کہ آپ نے اپنی پلندہ پایہ تصنیف میں ذکر فرمایا ہے، اس سے غلاب کو کچھنے کے لیے نئی و جی کھلیں اور ڈاکٹر صاحب نے جو حوالہ دیا ہے، ان پر عمل کرتے ہوئے اس سقم کی کٹائی ہو سکتی ہے جو ردوار کھا گیا ہے۔ اس کے بعد ہمیشہ اس طیل میں رہا کہ کتا کئی لم ردو کار سے کبھی نہاتے تو اس طردہ کچھنے کے لیے بات اٹھاؤں --- ہر مری بہر صاحب "۴" سے سا کہ وہ غلاب پر قلم آزمائی کر رہے ہیں۔ توقع تھی کہ اس پہلو کو ہمیدیں گے --- جس کتاب لکلی "۵" تو دیکھا کہ انہوں نے "حزب غلاب" تیار کی ہے۔ آخرچہ چیز خوب ہے لیکن ہمارا مقصود مشقود تھا۔۔۔۔۔ تاکہ انہیں کی دینی معلوم ہوا

کہ "غلاب نامہ" تمنا ہے جو سب پر غلاب ہو گا۔ چنانچہ آیا دیکھا گیا

میں نے یہ مانا "کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

آپ نے خوب لکھا ہے اب "غالب" کی تصویر مکمل ہوئی --- اب "مردش دوروں" کے
نثر منہ خاص کے ساتھ انصاف ہوا! ذرا اپنی جفاؤں پر پشیمان ہوا!

کیا یہ فرض کر سکتا ہوں کہ اس "تایاب" تالیف کو (تایاب ہندو معنی) آپ نے
انگریزی میں کبھی شائع نہ کیا --- شاید یورپ کو ہمارے خاص کی عظمت کا اعتراف کرنا
پڑا --- کیا اب انگریزی میں تبدیلی نہ کر دیں گے؟ ضرورت تو ہے اور خدمت بھی!
ایک شکست بھی ہے (اور دوستاؤں بلکہ مخلصانہ) کہ کتاب کے ہر سرورق سے شعلیں
بے صبری اور بے پردہائی کے آثار ظاہر ہیں۔ کاتب کی غلطیوں کی اصلاح جنسی کی محنت - بعض
جگہ جملہت نمایاں غلط ہیں۔ مسلح کی طرف سے ذوق کی کمی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ غالب اس
بے گاہ کی غالب کی کتاب کو ذوق سے بے گاہ ہونا چاہیے تھا۔ "ہند" کو جس شخص نے چسپاں کیا
گیا ہے، گریا بلاؤں میں کانٹے کی گرانی تھی۔

جنگ یورپ میں وہ کہتے ہیں گراں ہے کاغذ

ان فرد گناہتوں کا اثر مصنف کی تحقیق پر پڑا ہے۔ "یادگار غالب" کے مضمون ۱۹۰۸ء میں
لکھی گئی ہے (صفحہ ۱۳۳) ملاحظہ ہو کہ ۱۸۹۸ء کی بھی ہوئی کتاب بھی موجود ہے، دغیرہ دغیرہ
جبرہ و تظہیر مراد نہیں بلکہ فرض یہ ہے کہ پتہ کے پیر سے پرے چھاپیں گئیں ہیں۔
مصنف کی کتاب بہتر طرز مقدم کی مستحق تھی چنانچہ خیر یہ باتیں آپ مصنف حضرات جانیں
--- ہم ناظرین اسرار کو کیا معلوم!

تقدیر پنی تھی ہے۔ واقعی کسی یورپین نقاد کی کتاب معلوم ہوئی ہے۔ ایک دور کا
دوسرے دور سے اور ایک واقعے کا دوسرے سے جو وہاں قائم کیا گیا ہے، خوب ہے!
کیا آپ ہندی حسن "۶۰" نکلات ہندی "۸۰" کے فضل قدم پر نہ چل سکیں گے!
صرف اتنی ہی گزارش مطلوب تھی۔

میں واسطی

نیلا ستار

سید محمد عبداللہ

سہ ماہی آوازِ نگر
اکتوبر ۱۹۹۵

۹۲

مستعین صاحب علیحدہ بحث پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میں نے اپنی کتاب کے ص ۳۱ پر سات ایسے مہر جوں کی نشاندہی کی تھی جو ناموزوں تھے۔ میں نے دیوان غالب نسخہ خواجہ (پہلا ایڈیشن) کے ص ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۹ اور ۳۱۰ پر مرقوم ان تہا راج از دوزن مہر جوں کا ذکر کیا تھا نہ کہ متن میں جیسا کہ مستعین صاحب نے تاخر دینے کی کوشش کی ہے (دیکھیے ان کے کتابچے کا ص ۱۸)۔ متن میں یہ مہر جے بلاشبہ جمع ضبط ہوئے مگر سوال یہ ہے کہ آگے چل کر ناموزوں کیسے ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ وہاں متن سامنے نہیں تھا اور مرتب نے محض حافظہ سے کام لیا تھا۔ چونکہ مستعین صاحب کا حافظہ موزوں شاعری کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے اس کی رہنمائی کے نتیجے میں وہ بے راہ ہو گئے۔ تاہم یہ ہے کہ اپنے کتابچے کے ص ۲۲ پر مستعین صاحب نے اپنے پیر و مرشد رشید احمد صدیقی میں بھی اپنا عکس لطیف لاکھ کیا ہے اور اپنی طرح انھیں بھی ناموزوں طبع قرار دے ڈالا ہے۔ یہ ہے اپنے پیر و مرشد و مفتدی کی عزت افزائی جسے وہ ”میری زمین، میرا آسمان، میرے نگہبان، میری ماری کائنات تھے وہ“ (ص ۲۳) کے الفاظ میں یاد فرماتے ہیں۔ ان کی اس بے دروازہ دوش کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مشرف احمد نے بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں :

”ڈاکٹر گیان چند جین نے ذرا ہلکے انداز میں میرے ترقف کی حمایت میں یہی بات کہی ہے :
 ”احضول (تختین ذراتی) نے مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے بارے میں ص ۳۹، ۴۰ کے فٹ نوٹ میں جو دو مثالیں دی ہیں اگر ان میں سہو کا بہت کا دخل نہیں تو معترض کا دعویٰ ثابت کرتی ہیں ص ۴۰ سے ص ۴۲ تک دیوان میں ناموزوں مہر جوں کی جو فرست دی ہے ان میں سے بیشتر کا تعلق اوقات یا ہمزہ یا آخری فون کے نقطے سے ہے جو کتابت و طباعت کی غلطی ہو سکتی ہے لیکن ذیل کے مہر جے یقیناً غیر موزوں ہیں، محرم نہیں ٹوٹی فرامانے راڈ کا ص ۳۰، لکھتے ہو تم سب کو نسبت غالبہ ہو گئے ص ۳۰۹، ہاں میر نور محمد نہیں اس کا نام ص ۳۱ بچوں کا بھی نہ دیکھا تھا کون دن اور ص ۳۱۶۔“ — ہماری زبان دہلی ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۸ء

”رشید صاحب کے مزاحیہ مضامین ہول یا علیٰ ہر جگہ آپ کو
 موزوں اشعار ملیں گے۔ رشید صاحب کے دیوانوں شاگردوں کو ہم
 جانتے ہیں۔ کسی نے آج تک ان میں یہ عجیب نہیں بتایا تھا بلکہ جسے رشید
 صاحب نے یہ بات (اپنے ناموزوں طبع ہونے کی) بہ طور تفسیق کے
 کبھی کہی ہو جسے ناموزوں طبع افراد نے گہر میں بانڈھ لیا ہو۔ کراچی میں
 علی گڑھ کے ایک ان پڑھ شاعر اُستاد عرقا روتی رہا کرتے تھے۔ انھوں
 نے مشہور داستان ”کلید و دھنڈ“ کا نام سنا اور ایک دن رشید صاحب
 سے ہمارے پوچھا کہ ”کلید و دھنڈ“ کا کیا ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے
 کہا کہ حاضریٰ بھٹل آجائیں تو اس کے معنی بتاؤں گا۔ اس کے بعد وہ اکثر
 اس داستان کو ”کلید و دھنڈ“ ہی کہا کرتے تھے۔ اب اگر ان کا
 کوئی شاگرد دیکھے کہ اس کا درست نام وہی ہے جو رشید بتایا کرتے
 تھے تو اس سے شاگرد کی عقیدت مندی تو ظاہر ہوگی مگر نام غلط
 ہی رہے گا۔ خواجہ منظور حسین نے کلاسیکی اردو سی افسانوں کے
 اردو میں تراجم کیے تھے۔ اس کے پیش لفظ میں انھوں نے لکھا تھا کہ
 یہ تراجم انھوں نے اردو زبان میں اپنی مشق اور استعداد بڑھانے کی
 غرض سے کیے ہیں۔ کیا آج کوئی کج فہم شخص ان کے انکسار کو یہ معنی پہنا
 سکتا ہے کہ انھیں اردو نہیں آتی تھی؟

معین صاحب نے اپنے کتابچے میں میرے بعض اقتباسات حسبِ عادت نقل
 ورجہ کے ساتھ نقل کر کے غلط تاثر پیدا کرنا چاہا۔ میں نے اپنی کتاب کے ص ۵۲ پر
 ”چشمِ روستائی“ کی تحریک کے نتیجہ غلط معنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا :

”۱۔ دیوانی غالب، مشہور خواجہ کائنات زحر“ (کالم) ”مطبوعہ روزنامہ“ ”ایکپرس“
 کراچی، ۱۶ جولائی ۲۰۰۰ء

فارسی متن میں ”چشم روشنی“ کی جو ترکیب استعمال ہوئی ہے اس کے معانی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے نہ ظہور الدین احمد کے یہاں نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا۔

معین صاحب نے اس اقتباس میں تحریف کرتے ہوئے یہ تاثر دیا یا بانگیا میں نے فارسی ویباچے کے اُن اردو تراجم کو جو ڈاکٹر نذیر احمد، ظہور الدین احمد، اعظم علوی، احمد سعید انصاری اور جابر علی سید نے کیے تھے۔ کلیۃً غلط قرار دے ڈالا۔ حالانکہ میں نے ان تمام تراجم کی اپنی اپنی خوبیوں کا اعتراف کیا تھا۔ معین صاحب کا محرف اقتباس ملاحظہ فرمائیں اور ان کے ”حسن نیت“ کا اندازہ کریں:

”فارسی متن کے معنی کی تفہیم نہ ڈاکٹر نذیر احمد کے یہاں درست ہے نہ ڈاکٹر (ظہور الدین احمد کے یہاں، نہ اعظم علوی کے یہاں اور نہ احمد سعید انصاری ہی کے یہاں۔ جابر علی سید نے بھی اس کا مفہوم غلط سمجھا اور (غلط) ترجمہ کیا۔“

اسی طرح اپنے کتابچے کے ص ۲۴ پر ایک (بدولن نقاط کی بحث) کے باب میں بھی میرے اقتباسات میں تحریف کی گئی۔ تقابل کے لیے میری کتاب کا ص ۲۰۱۹ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کہنا یہ ہے کہ تحریف اور تاویل بدقسمتی سے معین صاحب کی شخصیت کا جزو لا ینفک بن بکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس باب میں صرف میرے اقتباسات کے ساتھ ہی یہ سلوک روا نہیں رکھا، مروجہ سید قدرت نقوی کے اقتباسات کو بھی تحریف کی گند چھڑی سے فونک کیا ہے۔ مروجہ نقوی صاحب نے دیوان غالب کے نسخہ لاہور پر پڑنے والی متعدد اُفاداتوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کتابچے میں ایک جگہ لکھا تھا:

اس نسخہ پر کئی افادیں پڑیں۔ پہلی افادہ اس کی پیش کش کے سلسلے میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ خطوط غالب (فارسی وارو) میں موجود ہے۔ دوسری افادہ جسے پور میں تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی تھی ریاست جسے پور سے کوئی اڈا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ تیسری افادہ لاہور میں سے کسی نے کسی طرح اڈا لایا جو شہدہ معین الرحمن کے ہاتھ آیا۔ یہ مسودہ شہزادہ مقبوضہ معین الرحمن ہے جسے انھوں نے مستحق قرار دیا۔ اس کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیش کش اچھی ہے۔

معین صاحب نے اپنی کتاب ”برسبیل غالب“ میں دو جگہ اس اقتباس میں تصریح کی ہے۔ یہ تصریح ”میدشا میٹھا سپ ہپ کڑا کڑا متھ متھو“ کی ایک جہرت ناک شال ہے۔ معین صاحب نے قدرت نقوی کی ذکر کردہ پہلی افادہ کو گول کر دیا جس میں مرحوم نے دلیل قاطع سے ثابت کر دیا تھا کہ دیوان غالب کا زیر بحث نسخہ لاہور اصل میں ہمارا ہے جسے پور کو پیش کرنے کے لیے غالب نے بصرت نزدیک شیر تیار کرایا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی منقش لوح کے تعویذ یا چھوٹی تحراب اور اس کی تختی پیشی میں کوئی متبرک کلمہ نہیں اور یہ واضح نسخہ تھا جو کسی ہندو راجہ کو پیش کرنے کی غرض سے تیار کرایا گیا تھا۔ چونکہ اس دلیل سے معین الرحمن کی ایک سے زیادہ نقول اور نسخوں والی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی اس لیے پہلی افادہ کا ذکر گول کر کے دوسری افادہ کو پہلی افادہ قرار دیا گیا۔ پھر اس نسخے کے مسودہ اور مقبوضہ معین الرحمن ہونے کا ذکر منقذ کیا گیا۔ طباعت اور پیش کش اچھی ہے اسے جملے کو رہنے دیا گیا کہ مرتب کی تصریح میں تھا۔ یہ ہے معین الرحمن صاحب کی اصلی

ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ اکرام کی تحقیق کے مطابق یہ ناواقعی خطوط ڈاکٹر تبوری سے ۱۹۵۲ء میں ایک سو روپے میں خرید کر پنجاب لاہور میں محفوظ کیا گیا تھا۔

جہ ”دیوان غالب“ مستحق قرار دیا مسودہ“ اس ۷۴

دیانت۔ اہل ان کا محرفہ اقباس ملاحظہ فرمائیے۔ اس پر دواؤں کا استعمال ہمکٹھیں مناسب
نے نہیں کیا۔

”دیوان غالب کے اس نسخے پر کئی افتادیں پڑیں۔ پہلی افتاد جسے پور میں
تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ اسے ریاست جسے پور سے کوئی اڑا لیا اور
پنجاب یونیورسٹی کو بھیج دیا۔ پھر یونیورسٹی لاہور سے کسی نے کسی
طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ میمن الرحمن کے ہاتھ آیا جسے اسٹون نے نسخہ
خارج کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پیش کش
اچھی ہے!“

یہی اقباس انہی تحریفات کے ساتھ ”برسٹل غالب“ کے ص ۲۱۷ پر بھی درج
کیا گیا ہے اور کہیں یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی کہ یہ اقباس سید قدرت نقوی
کی کس تحریر سے لیا گیا ہے۔

دیوان غالب نسخہ خارج کے مقتدے کی طرح اپنے کتابچے میں بھی میمن الرحمن نے
پنجاب یونیورسٹی لاہور سے دیوان غالب کے کئی نقلی نسخوں کی موجودگی کا امکان ظاہر
کیا ہے۔ اس نام ہناد قیاس کے پیچھے یہ نیت کار فرما ہے کہ نسخہ خارج کو باقی مرسوموں
سے الگ اور منفرد قرار دیا جاسکے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کا
میں دیوان غالب کے صرف دو خطی نسخے تھے۔ ایک نسخہ میسرانی جس کا Acc No: 4894
تھا اور جو اب بھی وہاں موجود ہے اور ۱۹۶۹ء میں اس کا کامل عکس مجلس
ترقی ادب لاہور شائع کر چکی ہے۔ اس کے علاوہ وہاں ایک اور نسخہ تھا جو
۱۹۶۷ء تک تو وہاں موجود تھا۔ جب کوئی تیسرا نسخہ تھا ہی نہیں تو میں صاحب کے

۱۔ ”برسٹل غالب“، ص ۱۸۹

۲۔ اس تحریر کی نشاندہی عادت ثاقب صاحب نے اپنا سؤرہ کے فردی
نسخہ کے شمارے میں کی ہے۔ ملاحظہ ہوں ص ۲۱۷-۲۱۸

۳۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں ام اے آندو کے ایک طالب علم (جاری ہے)

کہاں سے پیدا کریں گے۔ کسی تیسرے نسخے پر اصرار استدلال کے پائے چوبیس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ ممتاز محقق ڈاکٹر گیان چند جین نے کس قدر درست لکھا ہے،
 ”غائب کی زندگی کے دیوان کے مرتبہ نسخے مشرکوں میں بکھرے ہوئے
 نہیں کہ لاتبریری میں دو دو نسخے ہوں اور لاتبریری کے کاغذات ہیں
 صرف ایک کو چڑھایا گیا ہو۔ ایسا کوئی شخص نہیں جس نے وہاں دو نسخے
 دیکھے ہوں۔ لاتبریری کے Accasion رجسٹر میں دیوان کے
 جتنے نسخے چڑھے ہوں گے، اتنے ہی وہاں رہے ہوں گے۔ اگر
 صرف ایک نسخہ چڑھا ہے تو دو کے ہونے کا امکان نہیں۔“

یہ دوسرا نسخہ وہی نسخہ ہے جسے معین صاحب نے نسخہ خواجہ قرار دیا ہے اور جو اسٹا
 نسخہ لاہور ہے اور جس کا Acc. No 6812 ہے۔ خوش قسمتی سے راجہ کو دیوان
 غالب کے اس نسخے کے دو ٹوٹکے ملو کہ رضا لاتبریری راجپور کے ص ۲۱ اور ۲۲ کا
 عکس مل گیا ہے۔ اس عکس کے دو صفحات پر یونیورسٹی لاتبریری کا Acc. No 6812
 صاف پڑھا جاتا ہے۔ صفحہ ۲۱ پر یہ نصف نمبر کی صورت میں ہے جبکہ ص ۲۲ پر یہ پنجاب
 یونیورسٹی لاتبریری کی مدور ہمر کے اندر درج ہے۔ یہی مدور نمبر دیوان غالب کی اولین
 اشاعت (۱۹۹۸ء) کے صفحہ ۲۲ سے جو یونیورسٹی لاتبریری کا سیکرٹریج ہے،
 کھرج دی گئی تھی اور جس کی نشاندہی میری کتاب کے ص ۲۳ اور ص ۲۴ پر کی جا چکی ہے
 معین الرحمن صاحب نے یونیورسٹی لاتبریری کو یہ مسودہ نسخہ ۲۱ اگست ۱۹۵۷ء کو
 بڑے ڈرامائی انداز میں جیسے کے طور پر واپس کیا۔ انھوں نے اس پورے نسخے کو

(گزشتہ سے چوتھ) محمد افضل ملک نے اپنے تحقیقی مقالے ”فہرست مخطوطات اردو شاعری“
 میں اس قلمی دیوان کا اندراج کیا تھا اور اس کا یکمیشن نمبر 6812 بھی درج کیا تھا نیز
 دیکھیے: ”اردو مخطوطات کی فہرستیں“ (مرتبہ رفاقت علی شاہ) جلد اول، ص ۱۹۵ و ص ۲۰۰

یہ تفصیل کے لیے دیکھیے ان کا ممبر کے کا مقالہ ”دیوان غالب نسخہ خواجہ راجہ لاہور مشورہ
 ہماری زبان، نئی دہلی شمارہ ۵ تا ۲۱ دسمبر ۲۰۰۰ء ص ۲۔

لمینینٹ کروا کر واپس کیا تاکہ ص ۲۱ پر مندرجہ 265, 266, 267 کے اوپر اور اس صفحے کی ٹپسٹ پر لکائی گئی سچیاں اور ص ۱۰۰ یعنی منت پر ۲۰۰ نمبر کے دو پشت پختے دین کی چیمپی کو چھڑا کر اہل صورت حال معلوم نہ ہو جاتے۔ بین چونکہ منیر کی حدش بھی چین نہیں لینے دیتی اس لیے معین صاحب نے ناچار ڈی ٹی کس ایڈیشن کی اشاعت (۲۰۰۰ء) میں صفحہ ۲۲ پر جہاں چھپائی ہوئی نمبر اور Acc. ۸۵ کے ساتھ زیریں جدول بھی چھپائی گئی تھی اب دوبارہ جدول بنا دی ہے۔ دراصل انیس جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ، اتنا ہی بکھرے گا جتنا کہ مشاہدے۔ اگلے صفحات میں صفحہ ۲۲ کی چھپائی ہوئی جدول، روڈو گراف کے ص ۲۱ اور ص ۲۲ اور ڈی ٹی کس ایڈیشن کے ص ۲۲ ان ٹیبلز کے عکس تقارین کی عبرت اندوزی کے لیے شائع کیے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر معین الرحمن کا نسخہ سید عبداللہ یا عرشی راہپوری کے بیان کردہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ تھا تو اس کا Acc. ۸۵ بھی نسخہ لاہور سے الگ ہونا چاہیے تھا۔ نیز صفحہ ۲۲ (فرق ۱۱) سے Acc. ۸۵ کا پہلے چھینا (دزدوانا) کی کٹھ اول چرلخ خانہ را) اور اس کا پہلا ایڈیشن اس پہلے ہوتے ثبوت کے ساتھ شائع کرنا اور اگلے ایڈیشن (ڈی ٹی کس ایڈیشن مستند) سے اس چھپائی ہوئی نمبر کے باقی ماندہ آثار کو بھی مشاکرہ زیریں جدول پھر بنا دینا اس سب میں کیا مصلحت کار فرما ہے؟ یہی کہ دزد اپنے نقش پا بشارت دیا کرتے ہیں یا مشا دینا چاہتے ہیں مگر ایسے نقش مشاکرے سے کب ہستے ہیں؟ دزد و حنا ز دست پر شستن نمی رود۔ کیا سچی کہا تھا میر نے سہ جم گیا غل کف قاتل پہ تبرا میر دس ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوئے دھوئے۔ اور کہی صداقت بیان کی تھی میر سے دوسرے سال پہلے شیکسپیر نے جب اس کی ویڈیو سیکرٹری ایسی کف دست پر مقتول کے لہو کے غیر مرقی دھبے دیکھ کر حالت کرب میں پھٹائی تھی :

"Out damned spot, out, I say!"

معین الرحمن اپنے نسخے کو اپنے کتاب خانے کی سب سے قیمتی متاع قرار دیتے ہیں۔ (دیوان غالب، نسخہ سجاد، اول طبع، نیز برسیل غالب ص ۱۸۶) دوسری طرف

اپنے کتابچے میں فرماتے ہیں :

”میری حیثیت مالک کی نہیں، اس کے امین اور محافظ کی سی ہے۔“ (ص ۳۰)

دیکھا آپ نے، بالآخر معین صاحب کے مُنہ سے سچی بات نکل ہی گئی۔ اگر آپ کی حیثیت مالک کی نہیں، امین اور محافظ کی ہے تو پھر یہ دیوان آپ کے کتاب خانے کی سب سے قیمتی متاع کیسے قرار پایا؟ بات یہ ہے کہ معین صاحب نے غالباً انہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ یہ نسخہ انہوں نے خریدا۔ وہ یہی لکھتے ہیں ”۱۹۸۱ء کے پس و پیش مجھے آگے پیچھے پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے تین ناظر مطبوعہ کتابیں (علم جلیل، علم ہستی، فناء و عذاب، طبع اول، اردو و قسیمی مخطوطے) (سارچ انجمن، دیوان غالب) ملے۔“ (ص ۳۰)

”دیوان غالب نسخہ خواجہ، پہلا ایڈیشن ص ۳۰“ (دیوان غالب مجھے پرانی کتابوں کے کاروباری سے کتابوں کے ڈمیر میں فٹ پاتھ سے ملا۔) (دیوان غالب نسخہ خواجہ، ص ۳۰) ”یہ نسخہ نکلا اور مجھے بھگ پچایا“ (ایضاً، ص ۳۰)۔ ۱۹۸۱ء کے پس و پیش آگے پیچھے لاہور میں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری مرکز، انارکلی کے فٹ پاتھ سے تین ناظر مطبوعہ کتابیں اور دو قسیمی مخطوطے ملے۔ ان میں غالب کے اردو دیوان کا ایک.... مخطوط بھی تھا (دیوان غالب، نسخہ خواجہ ڈی گلس ایڈیشن ص ۳۰) ۱۹۸۱ء کے لگ بھگ مخطوطہ دیوان غالب نسخہ خواجہ میرے ذخیرے میں آیا۔ (برسبیل غالب ص ۱۹) معین صاحب نے ہر جگہ مجھے بلا، ”مجھ تک پہنچا“ ”میرے ذخیرے میں آیا“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ دلیپ بات یہ ہے کہ پہلے (ایڈیشن کا) ”ایک کاروباری“ ڈی گلس ایڈیشن میں ”ایک کاروباری مرکز“ میں مہل ہو گیا۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ پرانی کتابوں کا یہ کاروباری کون ہے؟ نئے ایڈیشن میں معین الرحمن نے ”کاروباری“ کا لٹا ہی نہیں ڈالا۔ اسے نہایت سہولت سے ”کاروباری مرکز“ سے ہل کر ”دست میرے سوال اور اپنے ضمیر کی تلاش شادی“۔

اول قریہ کہ معین الرحمن صاحب کے پاس کون سی نیلمانی ٹوٹی ہے جسے بہن کر

وہ پرانی کتابوں اور مخلوطوں کی تلاش میں سرگرواں رہتے ہیں۔ انارکلی بازار کی خاک چھاننے والے خاکسار ان تحقیق سے آج تک ان کی مدح و تحسین نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ غالب کی زندگی کے دوران کے مرتع منے بقول گیان چند جتن سڑکوں میں بکھرے ہوئے نہیں ملتے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ وہی چیز کی جاتی ہے جو آپ کی ملکیت ہوتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے کسی کی امانت ہڈی بٹھائی خود یا اور اسے کی نذر کر دی جو معین صاحب اگر خود کو دیرپا غالب کا امین اور محافظ قرار دے رہے ہیں تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بقائم جوش و دھس یہ جانتے ہیں کہ یہ نسخہ ان کا نہیں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ملوکہ ہے۔ معین الرحمن نے ۲۹ اگست ۱۹۹۹ء کو پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو دوران غالب کا یہ نقلی نسخہ ہدیہ کرنے کی پیش کش کی تھی: ذرا سی شرما "اور یہ ضمانت" حاصل کر لینے کے بعد کہ بطور سربراہ جامعہ اس کی حفاظت کا مستقل انتظام کیا جائے گا۔ خالد حمید شیخ نے اس پیش کش کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس پیش کش پر ایک سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تا آنکہ معین صاحب نے نئے وائس چانسلر صاحب کو جن کو ازل ازل صحیح ضرورت حال معلوم نہ تھی، یہ نسخہ ۲۱ اگست ۲۰۰۰ء کو بطور ہدیہ *donated* کر دیا اور ایک تقرری کس میں بشکر کے پیش کر دیا۔ اس موقع پر اوڈیشل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اکرم چودھری بھی موجود تھے جن کے نام معین صاحب نے متعدد مراسلات لکھے تھے جن میں موجودہ وائس چانسلر صاحب کو "ہمارا سراہ" اور "ہمارا فخر" کہہ کر اپنے متعلق آمیز اسلوب کو راہ دی تھی۔ معین صاحب نے پہلے سے ایک کیمرو مین کا بھی استہام کر رکھا تھا جس نے اس "تاریخی واقعہ" کو "کیمرو بند" کر لیا۔ یہ تصویریں بعد میں نجاروں اور "برسبل غالب" کی زینت بنیں۔ سوال یہ ہے

۱۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اس نسخے کی ڈرامائی پیش کش پر ڈاکٹر اجمل نیازی نے بڑا لطیف تبصرو کیا: "اس میں اتنی شان و شوکت کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی کسی اعزاز شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ بھین بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ دوپٹے بھی ہوں؟" روزنامہ "دن" ۳۰ اگست ۲۰۰۰ء

کے سابق وائس چانسلر کی مسلسل خاموشی کے بعد معین صاحب نے ایک سال سے زیادہ
 سرے تک اپنی اس قیمتی متاع اور اس "قومی ورثے" کو کسی اور حکومتی ادارے
 مثلاً نیشنل لائبریری اسلام آباد یا مجتہب گھر لائبریری لاہور کو تفویض کچوں نہ کروایا ؟
 اس کا یہ حاسا جواب ہے کہ انھیں خوب معلوم تھا کہ یہ کس ادارے کی "متاعِ برودہ"
 ہے۔ لہذا اُسے اُسی ادارے کو لوٹانا ضروری تھا۔ اس ضمن میں ایک نہایت اہم سوال
 رفیق احمد نقشب نے اٹھایا ہے وہ لکھتے ہیں :

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معین صاحب کو کیا کوئی ایسی ضمانت فراہم
 کر دی گئی ہے کہ آئندہ اس نسخے کی حفاظت کا مستقل انتظام ہوگا۔
 اگر ہاں تو معین صاحب نے اپنا سامانِ ذخیرہ غالبیات و ہاں کیوں نہ
 "محفوظ" کر دیا کہ اس سے استفادے کا دائرہ وسیع ہو جاتا ؟
 اگر نہیں تو اتنا قیمتی نسخہ ایسی جگہ کیوں جمع کرایا جہاں سے قبل ازیں ..
 بقول ستید ضعیف الرحمن دیوانِ غالب کے دیگر خطوطِ غائب ہو
 چکے ہیں۔ ان سوالات پر غور کرتے ہوئے ایک ہی قوتِ دیوانِ غالب
 کا خطوطِ جامعہ پنجاب کو واپس کرنے کے پس پشت کا فرما نظر آتی
 ہے اور اس قوت کو عرفِ عام میں "منیر کی نقل" کہا جاتا ہے ۔
 اجدادِ اسلام اجماع نے اپنے ایک شعری مجرّمے کی ابتداء میں کسی ستم ظریف
 کا قول نقل کیا ہے کہ منیر آپ کو تباہیوں سے روک نہیں سکتا البتہ
 ان کا مزہ منور خواب کر دیتا ہے ۔"

رفتہ رفتہ جب پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ریشا رڈ جنرل ارشد محمود کو صحیح صورت
 حال کا علم ہوا تو ان کا ردِ عمل ایک قومی اخبار روزنامہ پاکستان "میں بایں الفاظ سامنے
 آیا :

لے ملاحظہ ہو نقشب کا مضمون مطبوعہ "سودج" فروری ۱۹۷۲ء، ص ۱۸

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹننٹ جنرل (ر) ارشد محمود نے
 پنجاب کی ادبی تاریخ کے ایک بڑے فراڈ کی تحقیقات کا حکم دیا ہے
 اور کہا ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اُردو کے صدر ڈاکٹر
 شمعین الرحمن نے دیوان غالب کا نسخہ لاہور اپنے نام سے نسخہ خواجہ
 کا نام دے کر (اور) شائع کر کے نہ صرف مجھے دھوکا دیا بلکہ علم و
 ادب کے ساتھ بھی بے وفائی کی وہ پیراڈینٹکل کی درمیانی شب کو
 گورنمنٹ میں ایک مشائخہ کے موقع پر روزنامہ پاکستان سے
 گفتگو کر رہے تھے۔ وائس چانسلر نے کہا ڈاکٹر شمعین الرحمن
 نے مذکورہ نسخہ یہ کہہ کر میرے حوالے کیا تھا کہ یہ ان کا دریافت کردہ
 مخطوطہ ہے جسے وہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے عطیہ کر رہے ہیں۔
 اس خاص موقع کی تصاویر اخبارات میں شائع ہوئیں تو بعض علم دوست
 محققوں اور افراد نے میری توجہ اس جانب مبذول کرانی کہ دیوان کا یہ
 نسخہ تو پہلے ہی جامعہ پنجاب کی ملکیت ہے جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری
 سے چوری ہو گیا تھا۔ میں نے مذکورہ مخطوطے کا بغور جائزہ لیا تو اس
 میں واقعی ٹیپنگ کی گئی تھی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر شمعین الرحمن نے نسخہ
 خواجہ کے نام سے غالب کا نایاب دیوان شائع کر کے یہ دعوئی کیا
 تھا کہ یہ مخطوطہ انھیں برسوں پہلے ایک کباڑیے کی دکان سے ملا تھا
 لیکن بعض محققین کے انکشاف پر وہ پریشان ہو گئے اور انھوں نے
 نسخہ بطور عطیہ جامعہ پنجاب کی لائبریری کے لیے وائس چانسلر کو دے
 دیا۔ یہ امر قابلِ فکر ہے کہ چند سال پہلے بھارت کے معروف غالب
 شناس پرمختی چند کی تالیف ”جاگیر غالب“ بھی ڈاکٹر شمعین الرحمن نے
 اپنے نام سے شائع کر دی تھی۔

اپنے کتابچے کے ص ۲۰ پر "معارف النبوة" (ملاحیون الدین فراری) کے ذکر میں معین الرحمن صاحب نے لکھا ہے کہ اس باب میں ت. ف. (معین صاحب نے اپنے کتابچے میں بگے کم و بیش ہر جگہ ت. ف. لکھا ہے) کی معلومات محدود، ناقص یا نامتتام ہیں۔ ایسی صورت میں کامل اور شافی معلومات کا ہم پہنچانا معین صاحب کا فرض تھا مگر انوس ان سے میری معلومات کا کوئی جواب بن نہ پڑا اور وہ آئیں باقیں شائیں کر کے رہ گئے۔

میں نے اپنی کتاب کے ص ۲۹ پر لکھا تھا:

معین صاحب کی یہ بے خبری نہایت قابل انوس ہے۔ اس بے خبری کا نتیجہ ہے کہ وہ نشر کی منتفی عبارات کو منطوق عبارات سمجھ بیٹھے۔ کیا یہ المیہ نہیں کہ کسی شعری منطوق کی تدوین کرنے وہ شخص جارہا ہے جو نشر اور شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے؟

اس اعتراض کے جواب میں معین صاحب نے اپنے کتابچے میں یہ مضحکہ خیز وضاحت کی:

"اس عبارت میں نیم" کا لفظ کتابت سے رہ گیا ہے لہ

تاریخین! یہ بچارہ کاتب دنیا کی منطوق ترین مخلوق ہے۔ اپنی ہر نام نہاد غلطی کاتب کے سر مزد دی جاتی ہے یہ شعر کیا بر محل ہے۔

ہر درق پر ہے میسر کی اصلاح۔ لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے اب اگر معین صاحب سے پوچھا جائے کہ نیم منطوم "کس چڑیا کا نام ہے تو انہیں کہتے ہی بنے گی "حقاً کا!!" اس ضمن میں گیان چند جین کا نقل کردہ قاضی عبدالودود کا ارشاد بے محل نہ ہوگا۔ گیان چند لکھتے ہیں:

"معین الرحمن نے اپنے جوابی کتابچے میں توجیہ پیش کی ہے کہ وہ نیم منطوم لکھنا چاہتے تھے مگر نیم" چھوٹ گیا (ص ۳۰-۳۱)۔ قاضی عبدالودود

نے ایک اصول قائم کیا ہے: ”کبھی کبھی بات کی خواہ اپنی ہر ایک کسوٹی دوسرے کی غلط اصول نہ کی جائے۔ اپنی غلطی کی خواہ محاذ تحریک کی کرشمات قائم نہ کریں۔“

میں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ تحقیقی و تدوینی معاملات میں معین الرحمن کی شہرت اپنی نہیں اور اس ضمن میں میں نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑنے اور بشری باسط کے مقالے کے بیشتر جتنے اور پر تقویٰ چند کی تالیف ”جاگیر غالب“ کی اپنے نام سے اشاعت کی مثالیں دی تھیں۔ بد قسمتی سے معین صاحب نے ان تین امور کی حتمائیں کی ہیں وہ بھی قاضی جبار اور دود کے بقول ”اپنی غلطیوں کی خواہ خواہ تحریک“ کی ذیل میں آتی ہیں۔ وہ انہیں ناگوار اور بے بنیاد امور قرار دیتے ہیں جہاں سے مستوجب کیے گئے ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر تیار کرنے پر انہوں نے یہ ضلع طبرستان کی ہے کہ چوکھٹہ انہوں نے رشید احمد صدیقی کی آپ بیٹی کو ریزہ ریزہ تفکیک دیا تھا اس لیے اس کی مناسبت سے انہوں نے رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی جس پر انہیں قریب اور دود کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داؤلی (منزل) یہی بات انہوں نے ”بریل غالب“ میں لکھی ہے (ص ۶۱) پہلی بات تو یہ ہے کہ رشید صاحب کی آپ بیٹی کو ریزہ ریزہ تفکیک دینے کے ساتھ یہ کہاں لازم آتا ہے کہ ان کی تصویر پر اپنی تصویر جوڑ کر محل سازی کی جائے۔ قارئین! آپ کو یاد ہو گا کہ معین صاحب سے برسوں پہلے شاعر احمد فائدتی نے غالب کی تحریروں سے اسی طرح غالب کی آپ بیٹی کو ریزہ ریزہ تفکیک دی تھی تو کیا وہ بھی غالب کے ساتھ اپنی تصویر تیار کرتے؟ دوسری بات یہ کہ جبازرہ عقیدت و محبت اور آپ بیٹی کی رعایت کے پیش نظر آپ نے یہ تصویر بنائی یا بنوائی تو کیا آپ بیٹی کے ویسا ہے میں آپ نے اس کی وضاحت کی یا بعد ازاں جب

۱۔ ”دیوان غالب“ نسخہ خواجہ یونس لاہور، ”مشمولہ ہمارے زبان“ ۱۵، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴

یہی تصور آپ نے بد یاد اردو خیال کے پس و پیش پر شائع فرمائی تو کیا کتاب کے دیباچے میں اس کی توضیح کی؟ آپ نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا۔ ہاں بین ویدار سے اعتراضات ہونے کے بعد آپ نے اس کی بے سفر تاویل آرائی شریع کی۔ اس "صناعی و طباعی" اور "الحی" (یعین صاحب کے اپنے الفاظ ہیں) پر جن خوش ذوق بزرگوں اور دوستوں سے آپ نے داو پائی، ان کے نام اور ان کے ارشادات ضبط تحریر میں لانا آپ کو کیوں یاد نہ رہا جبکہ آپ اپنی تعریف و توصیف میں لکھا گیا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف محفوظ فرما لیتے ہیں اور تسلسل اور تواتر کے ساتھ انھیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ ڈھٹائی اور ذہنی دیوالیہ پن کی علامت ہے کہ اپنے جمل و جزم کو صواب بنا کر پیش کیا جاتے۔

میں نے لکھا تھا کہ معین صاحب نے اپنی شاگردِ بشریٰ باسط کے ایم اے اردو کے مقالے "اداء جعفری شخصیت اور شاعری" کا پیشتر حصہ "نقوش" کے شمارہ ۱۲۹ میں اپنے نام سے شائع کیا تھا اس پر موصوف نے ایک طویل بے تکلی و استالی تصنیف فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مقالہ خود انھوں نے بشریٰ باسط کو لکھ کر دیا تھا تاکہ اسے ایم اے کی ڈگری مل جائے۔ اگر یہ بات درست ہے تو یہ اتنا ہی بڑا مجرم ہے جتنا کسی اور کا امتحانی پرچہ چل کرنا۔ بونہور کشتی حکام کا فرض ہے کہ وہ اس کھلے اور واضح اعتراض مجرم کے بعد اس کے شریک کے خلاف قانونی و نادینی کارروائی کریں۔

رفیق احمد نقوش نے اس سلسلے پر انہما خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اپنی شاگرد کی تحریروں کو سرزد کرنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے معین صاحب نے ایک مجرم کا اعتراض کیا ہے کہ دراصل مذکورہ طالب کے مقالے کے لیے یہ تحریریں انھوں نے خود لکھ کر دی تھیں تاکہ طالبہ جلد اد جلد امریکہ جا کر اپنی بیمار والدہ سے مل سکے۔ . . . واضح رہے کہ ایم اے کی ڈگری کے لیے مقالہ ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے اور ملکی قوانین کے تحت امتحانات میں امیدوار کی اعانت قابل دست اندازی ہو سکتی ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں "اگر کسی نے کسی طور پر ان کا تھیسس

مکمل نہ ہو پاتا تو وہ ایم اے کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آ پاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے دانش میں والدہ سے دوہرا تین برس کی طویل مدت گزارنے کے بعد صرف بی اے کی بی اے رہ جاتیں۔“

”گویا اگر کوئی طالب علم کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو انسانی ہمدردی کے تحت اس کی جگہ امتحان دیا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ افسوس کہ ہمارے ملکی قوانین انسانی ہمدردی کے اس عظیم نفل کو نظر امتحان سے نہیں دیکھتے۔“

رہا ”جاگیر غالب“ (پرتوی چند) کو اپنے نام سے شائع کرنے کا مسئلہ تو یہاں بھی، ان کا طرز استدلال اتنا بوجہ ہے کہ ہمیں بتا ہے۔ دو دسروں کے اقتباسات سے کتابچے کا فہم تنگ بھرنے کے بجائے معین صاحب کو اس بات کا جواب دینا چاہیے تھا کہ اگر آپ صرف ترتیب نو کے فہم دار ہیں تو صفحہ اول پر بطور توثیق پرتوی چند کا نام کیوں دسج نہ کیا گیا آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ نو کا کہ بھری بی فاختہ اور گورا میوہ کھاتے۔ رہا یہ سوال کہ ”جاگیر غالب“ کی اس ترتیب نو کا معیار کیا ہے تو اس ضمن میں ڈاکٹر گوہر شاہی کا موقف یہ ہے کہ معین صاحب کی مرتبہ ”جاگیر غالب“ ترتیب کا کوئی ایسا نمونہ نہیں کہ اسے پرتوی چند کی تالیف پر اضافہ قرار دیا جاسکے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جاگیر غالب کا پاکستانی ایڈیشن مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن اسی سنے (پرتوی چند) کی صدارتے بازگشت ہے۔ اور اس میں کوئی تحقیقی یا علمی اضافہ نظر نہیں آتا حتیٰ کہ پرتوی چند کے ہاں جو فروگزاشتیں اور غلطیوں گھٹی ہیں، ڈاکٹر صاحب کے مرتبہ ایڈیشن میں بیحد محدود ہیں۔ مثال کے طور پر ”جاگیر غالب“ میں جو دستاویز

کمرِ شائع ہو گئی تھی، ڈاکٹر معین الرحمن نے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور اس کے بارے میں تبصروں نہیں کیا۔ پروف خزانہ کی اخلاط اور فروگزاشتیں..... اس اشاعت میں بھی جوں کی توں موجود ہیں۔^۱

یہ ترتیب نو اس اعتبار سے مستحکم چیز ہے کہ اصل مرقع کی ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے۔ یہاں انگریزی عبارتیں پر بخوبی چندر کی ترتیب کے برعکس دیتیں سے باتیں کر چلتی ہیں۔ پھر یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے جس کے مختلف محفل پر دو الگ الگ انتساب ہیں۔ ص ۹ پر انتساب عمیل الدین عالی کے نام ہے اور ص ۵ پر آنجنائی پر بخوبی چندر کے بیٹے دیو پرکاش کے نام۔ معین الرحمن صاحب نے باپ بیٹے دو محفل کو ایک اکٹھے سے دیکھا ہے، ایک سے کتاب چھپتی، دوسرے سے انتساب، غاعتبر و یا اولی الالباب۔

کچھ ذکر ”برسبیل غالب“ کا

کتاب پر سال اشاعت ستمبر ۲۰۰۰ء درج ہے لیکن یہ تب سے اب تک مارکیٹ میں دستیاب نہیں۔ کتاب پر مرتب کے طور پر معین الرحمن کے صاحبزادے وقار معین کا نام درج ہے جنہوں نے مسرت اور لکھنؤ کے سائنس دانہ فرمایا ہے کہ اس کتاب کا اولیں حصہ سورج کے غالب نمبر میں شائع ہونے والی طبعات انجان خاں کی تحریروں کا جواب ہے جو انہیں اپنے والد کے کتب خانے میں علی الحساب منتشر کاغذات کے انبار میں تھے۔ دستیاب ہوا اور جو معین الرحمن صاحب نے ۱۹۹۷ء میں لکھا تھا۔ یہ کیا حسن اتفاق

۱۔ ”غالب کی خانہ دانی پیش اور دیگر امور“، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۱۷۱۔ جاگیر غالب، ”مرقہ معین الرحمن پر تفصیلی ماکہ کے لیے ملاحظہ کیجیے طبعات انجان خاں کی تحریریں مشمولہ ”سورج“ غالب نمبر ۱۹۹۶ء

ہے کہ معین صاحب کو ناراضی کے فٹ پاتھ پر کتابوں کے انبار سے ”دیوانی غالب“ کا محفوظ ملے اور جیسے کو مستشرق کاغذات کے انبار سے ”برسبیل غالب“ کے لیے مواد دستیاب ہوا۔ وقار معین نے دستیابی کی تاریخ نہیں بتائی البتہ صرف چند کے آخر میں ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء کی تاریخ درج کی ہے لیکن ہے اس تاریخ سے کوئی تین ماہ پہلے یہ مواد انھیں دستیاب ہو گیا ہو اسی لیے معین الرحمن صاحب نے اس مواد میں سے کچھ اقتباسات چن کر انھیں میری کتاب کے جواب میں لکھے جانے والے کتابچے میں بھی من و من سجا دیا اور یہ کتابچہ سنی سنہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہو گیا۔ خوشی ہوئی کہ معین الرحمن قدسوں کے اقتباسات ہی سے اپنے مضامین کا پیٹ نہیں بھرتے، اپنے اقتباسات سے بھی اپنے مضامین کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔

”برسبیل غالب“ کے ابتدائی اوراق میں معین صاحب نے ”جاگیر غالب“ کے قلمی پر غار فرمائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :

”کتاب کے سرورق پر بھی اُن (پرتوی چند) کا نام ہوتا یا آجاتا تو بہت مناسب ہوتا۔“ (ص ۲۳)

سوال یہ ہے کہ حضرت! کتاب کی ترتیب تو آپ فرما رہے تھے یا آپ کا کوئی حواری؟ اگر یہ کار خیر آپ ہی کے ہاتھوں انجام پا رہا تھا تو سرورق پر آنجہانی پرتوی چند کا نام درج کرنے میں کیا چیز مانع تھی؟ یہ فتورِ نیت نہیں تو کیا حسنِ نیت ہے؟ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ”آردو کے مضمون“، ”ہینچ آہنگ“ اور ”دستنبو“ کی بعض اشاعتوں کے سرورق پر ”غالب“ کا نام بھی تو شائع نہیں ہوا۔ اس طرزِ استدلال پر اتم کرنے کو بھی چاہتا ہے۔ موصوف ذکرِ ترتیب کا کر رہے ہیں اور مثالیں تصنیف کی درج کرتے ہیں ”آردو کے مضمون“ کے بارے میں ایک دنیا جانتی ہے کہ اس کا مصنف غالب تھا اور یہ سنہ ۱۹۰۹ء سے لے کر اب تک متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ یہی معاملہ ”ہینچ آہنگ“ اور ”دستنبو“ کا ہے کہ غالب کے اولیٰ طالب علم بھی ان کے نام سے واقف ہیں جبکہ ”جاگیر غالب“ بقول آپ کے چپکے بھی چھپی رہی اور شائع نہ ہو سکی۔ اول تو یہ بات

ہی درست نہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ چھپ کر بھی شائع نہ ہو سکی تو ایسی صورت میں تو اس کے سرورق پر بدرجہ اولیٰ مرتب یعنی پر تقویٰ چندہ کا نام شائع ہونا چاہیے تھا۔ اعتراض کا محل یہ نہیں کہ اردو سے متعلق، پہنچ آجنگ اور دستنبو کے سرورقوں پر بالترتیب مرقعہ حصین فاضل، محمد عمر مہاجر اور خواجہ احمد فاروقی کے نام بطور مرتب یا مترجم درج ہیں۔ اعتراض تب ہو سکتا تھا کہ کوئی معین الرحمن اردو سے متعلق سے مرقعہ حصین فاضل کا نام بطور مرتب کھینچ ڈالے اور اس کی جگہ اپنا نام درج کر دے یا محمد عمر مہاجر یا خواجہ احمد فاروقی کے نام حذف کر کے اپنا اسم و ماں درج کر دے اور اپنے کسی آئندہ کے وصاحفی کتابچے میں ارشاد فرما دے کہ اگر بطور مرتب یا مترجم نلال فلال حضرات کے نام بھی سرورق پر ہوتے یا آجاتے تو بہت مناسب ہوتا۔ بریں عقل و دانش بباہر گریست!

کتاب کے ص ۱۰۳ پر معین صاحب نے پھر اسی تاویل بار اور عذر رنگ کی تکرار کی ہے جو اس سے پہلے وہ بشریٰ باسط کے مقالے کے باب میں اپنے کتابچے (۲۰۰۰) ص ۱۰۳ (مؤدت حال) میں پیش کر چکے ہیں۔ میں اس ضمن میں اقبال کا ایک الہامی مصرع، جو گنتا ہے خاص اسی طرح کی صورت حال پر چسپاں ہونے کے لیے لکھا گیا تھا، معین صاحب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ۵۔ ہر نقش اگر باطل ہو کر سے کیا حاصل؟

کیا ستم ہے کہ اسی کتاب میں لطیف الزماں خاں کی اس بات کی تردید کرنے کے لیے کرشید صاحب طلباء کو دعوتی نبر بہت دیتے تھے، رشید صاحب کا قول بحوالہ "غداں" درج کرتے ہیں جس کا کلیدی جملہ یہ ہے کہ "یہ ناممکن ہے کہ امتحان کے معاملے میں درجاعت یا بے ایمانی کو دخل دوں" اور اپنے انہی سپر موشنڈ رشید احمد صدیقی (جنہیں یہ اپنی کائنات کہتے تھے) کے اسی قول کی دھجیاں بکھیرتے ٹھوٹے یہ مرید باصفا "امتحان کے معاملے میں بے ایمانی" کا نہ صرف ایک نیار بکار ڈھاقم کرتے ہوئے اپنی شاگرد کو دو سو نمبر کے مقالے کا بیشتر حصہ لکھ کر اسے ایم اے اردو کی ڈگری دلاتے ہیں بلکہ اپنے اس فعل ناموسہ کی افویہ ناک تاویلیں بھی کرتے ہیں!! پھر مزید یہ ستم یہ کرتے ہیں کہ اپنی وی ہونی خیرات کو کچھ

عرصے بعد اپنے نام سے "نفوذ" میں شائع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مشرف احمدان کے اس فعل پر کس قدر تاسف بھرے لہجے میں لکھتے ہیں:

"اگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کی یہ خیرات دے ہی دی تھی تو اس کے اظہار اور اسے واپس اپنی جیب میں ڈالنے کا کیا جواز ہے؟ اس طرح تو انھوں نے اپنی طالبہ کے بر حیثیت محقق مستقبل کو تاریک و محسوس بنا دیا ہے۔"

"برسبیل غالب" کے صفحہ ۱۶ پر انھوں نے کم و بیش اعتراف کر لیا ہے کہ ان کا مرتبہ نسخہ خواجہ اور عرشی کا نامزد کردہ "نسخہ لاہور" ایک ہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیں نسخہ خواجہ کے نسخہ لاہور ہونے کے ضمن میں بڑے قوی دلائل اپنی کتاب کے پچھلے ایڈیشن میں پیش کر چکا ہوں مگر حال ہی میں رامپور سے محفوظ روڈ گراف کے صفحہ ۲۱۲ (فولیم ۱۱) کی طے والی فوٹو اسٹیٹ کے بعد اور ڈاکٹر گیان چند جی کے "ہماری زبان" دہلی کی دو اشاعتوں (۸ دسمبر اور ۱۵ مارچ ۱۹۶۰ء) میں شائع خطہ مضمون: "دورانِ غالب" نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور کے بعد تو اب اس باب میں شک و شبہ کی ذرہ برابر گنجائش نہیں رہتی۔ ذیل میں گیان چند جی کے مقالے سے متعلقہ حجت درج کیا جا رہا ہے۔ قارئین سے اس طویل اقتباس کے لیے معذرت:

"ایک ہی کاتب ایک نسخے کی دو نقیص تیار کرے تو بھی یہ ممکن نہیں کہ دونوں نقیص کی ہر سطر کا پہلا اور آخری لفظ یکساں آئے۔ یہ تو فوٹو کس ہی میں ممکن ہے۔ تینوں میتھ نسخوں کے فوٹو پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ایک ہی نسخے کا کس ہیں۔ ان کے تفاوت دینے میں ڈاکٹر عبد اللہ، عرشی صاحب اور قاضی صاحب تینوں نے بے احتیالی کا ثبوت دیا ہے۔ یسین کے مہینہ اختلافات کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے رضا لاہوری رامپور کے ڈاکٹر کچھر کو لکھ کر درخواست کی کہ وہ روڈ گراف میں دیکھ کر صیح

صورت حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو راہپور کے ڈاکٹر نظیر علی صدیقی کو بلا کر یہ کام ان کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر نظیر کا جواب آ گیا ہے، معین الرحمن نے اپنے کتابچے میں لکھا ہے :

”نسخہ لاہور میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعے کی صورت یہ ہے :
 ”جوہر آئینہ بھی چاہے ہے شرگاں ہوگا“ جبکہ صحیح روایت ”ہونا“ ہے ”ہوگا“ نہیں۔
 راہپور میں موجود عکسی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چوک ہوئی ہے اگر عکس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تائید نہ کرے تو گویا پھر نسخہ خواجہ کے عین میں نسخہ لاہور مہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا۔“ ص ۳۴

”روٹو گراف دیکھ کر ڈاکٹر نظیر نے میرے استفسارات کا جو جواب دیا ہے میں اس میں نسخہ خواجہ کا صفحہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں :

(۱) نسخہ خواجہ کے ص ۱۱ کی غزل کے تیسرے شعر میں ”شرگاں“ کے بعد روایت ”ہونا“ ہی ہے۔ ”ہوگا“ نہیں۔ (معلوم نہیں عرشی صاحب نے اس روٹو گراف میں ”ہوگا“ کہاں سے پڑھ لیا)۔

(۲) نسخہ خواجہ کے ص ۲۲ کی تلی میں روٹو گراف میں نمبر ہے جس پر Accession No. 6812 تحریر ہے۔

(۳) نسخہ خواجہ میں صفحہ ۳۳ کی غزل ۵۰ لازم تھا کہ دیکھو سراستہ کوئی دن اور۔
 موجود ہے۔

(۴) فوق ۱۳ پر (نسخہ خواجہ ص ۵۰) تین شعروں کی یہ غزل موجود ہے : ”دو فوں جہان بگمرا کیا کریں۔“

(۵) روٹو گراف میں نسخہ خواجہ ص ۱۲۳ کی طرح تقریظ کے اوپر علی قلم سے ”خاتمہ“ لکھا ہے۔ تقریظ کی پہلی سطر میں ”بغیر فزوغ گسٹری“ ہے۔ دوسری سطر کے آخر اور تیسری سطر کے شروع میں ”خوام خاتمہ دل رُبا“ ہے۔ (تاسنی صاحب

نے پہلی سطر میں ”فروغ گشتی“ اور دوسری میں ”خرام دل رہا“ خط نقل کر کے سبیلِ رحمتی کو دونوں کو مختلف کھنٹے کا موقع دیا۔

(۶) سننے کے اختتام پر پھر میں تحریر ہے ”ذاب یونیورسٹی لائبریری، عربک سیکشن 6812“ جسے ڈاکٹر ظہیر نے ”ذاب“ پڑھا وہ ”پنجاب“ ہونا چاہیے معلوم نہیں۔ یہ نسخہ عربک سیکشن میں کچھ دن داخل کیا گیا۔^{۱۷}

کیا گیا ان چند عین کے ان مشاہدات و دلائل کے بعد معین صاحب میں اتنی اخلاقی تجربات ہے کہ وہ نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کو ایک ہی شخص ماننے کا اقرار کر لیں؟ معین الرحمن صاحب کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے کتابچے میں بعض باتوں کی تصدیق ہو جانے کی شرط پر نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کے عین میں ایک ہونے کو تسلیم کرنے پر تیار نظر آتے ہیں مگر دوسری طرف وہ اپنے کتابچے کے شائع ہونے کے تین ماہ بعد اپنی کتاب ”سبیلِ غالب“ میں اپنے پاؤں پر پھرتے اور اُلٹی زندقہ لگاتے نظر آتے ہیں:-

”قاضی صاحب کے فراسم کردہ مواد اور اطلاعات پر مبنی مولانا امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے اس نسخے کا تین صفحات میں تصدیق کرایا (نسخہ عرشی دیباچہ ۱۹۵۸ء) عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کا مخطوط خود نہیں دیکھا۔ ان کے بیانات یا مشاہدات شماری ماخذ پر مبنی ہیں۔ انھوں نے اسے ضناً نسخہ لاہور“ کہا۔ اس

نے ”دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور“ مشمولہ ہماری زبان، نئی دہلی شمارہ ۸ تا ۱۳، دسمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۔ ڈاکٹر عین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں تب سے اب تک اردو، فارسی اور عربی مخطوطات کا ایک ہی عہدہ ہے۔ تب مخطوطات پر قمر عربک سیکشن ہی کی گنتی تھی۔

۱۷ دیکھیے ... ”معین صورت حال“ ص ۴۰۔

میں اور نسخہ خواجہ میں بھی فرق نمایاں ہے۔ اگرچہ مائلتیں بھی ہیں :

آپ نے دیکھا معین صاحب نے کس سہولت کے ساتھ غالبیات کے متنازعیں مخلصی
عرشی راپوری کی تحفیت کر دی۔ ان کے بیانات اور مشاہدات کوٹوالی مانڈ پر مبنی قرار
دیا۔ ان کے خیال میں ”نسخہ لاہور“ بھی ضمناً تھا گیا۔ یہ درست کہ عرشی صاحب نے دیوان
غالب کا مخطوطہ خود نہیں دیکھا لیکن کیا اس کا روٹو گراف بھی ان کی نظر سے نہیں گزرا
اور کیا نسخہ لاہور پر تین صفحہ کا نوٹ بھی روٹو گراف دیکھے بغیر لکھا گیا۔ یہ وہی روٹو گراف
ہے جو قاضی عبدالودود نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود زیر بحث دیوان
غالب سے ۱۹۵۵ء میں ہڈایا تھا۔ اور جسے بعد ازاں اصول نے عرشی راپوری کو
تقریباً کر دیا تھا۔ یہی روٹو گراف اب راپوری کی وضحا لائبریری میں محفوظ ہے جس کے
انچارج بھی مولانا امتیاز علی عرشی راپوری تھے۔ مجب سگیں ولی اللہ اکبر !

دلچسپ بات یہ ہے کہ جسے اب معین الرحمن ”ضمناً“ ”نسخہ لاہور“ کہہ کر اس
کی تحفیت کر رہے ہیں اور اسے ”نسخہ خواجہ“ قرار دے رہے ہیں۔ ایک زمانے میں
اپنی کتاب اشاریہ غالب (۱۹۶۹ء) وہ خدا سے ”نسخہ لاہور“ کہہ چکے ہیں اور مائلتیں
اس کے باب میں مزید معلومات کے حصول کے لیے قاری کو ڈاکٹر سید عبدالرشک کے ہی ضمون
کی طرف راجع فرما رہے ہیں جو جلائی ۱۹۵۴ء میں ماہ نوکراچی ”میں شائع ہوا تھا
جس کے حوالے سے میں نے اپنی زیر نظر کتاب کا آغاز کیا ہے۔ رفیق احمد نقشب
ہیں :

”واضح رہے کہ ”نسخہ لاہور“ امتیاز علی عرشی نے ۱۹۵۵ء میں قرار دیا تھا
اور ۱۹۶۹ء میں جب سید معین الرحمن نے اشاریہ غالب ”شائع کیا تو
عرشی صاحب (جو سقا قاضی عبدالودود) اور سید عبدالرشک کے متنازعوں
مشوں کو ایک ہی نسخہ مانا ہے۔ اشاریہ غالب میں دیوان غالب اردو کے

اہم خطی اور مطبوعہ نسخوں کا تاریخی دارا جمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے فیضانِ
پر نسخہ لاہور ۱۳۶۸ھ/۱۸۵۲ء کو رکھا ہے۔۔۔ نسخہ لاہور کو
”نسخہ خواجہ“ بننے تک کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ ایک عبرت ناک
دستاویز ہے۔“

”نسخہ خواجہ“ کے ”نسخہ لاہور“ ہونے کی ایک نہایت سکت دلیل متاخر غالب شناس
مروج سید قدرت نقوی نے اپنے کتابچے میں یہ دی ہے :

”اگر غالب نے معین الرحمن کے احساس کے مطابق کئی نسخے لکھوائے
تھے تو وہ کسے کسے نذریکے۔ مطبوعہ مد تک تو صرف ایک نسخہ لکھوانے کا
ذکر خطوط میں ہے اور وہ صرف ہمارا جد ہے پور کی نذر کرنے کی خاطر
نہایت اہتمام سے منقش و مزین مع محمد مجذبان پیش کرنے کا تذکرہ خطوط
میں پایا جاتا ہے اور اس کی تیاری میں ستر لاکھ روپے صرف کی گئی۔ یہ کئی
(نمون) والی بات صرف اپنے مقبوضہ و دودھ نسخہ کی اہمیت جتانے
کی خاطر ہے ورنہ معین الرحمن کئی ہونے کا ثبوت داخل و خارجی ذرائع
سے پیش کریں۔ صرف احساس و قیاس سے کام نہیں چلے گا۔ خارجی
ذرائع یعنی غالب کے فارسی و اردو خطوط صرف ایک نسخہ کے لکھوانے
کی شہادت دیتا کہ جس میں اور وہ ہمارا جد ہے پور کو نذر کیا جانے والا
نسخہ ہے۔ داخلی شہادت نسخہ کی لوح میں کسی متبرک لفظ یا جملے کا نہ لکھا
جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے کسی متبرک لفظ یا جملے کا لکھنا
اس لیے مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ یہ نسخہ ایک غیر مسلم کو بطور نذرانہ
پیش کر رہے تھے۔۔۔ سید عبداللہ نے اس کا تعارف مضمون لکھ
کر گرایا۔ تاحضی عبدالودود نے اس نسخہ کے عکس ۱۹۵۷ء میں لاہور
میں حاصل کیے۔ یہ عکس یقیناً سید عبداللہ کی نثر نہ ہی اور تعارف کے

حاصل کیے گئے ہوں گے۔ بھارت پہنچ کر یہ عکس مولانا امتیاز علی خاں
عرشی کو بھیج دیے۔ انھوں نے نسخہ لاہور کے نام سے اس کا تعارف
اپنے مدونہ دیوان غالب (نسخہ عرشی) کے مقدمہ میں کر دیا۔ قاضی
عبدالودود نے ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون لکھا۔ مولانا عرشی نے بھی
اسی سن (۱۹۵۸ء) میں مقدمہ دیوان میں تعارف لکھا اور قاضی عبدالودود
کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے نسخہ شیرانی اور اس نسخہ کے عکس دیے۔
اس طرح اس نسخہ لاہور کے تین گواہوں کی گواہیاں موجود ہیں۔ لوح
اور ص ۲ الف کا عکس سید عبداللہ نے شائع کرایا تھا۔ اس کو جب
مرحومہ نسخہ خواجہ کے عکس سے طایا تو بالکل مطابق پایا۔ سرسبز تفاوت
نظر نہیں آیا۔ عین میں دونوں ایک ہیں۔

ربا دیوان غالب کے نسخہ لاہور (نسخہ پنجاب یونیورسٹی) کو "نسخہ خواجہ" کہنے پر
مسیحی الرحمن کا اصرار تو بڑے عظیم کے چوٹی کے محققین نے اس پر ناپسندیدگی یا اختلافات کا
اظہار کیا ہے۔ سید قدرت نقوی کا کہنا ہے:

، خواجہ منظور حسین نے اس کے مالک تھے کہ بوجہ ملکیت اس کے نام سے
منسوب ہوں جیسے حافظ محمود شیرانی کی ملکیت ہونے کی وجہ سے
نسخہ شیرانی مشہور ہے اور نہ یہ مرحوم کا مدونہ ہے جیسے مولانا امتیاز
علی خاں عرشی کا مدونہ دیوان غالب نسخہ عرشی کہلاتا ہے۔ حقیقت
کا اظہار بذریعہ انتساب کیا جاتا ہے۔ مرحوم کے نام سے موسوم
کرنا تو مرحوم کی مدح بالذم ہے۔ وہ ان کے نام مضمون کر سکتے تھے
جس کا اظہار انھوں نے "سیرۃ کرم فرما" کے زیر عنوان منسوب کرنے
کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا مسیحی الرحمن "منسوب"

اور ”موسوم“ کے فرق کو نہیں جانتے؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جاتے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جاتے۔
 جناب رشید حسن خاں نے اپنی تازہ ترین کتاب ”اطلائے غالب“ (سال ۱۳۰۰ء) میں معین الرحمن کے مرتبہ نسخہ کو نسخہ خواجہ کے بہائے نسخہ لاہور ہی کا نام دیا ہے اور لکھا ہے کہ اسے ”نسخہ خواجہ“ کہنے کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا۔
 رشید حسن خاں کے متذکرہ قول کو بنیاد بنا کر ڈاکٹر گیان چند مین نے بڑے پختے کی بات کہی ہے :

”میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سنت قابل اعتراض ہے۔ اس نسخے کا خواجہ منظور حسین سے کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہر غالبیات نہیں تھے۔ معین صاحب کی ان سے حقیقت سرگھول پر نہیں وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام پر بھول کر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خاں کا نام ”خواجہ منظور حسین منزل“ رکھ دیں تو اس سے ان کا مکان تلاش کرنے والوں کو غلطی میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہو گا۔“
 آگے مل کر انھوں نے معین الرحمن کے بار بار نسخہ خواجہ لکھنے پر زنج ہو کر اور برہی کا انہما کرتے ہوئے اس کے محکم پہلو کی نشاندہی کی ہے :

”وہ جو بار بار غلطی سے نسخہ خواجہ لکھتے ہیں اس سے بچے دو چکا نکلا ہے (ص ۱۵، ۲۰، ۳۱، ۳۲ وغیرہ) خلا لکھتے ہیں نسخہ خواجہ میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترمیم یا تیشخ ہوتی ہے (ص ۲۰)۔ غالب نے خوابیں

۱۔ دیوان غالب، نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروق، ص ۳۷۔

۲۔ اطالعے غالب (غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی)، ص ۲۹

۳۔ دیوان غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور، ہماری زبان نئی دہلی، شمارہ ۵۱۷

بھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ جس نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں وہ نسخہ غالب نہیں نسخہ خواجہ ہے۔ کون سا خواجہ۔ خواجہ نظام الدین اولیا۔ یا خواجہ میر درد؟

یہاں ایک امر کی طرف توجہ دلانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ معین الرحمن صاحب نے اپنی تالیف ”غالب کا علمی سرایہ“ میں غالب کی تصنیف ”گل رعنا“ کے ذکر میں خواجہ محمد حسن کے ملوکہ قلمی نسخہ ”گل رعنا کو“ نسخہ خواجہ“ قرار دیا ہے (ص ۱۴، ۱۵) اور بجا طور پر کہ یہ خواجہ محمد حسن کا ملوکہ تھا۔ ظاہر بات ہے کہ دیوان غالب کا نسخہ لاہور ملوکہ خواجہ منظور حسین نہ تھا۔ (نہ ملوکہ معین الرحمن کیونکہ معین الرحمن تو بقول خود اس کے ایسے اور محافظ تھے۔۔۔۔ دیکھیے۔۔۔۔ صحت مندرجہ حال، ص ۳۰) ایسی صورت میں اسے نسخہ خواجہ کہنا اور اس پر اصرار کرنا بے معنی ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ اس قلمی دیوان کا حال اب سے تقریباً تیس برس پہلے وہ خود ”نسخہ لاہور“ کے نام سے اپنی کتاب ”اشاریہ غالب“ میں درج کر چکے ہیں!

اپنے کتابچے ”اوز برسیل غالب“ میں ایک جگہ معین صاحب نے ”دیوان غالب نسخہ خواجہ“ اہل حقائق“ کو خبیث اور بغض سے بھرا کتابچہ قرار دیا ہے (ص ۱۹۵) اور کچھ آگے چل کر لکھا ہے کہ میں (تحمین فراقی) حسد اور حسرت کا مارا ہوں۔ قبل ان میں اپنے کتابچے۔۔۔۔ صحت مندرجہ حال“ میں سیری بعض علی تھا دین کے ضمن میں فرمایا:

”موصوف نے ان تراجم کے سلسلے میں متعدد اسلامی تجویزیں

اور بے طلب بہت سے مشورے بھی ارزانی فرماتے ہیں۔ (ص ۱۹)

سوال یہ ہے کہ اگر میرا کتابچہ آپ کے بقول خبیث اور بغض سے بھرا ہے، میں حاسد ہوں اور فارسی سے اردو میں ”تفہیل ویلے گئے“ آپ کے تراجم کے آپ

لے ”دیوان غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور“ ہماری زبان انتہی دلی شمارہ ۱۱ کا رد ہے۔

میں میرے بے طلب مشورے آپ کے لیے لائق توجہ نہ تھے تو پھر دیوان غالب کے ڈی ٹکس ایڈیشن (۱۹۰۰ء) میں آپ نے بحث اور بغض سے بھرے اسی کتابچے کو پیش نظر رکھ کر اپنی کم و بیش ساری چھوٹی بڑی تحقیقی اور سائنسی غلطیوں کی اصلاح کس غرضی میں کی ہے؟ اس سوال کا جواب اور ہمت سے سوالوں کی طرح معین الرحمن پر قرض ہے۔ وہ تو معلوم نہیں اس قرض یا فرض سے کب حد براہوں گے۔ آئیے ان کے تازہ ترین کارنامے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ (ڈی ٹکس ایڈیشن ۲۰۰۰ء) کا اجمالی ذکر اور میرے علمی اعتراضات کی روشنی میں ان کی جانب سے کی گئی اصلاحات کی تفصیل گوشواروں کی ضرورت میں بیان کرتے ہیں۔

دیوان غالب نسخہ خواجہ ڈی ٹکس ایڈیشن ۲۰۰۰ء

”برسبیل غالب“ کی طرح دیوان غالب کا ڈی ٹکس ایڈیشن جس پر اشاعت کا مئی اگست اور سال مستندہ درج ہے اور جس کی قیمت ۱۳۹۰/- روپے رکھی گئی ہے، مارکیٹ میں ہمیں دستیاب نہیں۔ میں نے اپنے ایک کرم فرما سے مستعار لے کر اس کے مشمولات پر نظر ڈالی ہے۔ ”برسبیل غالب“ کی طرح دیوان غالب کا ڈی ٹکس ایڈیشن بھی معین الرحمن صاحب نے صرف اپنے احباب کی نذر کیا ہے، اسے تامل پاکستان میں فروخت کے لیے مارکیٹ نہیں کیا۔ ”برسبیل غالب“ کا بیشتر حصہ طبع انہماں خاں کے اعتراضات اور قلیل حصہ میرے بعض اعتراضات کا جواب ہے، اس کے بعد اپنی شان میں بعض حیرت و حیرت دہک معروضات لکھنے والوں یا بعض کام نگاروں کی قصیدہ نما تحریریں درج کی ہیں۔ چوں کہ ان تحریروں کے ذریعے خود کو بعض سنگین الزامات سے بری کرنے اور اپنے بھی خواہوں کی نظر میں اپنے تشویش ناک حد سے جگرتے ہوئے امیج کو بحال کرنا مقصود تھا اس لیے یہ کتاب صرف اپنے بھی خواہوں تک پہنچانی تھی اور مارکیٹ نہیں گئی۔ یوں لگتا ہے جیسے بھڑھار میں ڈوبتا ہوا شخص بات پاؤں مارتے ہوئے اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا ہے۔ یہ استدلال نہیں دیکھتا کہ دیوان کھڑی کی

ہے جو اپنے سائے کے سامنے چشم زدن میں سجدہ کرتی نظر آتی ہے۔

دیوان غالب کے ڈی گلس ایڈیشن کو پاکستان میں فروخت کے لیے اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ رجسٹرڈ پنجاب یونیورسٹی نے معین الرحمن کو بذریعہ خط اس کے پہلے ایڈیشن کے بعد کسی مزید ایڈیشن کی اشاعت روکنا تھا۔ چنانچہ قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے معین الرحمن صاحب نے درمیانی راویہ نکالی کہ اسے چھاپ کر ٹچا دیا صرف اپنے خاص خاص احباب کو اس کی گودنمائی سے فیض یاب کیا ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ معین الرحمن کو اشتہار اور دستار و دو فوکانی خوب آتا ہے۔

معین الرحمن نے اپنے کتابچے میں ”دیوان غالب نسخہ خواجہ“ میں میر کے نشان وادہ تحقیقی متن اور ترجمے کی غلطی کو منظرِ تحقیر و کجیہ کر صرف دو پارا غلط کرمانا اور ایک خسروانہ شان بے نیازی کے ساتھ نکھیا کہ کسی اگلی اشاعت میں ان سے فائدہ اٹھاؤں گا سال اکھڑائیں گھنٹا پہلے تھا کہ کسی اگلی اشاعت میں بغیر حوالہ دیے جو میر کی فطرتِ ثانیہ ہے، ”میں معترض“ کے بعض علمی اعتراضات سے فائدہ اٹھاؤں گا چنانچہ ڈی گلس ایڈیشن کے ص ۸ پر ارشاد ہوتا ہے :

”اب نسخہ خواجہ کی یہ دوسری اشاعت مباحث و مطالب میں ضروری ترمیم اور ترقی کے بعد ڈی گلس ایڈیشن کی صورت میں غالب دستوں کی نذر کی جا رہی ہے۔“

کیا الیہ ہے کہ یہ ضروری ”ترمیم“ اور ”ترقی“ جن دو متالوں یعنی ”دیوان غالب“ نسخہ خواجہ۔ اصل محتاج ”اور“ ”دیوان غالب“ نسخہ خواجہ یا نسخہ سرود“ (سیّد قدرت نقوی) کے باعث ممکن ہوئی، ان کا کہیں تجلّو کر بھی اس ایڈیشن میں ذکر نہیں۔ یہ ہے اس غالب شناس ”کی علمی دیانتداری۔“

دیوان غالب نسخہ خواجہ کے متن کا ص ۲۲ معین الرحمن صاحب کے لیے کا برس لیا گیا تھا۔ اس صفحے پر یونیورسٹی لائبریری کی نمبر اور اس میں درج ایکشن نمبر 6812 تھا۔ پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) کی جدول سے یہ کھرچ کر کم و بیش مٹا دیا

گیا تھا لیکن چونکہ اس کو شش میں اقبال کے اس مصرع کے مصداق کو "میاں بخار بھی پھیلے گئے ساتھ" جدول کا کچھ حصہ بھی چھل گیا تھا اور جمل بزبانِ حال پکار پکار کر انا اعلان کر رہا تھا اس لیے اس سے پہلے کو کا پوس شخص بے خبر کو حالتِ صرع تک لے جانا، شخص بے خبر نے بیدار ہو کر آنکھیں ملیں اور جدول کے انہما کو تسلیم اور برابر کر دیا۔ چنانچہ نئے ڈی کس ایڈیشن کے ص ۲۲ کی جدول اصل کے مطابق کردی گئی ہے :

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا مجھے !!

میں نے اپنی کتاب میں متن کی تفسیق قرأت (باز فرشت) کی متعدد غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے معین الرحمن کی متنی قرأت کو ناقص قرار دیا تھا۔ میرے اعتراضات کو تسلیم کرتے ہوئے ڈی کس ایڈیشن سے انہما نے اپنی اس تفسیق قرأت کا کٹا کٹا نکال دیا اور صرف اصل متن کا رنگین محسّ شائع کر دیا۔ اس ڈیڑھ سو سال پرانی کتابت کو آج کا قاری کیسے پسے گا، یہ مرتب کا دردِ سر نہیں، قاری کا دردِ جگر ہے۔

میرے نشان دادہ نوے پچانوے فیصد اعتراضات کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے (مگر بغیر کسی تحریری اعتراف کے) معین الرحمن صاحب نے اپنے ڈی کس ایڈیشن میں ترمیم و ترقی کر لی ہے۔ اسے ایک کھلا گمبے اعلانِ اعتراف شکست نہ کیے تو کیا کیجیے! مثلاً میں نے اپنی کتاب میں سوال اٹھایا تھا کہ معین صاحب کو نار کلی کے کس کو بار کی سے منظوم دیوان ملا تھا معین صاحب کے پاس اس کا کوئی حجاب نہیں تھا۔ چنانچہ ڈی کس ایڈیشن میں "کار وباری" کو "کار وباری مرکز" سے بدل دیا (دیکھیے ص ۱۰) میں نے اعتراف کیا تھا کہ معین الرحمن نے قطعات کے عنوانات کو منظوم کھسکا ہے حالانکہ وہ بشرِ متفقہ آہیں۔ نئے ایڈیشن سے انہما نے منظوم فارسی عنوانات والا جلد حذف کر دیا ہے۔ (دیکھیے ڈی کس ایڈیشن ص ۱۹) میں نے کھسکا تھا "کم و بیش" کی ترکیب مرتب کے ذمہ منی خطمان کی آئینہ دار ہے۔ مرتب نے یہ الزام اپنے سر لینے کے بجائے نئے ایڈیشن سے "کم و بیش" کی ترکیب حذف کر دی۔ (ص ۲۹) میں نے کھسکا تھا کہ مساج

الہنۃ " کا مصنف داغلا کا شفی نہیں مگر معین الدین فراہی ہے۔ اب مقدمے سے اور کتابوں کے ساتھ " معارج الہنۃ " اور اس کے مصنف کا نام خارج کر دیا گیا۔ بے محل نہ ہوگا اگر ذیل میں پہلے ایڈیشن (۱۹۹۸ء) میں راہ پا جانے والی اغلاط اور ٹوئی ککس ایڈیشن (۲۰۰۰ء) میں میری معروضات کی روشنی میں کی جانے والی اصلاحوں کا ایک تقابلی گوشوارہ قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کر دیا جائے۔ یہ محض چند مثالیں ہیں :

دیوان غالب نسخہ خواجہ (نسخہ لاہور)

دیوان غالب نسخہ خواجہ (نسخہ لاہور)

ٹوئی ککس ایڈیشن ۲۰۰۰ء

پہلا ایڈیشن

کیوں جان عزیز (ص ۳۱)

کیوں جان عزیز (ص ۲۹)

اوراق بغیر فروع گسری (ص ۳۲)

اوراق بغیر فروع گسری (ص ۳۰)

لختے از سامانِ جگر گردانی (ص ۳۵)

لختے از سامانِ جگر گردانی (ص ۳۲)

رہی نہ طرزِ مستم اور کوئی جاں بچلے (ص ۳۷)

رہی نہ طرزِ مستم اور کوئی جاں بچلے (ص ۳۲)

پنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں بچے (ص ۳۸)

پنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں بچے (ص ۳۵)

۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۹ء (ص ۴۱)

۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۹ء (ص ۳۷)

بزمِ شاد ہنشاہ (ص ۴۲)

بزمِ شاد ہنشاہ (ص ۳۸)

میں اور بزم سے (ص ۴۲)

میں اور بزم سے (ص ۳۸)

گتے تو ہوں تم (ص ۴۴)

گتے تو ہوں تم (ص ۳۹)

پتے نذر کرمِ تنہا ہے شرمِ نرسانی کا (ص ۴۴)

پتے نذر کرمِ تنہا ہے شرمِ نرسانی کا (ص ۳۰)

لب خشک در خشکی مروگاں کا (ص ۴۷)

لب خشک در خشکی مروگاں کا (ص ۳۱)

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گھوڑہ جنبانی (ص ۴۷)

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گھوڑہ جنبانی (ص ۳۱)

بساطِ حمز میں تھا ایک دل یک قطرہ غول (ص ۴۷)

بساطِ حمز میں تھا ایک دل یک قطرہ غول (ص ۳۱)

وہ بھی (ص ۱۸۲)

وہ بھی (ص ۳۵)

محرم نہیں تو ہی فراہ تے راز کا (ص ۱۸۲)

محرم نہیں تو ہی فراہ تے راز کا (ص ۳۰)

گتے تو ہوں تم سب (ص ۱۸۶)

گتے تو ہوں تم سب (ص ۳۹)

ہاں سرنوتہم نہیں اس کا نام (ص ۳۱۰) | ہاں سرنوتہم نہیں ہم اس کا نام (ص ۱۸۷)
 بچوں کا بھی نہ دیکھا تھا... (ص ۳۱۰) | بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا... (ص ۱۹۲)
 سال وفات ۱۸۳۳ء بتایا ہے (ص ۳۲۱) | سال ولادت ۱۸۳۳ء بتایا ہے (ص ۱۹۷)

”خدا پرست! از بہر خدا ایں عربی مفہم فارسی ہذاں فی پریم کر کیست
 می پریم کہ چہیت“ ————— قاطع برہمان ص ۴۹

میں نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ معین الرحمن فارسی نہیں جانتے اور ان کے مرتبہ دیوان غالب میں فارسی متون کے ”تشکیل دیے گئے تراجم“ (یعین صاحب کے اپنے الفاظ ہیں) کئی جگہ بڑے ناقص اور کچھ مقامات پر محکمہ خیز ہیں۔ چنانچہ اب انھوں نے اپنے مرتبہ دیوان غالب کے ڈی کس ایڈیشن میں بغیر حوالے کے میری کم و بیش ساری تجاویز قبول کر لی ہیں۔ مثلاً پہلے ایڈیشن میں ایک جگہ کا ترجمہ یہاں تھا: ”اس آتش پارسی کی پاکیزگی مسلم ہے“ (ص ۲۳۰)۔ میری توجہ دلائے پر (دیکھیے... اصل حقائق ص ۱۸۸) انھوں نے اس جگہ میں تراجم کر کے لکھا ہے: ”اس آتش ہندی کی مستر خاصیت ہے (ڈی کس ایڈیشن ص ۲۱۹)۔ میں نے ”چشم روشنی“ کے صبح معانی اور توصیحات اپنی کتاب (دیکھیے ص ۵۲-۵۳) میں درج کی تھیں چنانچہ معین صاحب نے اپنے ڈی کس ایڈیشن میں ان کی روشنی میں تصحیح کر لی۔ ایک جگہ انھوں نے غالب کی مستعمل ترکیب ”بخنی بخنی“ کو ”مدفن بخنی“ کر ڈالا تھا۔ میری نشانہ سی پر اب انھوں نے اس کی بھی تصحیح کر لی۔ ذیل میں میرے تجویز کردہ جملے اور ان کی روشنی میں معین الرحمن کی ڈی کس ایڈیشن میں کی گئی ترامیم کا ایک گوشارہ تجاویز مطالعے کے لیے پیش ہے :

ڈی کس ایڈیشن میں کی گئی تھی

یہ کسی صورت بھی گداز کی قلب کے لائق
نہیں نہ ہی بزم افروز کی قابل ہے
(ص ۲۱۶)

یہ جویندہ (مرزا غالب) اس آتش
تابندہ کی تلاش میں بے قرار ہے جو
ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے لیے
پتھر سے نکل آتی تھی۔ (ص ۲۱۶)

نص و خاشاک (ص ۲۱۶)
شعر و سخن کی روشنی (ص ۲۱۶)
ممکن ہے کچھ دنوں تک (ص ۲۱۷)
اس دیوان کے مرتب (ص ۲۱۷)
وجودِ مہم اور ہستیِ مہم (ص ۲۱۷)
بالآخر نجف اشرف میں تربت بھی
عطا فرما (ص ۲۱۷)
دامنِ کمرنگ اٹھایا ہے (ص ۲۱۸)
دوات کی روشنائی کا چراغ روشن
کرنے والے (ص ۲۱۸/۲۱۹)
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی
نہیں۔ (ص ۲۲۳)

میراجوزہ ترجمہ مشہور... اہل حقائق

(۱) یہ شاعری (اردو) کسی طرح اس لائق
نہیں کہ اس سے دل چھلے نہ یہ بزم افروز
کے لیے مناسب خیال کی جاسکتی ہے۔
(.....: اصل حقائق" ص ۵۳)

(۲) جبکہ میں گن آرزو مند شاعر اس روشن
آگ کے حصول کے لیے بے چین ہے
جو ہوشنگ کو مبارک باد دینے کے
لیے پتھر سے باہر نکل آتی تھی۔
(... اہل حقائق ص ۵۳)

(۳) غص (ص ۵۳)
(۴) سخن / شعر کی روشنی (ص ۵۵)
(۵) امید ہے کچھ نئی نئی (ص ۵۵)
(۶) جامع دیوان (ص ۵۶)
(۷) وجودِ مہم اور وجودِ اعتباری (ص ۵۶)
(۸) اس کی عاقبت ایسی ہو کہ اسے دفن بھی
نجف میں نصیب ہو جائے (ص ۵۶)
(۹) دامنِ کمرنگ لے آئی ہے (ص ۵۷)
(۱۰) دوات کے خانہ اوے کا چراغ
روشن کرنے والے (ص ۵۷)
(۱۱) یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی
نہیں۔ (ص ۲۸)

جسے محل نہ ہوگا اگر میں عرض کروں کہ فارسی محقق کی قرأت اور اردو ترجمے میں میری تجویز کردہ تصحیحات کو ڈاکٹر گیان چند جین نے مایہ نفع قرار دیا ہے۔
 میری نشاندہی پر مرتب نے ڈی کس ایڈیشن میں فہرست اشعار بڑھا دی ہے یہ پہلے ایڈیشن سے غیر سامع تھی۔ مرتب نے اس ڈی کس ایڈیشن میں چند غلطیاں پھر ہرائی ہیں جن کی میں اپنی کتاب میں نشاندہی کر چکا ہوں مثلاً ڈی کس ایڈیشن کے ص ۲۷ کے ماثیہ نمبر ۲ میں غور شید کے اطلاق کا استد (دیکھیے میری کتاب ۱۰۰۰ اہل حق کا ص ۲۰۱۹)۔ میں نے لکھا تھا کہ صبح لفظ ”مرتب“ نہیں ”مرتب“ ہے۔ نئے ایڈیشن میں پھر ”مرتب“ شائع کیا گیا ہے (ص ۲۵)۔ میری نشاندہی کے باوجود (دیکھیے ص ۲۵) نئے ایڈیشن میں ”بغیر فروغ گسری“ کو ”فروغ گسری“ لکھا گیا ہے (ص ۲۵)۔ ”تیرہ شب سواد“ کو ”پھر تیرہ شب سواد“ لکھا گیا ہے (دیکھیے ڈی کس ایڈیشن ص ۲۵) ڈی کس ایڈیشن کے ص ۲۷ کا ماثیہ نمبر ایک بے معنی ہے اس لیے کہ صبح شعر کی نشاندہی بحوالہ سید عبداللہ میں نے اپنی کتاب کے ص ۲۰ کے ماحیے میں کر دی تھی۔

ڈی کس ایڈیشن میں کچھ نئی غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ صفحہ چھ پر ”اور غالب پر مہراں رکھے“ ہونا چاہیے تھا کیونکہ ”اور غالب پر مہراں رکھے“ سے ذہن کو دھچکا لگتا ہے۔ غالب کا صبح مصرع قریوں ہے ”اور غالب پر مہراں رکھیو“ ص ۳۱ پر مصرع: ”ہو سوچ گر و راہ مرے سر کو دوش ہے“ درست نہیں۔ ص ۳۵ اور ص ۴۰ پر ترکیب ”شعری شاعر“ ”شعری شاعر“ ہو گئی ہے۔ اس کی تصحیح ضروری ہے۔

ص ۳۱ پر صمیم صاحب نے پھر اپنے بے بنیاد موقف کا اعادہ کیا ہے کہ ان کا نسخہ مرثیہ وقاصی عبدالودود کے مخطوط دیوانی غالب سے بڑی حد تک مماثل اور سید عبداللہ کے متعارف مخطوطے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے۔ زیر نظر ایڈیشن

لے دیکھیے: ”دیوانی غالب، نسخہ خواجہ یونس لاہور“، ہماری زبان، ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۳۷۲ء ص ۲۔

میں جو شواہد پیش کیے جا رہے ہیں اس کے بعد معین صاحب اپنے اس جملے اہل ترقیت سے یقیناً دستبردار ہو جائیں گے۔ مالِ سرودہ وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں جمع کراچے اب انہیں کھل کر سچی بول دینا چاہیے۔

جن دنوں میری کتاب "اہل حقائق" کے جواب میں معین الرحمن کی... صحیح صورت حال "چھپی" مجھے اپنے ایک ممتاز معاصر کا ادارہ... کا قلم خط ملا جس میں ایک تجلہ معین صاحب کے جواب دہی کے بارے میں تھا:

"حافیت اسی میں کھتی کو موصوف آپ کے مقالے کو شیر باد کی طرح پنی جاتے، انجان بن جاتے تو ان کی نرسوائی میں مزید اضافہ نہ ہوتا"

خط پڑھ کر میرے ذہن میں کسی فارسی شاعر کا ایک مصرع گونجا: مرغِ حافل چوں بدام افتد تحملِ بایش، مگر معاً خیال آیا کہ یہ شرط تو مرغِ حافل کے لیے ہے۔ چھڑا کہ ایک شعر یاد آیا: نہ تر لپ لگے جتنا جال کے اندر۔ جال گھسے گا کمال کے اندر خیال آیا یہ تو کچھ معین الرحمن صاحب کی کتھا کا تشبیہی بیان لگتا ہے۔ اور پھر....

پھر بسیل غائب "شائع ہوتی جوان کے بازاری اسلوب کا شاہکار ہے۔ میرا کتا بچ شائع ہونے پر انہی معاصر نے لکھا تھا:

"آپ پر رشک آیا کہ کس علمی شان سے آپ نے موزون سے انصاف کیا ہے۔"

معین الرحمن صاحب نے کس علمی شان سے اپنے موزون سے انصاف کیا اس کے کچھ نمونے درج کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

(۱) "خواجہ دا گواہ ڈوڈو کا محاورہ ان پر صادق آتا ہے۔ ڈوڈو پنجابی میں میٹرک کو کہتے ہیں۔ جو اپنے ثنائی کی واحد شہرت رکھتا ہے۔"

.... "صحیح صورت حال" ص ۱۱

(۲) "ت۔ ف کی مناظراتی اور اتہامی مزاج کی نگارش" (ص ۱۲)

(۳) "انگور بننے سے پہلے منقرن جانے کے اس رویہ پر" (ص ۱۹)

(۴) "عالم فاضل" ہونے اور عقل سے پیدل ہونے میں بُجیا بیر کا رشتہ

نہیں ہے۔ ... صحیح صورت سال، ص ۵۰
(۵) "کتے کے باولے پن کو بہادری کا نام کیوں کر دیا جاسکتا ہے"

"برسبیل غالب" ص ۱۸

(۶) "گویا لطیف الزماں خاں کے آپ پر اعتراضات کتے کے باولے پن کے
مترادف ہیں)

(۷) "خاکساری برقی جاسے تو دنیا بے وقوف سمجھتی ہے۔ اس لیے یہ زمانہ جوتے
مارنے کا ہے" "ص ۱۳۷"

(۸) "لطیف الزماں خاں کی دریدہ دہنیاں اور کور فطیناں بڑی اذیت دہ اور ناقابل
برداشت ہیں۔ انھیں لگام دینے کی ضرورت ہے۔ ... ملتان فرہار کو
روکنا اور ٹوکنا چاہیے۔ مقابلے کی پیش رفت اہل ملتان کی جانب سے چاہیے
کہ یہ دلدرد اور کورال کے سر پر نہ رہے۔" ایضاً، ص ۱۳۳

اسی کتاب میں ایک جگہ لطیف الزماں خاں کو چھوٹے قدا اور موٹی عقل کا بھانپکر
کہا گیا ہے۔ ایک جگہ "عقل سے پیدل" قرار دیا گیا ہے۔ یہ چند مثالیں مثنت نمونہ
از خوارے کا مصداق ہیں۔ پوری کتاب اسی سو قبانہ اسلوب کی ہمانداد و بدو
سے آئی ہے۔ کہاں تک نقل کیا جائے۔ یہ ہے اس شخص کا اسلوب تحریر جو اپنے
عبارتوں میں بڑا تعلیق نظر آتا ہے۔ سہی کا یہ شعر کیسا برجل ہے :

در برابر چو گو سپند سلیم

در قفا بچو گرگ مروم در

جی پاتا ہے اس موقع پر اس نام نہاد غالب شناس کی خدمت میں غالب ہی کا
ایک شعر پیش کروں :

در جہل دشنام کار سوتیاں باشند بے

نگار دار و علم از کارے کہ آغا گروہ است

لہ "آغا" کی جگہ "سیدہ بختی" آسکتا ہے۔

معین الرحمن کے اس دشنامی اسلوب تحریر کا زٹس اہل علم نے لیا ہے۔ ڈاکٹر مشرف احمد نے لکھا :

”ڈاکٹر معین الرحمن نے مخالفوں اور مستحقوں کو سمات کرنے اور اعلیٰ ظرفی اختیار کرنے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اقتباسات نقل کیے ہیں مگر خود ان کا یہ حال ہے کہ ایک خاص علمی بحث میں وہ آپلے سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے مستحق کا پورا نام لینا بھی انہیں ناگوار ہے۔ اور اگر باہر مجھڑی نام لکھتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ ہر جگہ ت۔ ف بھی لکھتے ہیں۔“

رفیق احمد نقاش لکھتے ہیں :

”ڈاکٹر تحسین فراتی نے اپنے کتابچے میں علمی وقار قائم رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن کا ذکر کرتے ہوئے یا تو ان کا پورا نام لکھا ہے یا ”معین صاحب“ لکھا ہے۔ معین صاحب نے جوابی کتابچے کے ابتدائی سرفے چند ”میں سورت مال کی مائکت کا لحاظ روا رکھتے ہوئے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تحریر کا اقتباس دیا ہے : جس شخص کو دوست سمجھا ہوں اس کے خلاف توہین و تحقیر کے الفاظ میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔۔۔۔۔“ لیکن آگے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس اقتباس میں ویسے گئے اصول کی وجوہات اڑا کر اخلاقی دیوالیہ پرن کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مذکورہ جوابی کتابچے میں معین صاحب نے پانچ جگہ تحسین فراتی اور کم از کم پینتیس جگہ ت۔ ف لکھ کر ڈاکٹر تحسین فراتی کا ذکر کیا ہے۔“

”بسیل غالب“ کی اشاعت پر ۱۵ اربھرت سنہ کو ایک ماسٹر نے میرے نام اپنے مکتوب

۱۵ روزنامہ سیکرٹری کراچی، ۱۸ جولائی ۲۰۰۰ء

لکھ سکوری، فروری ۲۰۰۱ء، ص ۱۷

میں لکھا :

”آپ نے ”برسبیل غالب“ دیکھی۔ یہ اسی قسم کی کتابیں لکھ سکتا ہے کہ اس کی دھسنی سب عورتوں کے کوسنوں والی ہے۔ اس میں بھی وہ بھند ہے کہ اس کا مسرودہ نسخہ ڈاکٹر عبداللہ، قاضی عبدالودود اور عرشی صاحب کے نسخوں سے الگ ہے۔ حد تو یہ ہے کہ وہ اس سے ملا علی کا اظہار کر چکا کہ عرشی صاحب کے سامنے اس نسخے کا فوٹو اسٹیٹ (رولنگران) تھا۔ ایسا شخص دیوان غالب تو کیا دیوان ناصر زیدی بھی مرتب کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔“

میں معین الرحمن کے اس جملے سے مجھے اسلوب اور مبطل اور سو فیاض زبان پر غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصلاً ایک ایسے شخص کا ردّ عمل ہے جو جملہ عظمت میں مبتلا ہو رہی تھی کسراں تبصرہ ناقصیدوں نے پوری کدوی جو معین الرحمن صاحب نے بعض اہم لکھنے والوں کو بار بار مجھ پر کر کے لکھا ایسے اور اپنی شان میں ایک کتاب کی صورت میں مرتب کی کہ اور محمد اس پر عرشی لکھ کر اپنے ہی ادارے سے شائع کر دیے۔ بقول رفیق احمد نقشب ”اہل علم کو“ نسخہ خواجہ کے نسخے بھیج بھیج کر ان سے فوری تاثرات لکھ بھیجنے کا تعاضا کیا۔ خاص یہ فوری طور پر تعریف تو ممکن ہے اور بیشتر افراد نے حسن طباعت کی بجا طور پر تعریف کی ہے۔ تحقیقی نقائص غماہر کر لے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام محققین نے سید معین الرحمن کی خاطر خواہ تعریف سے کام نہیں لیا۔“ جب ان کو ان کے صحیح مرتبے کا نہ کم نہ بیش احساس دلانے کے لیے آئندہ دکھایا گیا تو وہ شدید صدمے سے دوچار ہوئے۔ یہ سارا اخطائی، اختلاقی اور احصاب زدگی کا طرز عمل اسی آئندہ داری کا منطقی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ انسان کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ اپنے تاج کو سنا نہیں بناتا، باتیں بھیجا گری کی کرتا ہے۔ یہی حال معین الرحمن صاحب کا ہے :

”میرے ممتاز معاصر نے معین الرحمن صاحب کے لیے دوا کا میڈ استعمال کیا ہے جو سنا نہیں

نکودہ زرمیں خود را و بہر عرض فریب

پر پیش خلق حکایت دیکھیا گویند (غالب)

میں نے دیوان غالب (نسخہ لاہور) مرتبہ معین الرحمن پر بڑی نیک نیتی سے علمی اعتراضات اٹھائے تھے۔ شاہد امان میں سے فوٹے پیا فوٹے فیصد اعتراضات معین الرحمن صاحب کو قبول کرتے ہی سنی اور انہوں نے دیوان غالب کے ڈی کسل ڈیلیشن میں بغیر حوالے کے تفصیلات قبول فرمائیں۔ بغیر حوالے کے دوسروں کے تحقیقی اکتسابات کو ٹریپ اور ہضم کرنا ان کا ایک ناقابل علاج مرض معلوم ہوتا ہے۔ حقیقی چراغ سے چراغ جلانے کا عمل ضرور ہے مگر تحقیق کے نام پر دوسروں کے چراغ گل کر کے زاموں کی طرح ان کی جتنی لے آؤ تا اور اسے اپنے بہ ہتیت ویلے میں سموکرا سے روشن کرنا محتاج کوتاہی کرنے اور صداقت کا غول کرنے کے مترادف ہے۔ میں معین صاحب کے لیے اس ذات کے حضور دعا گو ہوں جو ختم کرمیت سے ہلنے اور کبھی کو مستقیم کرنے پر قادر ہے۔ ممکن ہے کسی سہانی مسیح جناب معین الرحمن اپنے سابقہ افعال نامعلوم کو محسوس کرتے مجھے اپنی طول طویل سرت باز میں کمال کا احترام کر لیں۔ وجہ غفلتوں میں اعتراضات تو وہ ہیں اسطورہ جند بار کر چکے۔

۱۔ ان علمی اعتراضات کی ذیل میں زبان و بیان کی ان مستند و فاحش اور مضحکہ خیز غلطیوں کو بھی شمار کرنا چاہیے جو معین الرحمن کی متذکرہ بالاکتابوں میں موجود ہیں مثلاً آسمان سنبھال۔ (۰۰) صحیح صورت خیال (ص ۱۱) "خزل" سے "خلیں" (ص ۱۱) "مکن ہر سکا" (ص ۱۱) "مکن کے ساتھ" "سکا" "مینی چہ؟" ان کی ذہنی غرابیت کا منظر ہے "برسبیل غالب" (ص ۱۲) "یہ ذہنی غرابیت" کیا ہوتی ہے؟ معین الرحمن صاحب کو ترکیب سازی کا بھی حقوق ہے مگر ان کی کئی ترانیم ایسا دہندہ کی ذیل میں آتی ہیں مثلاً باد و ہوائی (برسبیل غالب ص ۱۱) "تخصیہ سٹشنامی" (ص ۱۱)۔ اسلامی دیوان (ڈی کسل ڈیلیشن ص ۱۱) ذال سمر کو کئی جگہ مجتہد (پرنسپل جیم) لکھا ہے وغیرہ۔



رونگی بای که او سکا غیر سنی اخلاص حیف
عقل گشتی می کرد و به سحر کسا آشنا



کردش محبوس بچنگل های لعل
دزد و صحر او سکا و دقظه دریا آشنا
عافیت کاوشن اود او اسکی کا آشنا
میرزا انور لیس او زینت تیر آشنا
سنگ سار که بر او ای شد بید آشنا

دزد و صحر او سکا و دقظه دریا آشنا
شوقی می سامان تر از نازش ارباب
مینا یک آفت کا گرا و دل حسی کا
سکو به سنج رنگ به کیر نه به ناچار
کو کمن نازش نیشال شرم نیا آشنا

.....

نگار فیض آفرینا جوار دان اپنا
آج ہی ہوا منظر او کو اسٹان اپنا
عرش ہی او بر سونا کا شکی مکان اپنا
باری آشنا نکلا او سکا پاس بان اپنا
انگلیان گنگا اپنی خار جو چنگان اپنا
سکسہ ہی ساری سنگستان اپنا
دوست کی سنگا بت میں بھی ہر نل اپنا

کراوس پر پی شکر او پر بیان اپنا
می و کیوں بیت پنی بزم غیر میں بیان
منظر لکھندی پر او رہم بنا سکتے
وی و جھڑ زلتم چمنی میں تاب سکتے
درد دل کس کو کتب جاؤں انکو دکھلا دوں
کتنے کتنے رشت جاننا آپ فوج تہا
ناکری نہ غمازی کر سیا ہی دشمن کو

در شکبانی که او سکا غیر سنی اعلا من حقیق
عقل کسبی می کرده بهر کسکا آشنا

گر دشمن محبوس بچنگهای سبلا آشنا
دزد صحر او سکا و قطره دوبا آشنا
عافیت کا دشمن او را و ارگی کا آشنا
میرا از انو مولس او آینه تیر آشنا
سنگ سزا که بودی نه بد آشنا

دزد دزد سافر بخانه نیزنگ است
شوق بی سامان تر از نازش ارباب است
مین او یک آفت کا گمرا و ذل حسی که است
سنگ سنج رنگ بهر کسکه بهر کسکا آشنا
کو کمن لغز که پیشال شیرین تبا آشنا

بگلیا قریب آخر تبا جوار و ان اپنا
آج بی هوا سطور او سکا امخان اپنا
عرش بی او هر سونا کا سنگی مکان اپنا
باری آشنا نکلا او نکلا پاسبان اپنا
انگلیان نکلا اپنی خانه نو چنگان اپنا
سکسجه بی میری سکا آستان اپنا
دوست کی سکا است بین چنی نرمان اپنا

کذا و اس بی شکر او پهریان اپنا
می ده کیون بهت بی بزم غیر من یار است
مسطر لک شندی پراور هم بنا سکنه
دی و جعفر و آن هم شنی من تالینک
دزد دل کیون گنگ جاوین او سکا و سکا
کسکه کسکه بی جانا بی حقیق است
کار کی نه غازی کر بیاهی و شمع کو

رضا لاہوری راہپور میں محفوظہ دیوان غالب کے نسخہ لاہور کے دو ٹوکرات کا ص ۲۲ جہاں زیریں
 جہول پر پنجاب یونیورسٹی لاہور کی مندر ہے اور اس کے اقدامیکیشن نمبر 6812 درج ہے
 نسخہ خاتمہ کے مرتب کرنے پر اقدامیکیشن نمبر جیل دیا ہے۔

غالب کے دیوان کا نسخہ لاہور میں محفوظہ
 غرضی کی مندر میں مندر ہے

دورہ غرضی میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے

غرضی کی مندر میں مندر ہے

دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے
دریں میں مندر ہے	دریں میں مندر ہے

دیوان غالب نسخہ خواجہ — اہل حقانیت

(مؤلفہ ڈاکٹر تحسین فراقی)

ممتاز دانشوروں، ادیبوں اور محققوں کی آراء کی

روشنی میں

”تحسین فراقی کا کتابچہ ’اصل حقانیت‘، دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہشت اچھا نمونہ ہے۔۔۔۔۔ تحسین کے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور تاجی عبدالودود کے نسخے اور نسخہ خواجہ کے بعض صفحات کے جو عکس دیے ہیں ان کی وسعت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی ضرورت نہیں؛ ایک عطائی بھی یہ یک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے عکس ہیں۔“

”تحسین نے فارسی متن کی قرأت اور اردو ترجمے میں جو تفصیلات تجویز کی ہیں وہ۔۔۔ مایہ ناز ہیں! اس سے مجھے یہ تذبذب ہو گیا ہے کہ تحسین شیعہ اردو کے استاد ہیں یا شیعہ فارسی کے۔ انھوں نے نسخہ خواجہ سے پیشتر ہی شروا کے ترجموں کی جو تفصیل نشان دہی کی ہے وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔“

ڈاکٹر گیان چند — ماہنامہ ’سورج‘، جنوری ۲۰۰۱ء

”میں الرحمن کا نسخہ مشکوک قرار دیتا ہوں۔ کھنڈ میں ضیعت نقوی نے نسخے کھتے تھے کہ یہ وہی قدیمی نسخہ ہے۔ تحسین فراقی نے بہت محنت کر کے بات

قطعی طور پر ثابت کر دی۔ یسین کی لغزش پر افسوس ہوا۔ اس سے پہلے
 اصول نے پرتغیزی چند فوٹو گرافز کی ”جاگیر غالب“ پر قبضہ کرنا چاہا تھا اب وہ
 میں مان لیے کو وہ پرتغیزی چند کی کتاب تھی۔“
 ڈاکٹر گیان چند (پہلے فوٹو) مکتوب مورخہ ۱۲ جولائی ۲۰۰۰ء

I never knew that this young professor
 possessed far more scholarly shrewdness than
 the distinguished scholars from India and
 Pakistan who have been complimenting
 Dr. Moeen for his discovery. Should I treat
 Tehseen Firaqi too as a rare discovery
 brought before us through
 NUSKHA-E-KHAWAJA?

Intizar Hussain-The Dawn, June 4, 2000

”سید صاحب موصوف نے فراقی صاحب کے بے شمار روزنی حواشی
 میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے بلکہ وہ
 جواب خط پر وہ غریب سلسلہ لکیری سی بنا کر رہ گئے ہیں
 اب یہ ڈاکٹر تحسین فراقی کے اعتراضات کی کلیتہاً تائید کے علاوہ مزید اعتراضات
 وارد کرتے ہوئے ملک کے مستعد راہب فیض و کمال نے اعلیٰ کے کلچر اعلیٰ کے
 ضمن میں غالب شناسی کا حق ادا کر دیا ہے..... سید صاحب امتحان نے یہ
 شش (شش لاہور) کسی کپڑی سے خریدنے کی جو کمانی گڑھی ہے، وہ
 کذب بیانی کے سوا کچھ نہیں.... سید صاحب کسی منظرے کو بچنے اور اسے

مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں اسی لیے ان کے مرتبہ نسخہ خواجہ
میں لغزشوں کی بھرمار ہے۔“

غیسل الرحمن، ادوی، لاہور، ماہنامہ سورج جنوری ۲۰۰۱ء

”تحقیق نامہ میں آپ کا خط پڑھا نسخہ لاہور سے متعلق۔ آپ نے
یہ کیوں نہیں لکھا کہ یہ دراصل نسخہ لاہور کی ہے بلکہیت بدل جانے سے
اصلیت تو نہیں بدلتی۔“

_____ رشید حسن خاں ۲۸ جولائی ۹۹ء

”مخلوط دیوان غالب کھلا ہوا چوری کا مال ہے۔ آخر یہ مصرع
بے معنی تو نہیں؛ چڑولا دراست۔۔۔۔۔“
_____ رشید حسن خاں کے ایک اور مکتوب، گرامی سے نقباس

”کیا بچہ (دیوان غالب نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق) واقف خوب ہے
اور آپ کی یہ راستے بالکل درست ہے کہ حسین صاحب نے ایک بات کا
بھی جواب نہیں لکھا اور بہت کچھ لکھا۔“
_____ رشید حسن خاں کا مکتوب مورخہ ۲۸ جولائی ۲۰۰۰ء

”میں نے ’مکملاتِ شکی‘ کا انتساب محمد عامر کے ادبی ٹنگوں
کے نام کیا ہے جنہوں نے غالب کو اپنا ہونے کا کراس پرانی روایت
کی نئے انداز سے ترمیم کی ہے۔“
_____ رشید حسن خاں بنام لطیف الزماں خاں مورخہ ۱۹ اگست ۲۰۰۰ء

”تحصیل صاحب کالان تحصیل رسالہ شمس خواجہ سے متعلق ایک صاحب نے عنایت کیا ہے۔ اس قسم کی مجاہدہ تحریریں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ اللہ مزید کی ترفیق اور مواقع عطا کرے۔“
 — ڈاکٹر انصار اللہ جیلگڑہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مورخہ و گنت

”دیوان غالب شمس خواجہ۔ اصل حقائق۔“ کا ایک نسخہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ اس موضوع پر بات ہونی چاہیے تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کا آغاز آپ نے کیا۔“
 — ڈاکٹر جمیل جالبی، کراچی - ۱۹ مارچ ۲۰۰۰ء

”دیوان غالب شمس خواجہ“ کا نسخہ پہنچا۔ فورا ہی پڑھ ڈالا۔ اور آپ کی حق پسندی، فوٹی تحقیق اور دید و دریافت کے لیے دل سے دعا نکلی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو رواں دواں رکھے اور آپ علی سینہ زوریوں کو اسی امان سے بے نقاب کر سکتے رہیں۔“
 — ڈاکٹر اسلم فرخی، کھاپچی، ۱۵ جون ۲۰۰۰ء

”کتاب بل گیتی اور تمہاری تحقیق، محنت، علم اور جہتوں نے بہت متاثر کیا۔ مجھ پر تحقیق مت کرنا ورنہ میرے سارے جھوٹ منظر عام پر آجاتیں گے۔“
 — لندن سے ساقی فاروقی کا مکتوب، ۳۰ مئی ۲۰۰۰ء

”آپ کی کتاب“ دیوان غالب شمس خواجہ۔ اصل حقائق“ نظر

سے گزری۔ بے ساختہ آپ کی ثروت نکلا ہی کی داو دینے کو جی چاہا آپ کی معلومات کی وسعت اور تہمتی کا مزید قائل ہو گیا۔ اردو ادب کے حوالے سے اسے نئی صدی کے پہلے بڑے ائمہ کے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ اس دور میں بھی مشیوۃ شیرانی کی پیروی جاری ہے۔
 ————— افضل حق قریشی (لاہور)

”حال ہی میں ڈاکٹر تحسین فراقی نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے جس کا نام ”دیرانِ غالب“ منٹو خراجہ۔ اصل حقائق ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ منٹو خراجہ درحقیقت منٹو لاہوری ہے جسے پنجاب کی یونیورسٹی لاہور ری سے جڑا لیا گیا تھا۔
 میں ڈاکٹر تحسین فراقی کو اس جرأت مندانہ تحقیق پر داد دیتا ہوں۔
 ————— پروفیسر لطیف الزماں خاں، منٹو نے پاکستان ۳۴ مئی ۲۰۰۰ء

”ڈاکٹر معین کی کزوریال نہایت افسوس ناک ہیں۔ وہ اپنی عزت پر کوٹھو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا تے رہتے ہیں۔ ان کا حذر گناہ بدتر از گناہ ہوتا ہے۔“

— فیض صدیقی، مورخہ ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

“What Dr. Firaqi has done more convincingly in his monograph is pointing out the mistakes made by Dr Moin-ur Rehman while transcribing the diwan with vowels. This critique reveals that Dr. Moin-ur-Rehman's

editing and commentary are defective in places..

Khalid Ahmad

The Friday Times (Lahore) July 7-13-2000

”ادارے میں معین الزعمی کے بارے میں پڑھ کر دُکھ ہوا....
تحمین فراقی ایک معتبر شخصیت ہے۔ لطیف الزماں نے بھی ان کی تحیات
کی ہے تو بات حتمی ہے۔“
— حمایت علی شاعر، بنام مدیر تخلیق آگست ۲۰۰۰ء

”اس قلمی شخصے کے بارے میں آنسٹل کالج لاہور کے شعبہ اُردو
کے اُستاد پروفیسر ڈاکٹر تحمیں فراقی نے جو اعتراضات کیے اور اپنے کتابچے
میں جن ناقابل تردید حقائق سے پردہ اُٹھایا وہ ان دنوں غالبیات سے
وِٹسپی رکھنے والوں میں بے مروت بحث بنا ہوا ہے۔“
— ڈاکٹر مشرتن احمد اکراچی ہارڈ نامہ سرائیکپرس

۸ جولائی ۲۰۰۰ء

”کبھی کبھار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے تقریباً سبھی
شعبے ناجائز تہا و زات کا شکار ہو گئے ہیں۔ دیگر شعبوں کی طرح ادب
کا شعبہ بھی ہمارے اسی غیر فرتوا زمانہ سماجی رویے سے روز بروز
سست جا رہا ہے۔ عام گلی محلوں اور بازاروں میں ایسے تہا و زات
ہٹانے کا عمل شروع ہو توڑ کے مجھ کے راستے کھل جاتے ہیں اور بظاہر
بڑی دکانیں تنگ رہنا شروع ہو جاتی ہیں اُردو ادب میں بھی ایسے تطبیقی
عمل کی سخت ضرورت ہے جس کے آغاز کے بارے میں فی الحال کچھ

نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ یہ خوش آئند بات ہے کہ ادب کے اہم ترین حصے یعنی تحقیق میں سب مل سگائے گا یہ عمل شروع ہو گیا ہے جس کا بہراؤ اکثر تحسین فراقی صاحب کے سر ہے۔ باڈی تحقیق میں جو صاحب تہا و ذات کیسے بیٹھے تھے اور اس باڈی مارکیٹ میں اپنی دکان جس مالِ سرود سے سجا رکھی تھی وہ ڈاکٹر موصوف کے موثر عمل سے اتنی مختصر ہو گئی ہے کہ کسی سے پوچھے بغیر اس کا آنا پنا معلوم نہیں ہوتا۔

ادبی تحقیق کے دبستانِ لاہور نے جو خوشنہد روایات قائم کر رکھی ہیں، ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب کا یہ عمل اس کا حصہ ہے۔ ایسے اہل علم لائقِ تحسین ہیں جن کی موجودگی میں غیر محتاط، کاٹا اور لے دوڑی مزاج والے اور اپنی دکان کو خوش نما، اختصاروں سے سجانے والے اربابِ تحقیق و تدقیق اپنے قلم کو ذرا احتیاط سے حرکت میں لاتے ہیں۔

ڈاکٹر تحسین فراقی صاحب مبارک باؤ کے سختی ہیں کہ جو کمانی محققین اور غالب مٹا سول کی نجی محفلوں میں موضوع بحث بنی رہی اس کو محفلوں نے بدل انداز میں بصورتِ کتاب پیش کر دیا۔

ضربِ فراقی شدید ضرور ہے لیکن اس سے اردو کی ادبی تحقیق کے ضعیف و زار بدن میں صحت مندی کے آثار پیدا ہو جائیں گے۔
ان شاء اللہ۔

— محمد اکرام چغتائی۔ ڈاکٹر محمد جمال اردو سائنس بورڈ لاہور

”ان (تحسین فراقی) کی کتاب دیکھ کر مسترح ہوئی کہ انہوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سو مناتِ شکنی ”پرائیویٹ میری طرف سے مبارک باد دیکھ دیجئے گا۔“

پروفیسر شرف بخاری (پشاور) بنام محمد احسن خاں

”ہم نے کوئی دعویٰ ایسا نہیں کیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا گیا ہو۔ اگلے
دلائل فی الواقعہ براین کاٹنے کا حکم رکھتے ہیں جنہیں کوئی مصلحت مزاج شخص
مانے بغیر نہیں رو سکتا۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں کرتے ہیں فراقی
صاحب نے مسین صاحب کے دعویٰ باطل کے تاروپوروں کو بھیج کر رکھ
دیے ہیں بلکہ اس ”ابطال باطل“ کے ساتھ ساتھ اہل علم و فضل
کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھونڈ دیا ہے۔“

”مسترت ہوئی کوئٹہ فراقی صاحب نے شگفتہ شکرکھی ہے
... اور بڑی بات تو یہ ہے کہ بحث و جدل اور الزامات و طنز بات
کے دغور کے باوصف کتاب پائے ثقات سے گرنے نہیں پاتی۔
معلوم ہوتا ہے کہ گفتہ غالب یہاں بھی ڈاکٹر تحسین فراقی کے پیش نظر
رہا:

”ہمیشہ برآں رہد حرام است کہ غالب
دربے عہدوی اندازہ گفتار نداند!“

— پر فیض شرف بخاری

روزنامہ مشرق، ۱۲ اپریل ۱۸ فروری ۲۰۰۱ء

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے موقف کی تائید میں جو سبک دوزنی
دلیل دی ہے وہ یہ ہے لائبریریوں کے منابط کے مطابق لائبریری
کی ہر کتاب کا ایک تحفیہ صفحہ بھی ہوتا ہے جو کہ ایک مخصوص صفحہ اور نمبر پر
ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا بھی ایک مخصوص صفحہ ہے چنانچہ
اعتمادی طور پر اس خاص صفحے پر جس کا نمبر ۱۲ ہے وہ نمبر کفریج لگتی ہے

تاکہ یہ لائبریری کی کتاب ثابت نہ ہو سکے۔ اس بات کا معین صاحب
 نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا اور اس حساب سے سارا مقدمہ انہی
 کے خلاف جاتا ہے جب تک کہ مذکورہ کباڑیا اس کی فروخت کی تصدیق
 نہ کرے حال آنکہ ایسے نایاب نسخے کا کسی کباڑیے تک پہنچنا بھائے خود
 ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا جواب بھی خود معین صاحب ہی پر واجب ہے۔
 ”چنانچہ اس مسئلے کا کوئی کٹاں لگانے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے
 کہ اس نسخے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہو جانے کا
 پرچہ درج کر دیا جائے اور الزام بے شک کسی پر نہ لگایا جاتے
 البتہ اس شخصے کا انکار ضرور کر دیا جائے کہ یہ نسخہ وہی ہو سکتا ہے جو
 ڈاکٹر معین الرحمن کے پاس موجود ہے۔ اگر لائبریری مذکورہ کا کوئی افسر
 مصلحتاً یہ پرچہ درج کرنے میں متاثر بھی ہو تو فوجداری پر چہ کسی کی بھی
 طرف سے درج ہو سکتا ہے جسے اس دفعے کا تھوڑا سا بھی علم ہو۔“

 غفر اقبال۔ ہفت روزہ زندگی، لاہور
 ۲۴ اگست تا ۲ ستمبر ۲۰۰۰ء

”ہمالیہ پہاڑ جیسے تین شواہد ایسے ہیں جنہیں اپنی جگہ سے جنبش دینا
 محال ہے اور وہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ ڈھبی دیوان ہے جسے سید عبد اللہ
 صاحب اور امتیاز علی عرشی صاحب نے ملاحظہ فرمایا تھا۔“
 صفحہ ۲۲ شاید پنجاب یونیورسٹی لائبریری نے فیروز راج کے
 لیے مخصوص کر رکھا ہے۔ اس صفحے یعنی صفحہ ۲۲ پر نمبر کمر چا گیا ہے آخری
 صفحے پر اسی جگہ نمبر ثبت تھی جو ڈاکٹر تحسین فراہی کے پیش کیے ہوئے
 عکس میں سات ہے۔ اس کی جگہ ”فتمین“ کی چٹ لگی ہوئی ہے۔
 اسے ہٹا کر کمپیوٹر کی مدد سے سرخ رسائی ممکن تھی۔“

”سید معین الرحمن صاحب کی یہ رائے کہ شاید یہ ایک ہی کا بننے ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ نسخے تیار کیے ہوں، درست معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو تحریر میں کہیں تو کوئی نقطہ، کوئی لفظ، کوئی سطر، کوئی کشش اور سے آدھر ہوتی۔ تمیزوں کے عکس مل کر دیکھئے (جو فراقی صاحب نے دیے ہیں) کمپیوٹر پر رکھ کر دیکھ لیجئے، بال برابر کا فرق نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ تعداد صفحات یکساں۔ اختصار شماری میں سو ضرور ملتا ہے“

_____ ڈاکٹر نور الحسن نقوی۔ بنام لطیف الزماں خاں
برگدہ، لاہور، رسول لاہورین علی گڑھ

آپ ایمانداری اور دیانتداری سے ڈاکٹر حسین فراقی کی مختصر کتاب کا مطالعہ کریں۔ آپ کو شروع سے آخر تک بحث کا ایک علمی انداز نظر آئے گا۔ کہیں بھی کوئی فراقی فصاحت کا عناد دکھائی نہیں دیتا مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے اس مختصر کتاب کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا اس کا انداز کہیں بھی علمی نہیں رہا۔۔۔۔۔ جو شخص علمی و ادبی سوالات کا جواب دینے کے بھلے گاہیوں اور بدحواسوں پر آڑا کرے اس کے کمزور پہلوؤں کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔“

_____ ڈاکٹر عارف ثاقب : ”دیوان غالب نسخہ خواجہ۔ مہل محتاق“
اور ”دیوان غالب نسخہ خواجہ صحیح مشورہٴ حال“
_____ ایک تقابلی جائزہ“

”معین الرحمن کے حوالے سے ایک ادبی دیوانی کا انکشاف حیران کن

بھی ہے اور لمحہ فکر یہ بھی۔ چوں کہ آزاد کعبہ پر خیزو کہا ماند سلہانی۔ اگر
 پروفیسر صاحب کی علمی و ادبی سطح کے لوگ اس نوع کی ادبی کلمہ کا ارتقا
 کر سکتے ہیں تو پھر عام شاعر و ادیب یا محقق کے ادبی ایمان کی پختگی کی کیا
 ضمانت دی جاسکتی ہے۔ ہمیں فراقی اور طیف الزماں کے حرف کو
 ان کی غیر جانب داری اور اصابتِ رائے کے سبب ادبی دنیا میں جو اعتبار
 حاصل ہے وہ متاثرِ بیجاں نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ ساتھ آپ کے
 حوصلے کی پذیرائی بھی فرض خیال کرتے ہیں کہ جنہوں نے پلاغوث و خطر
 ایک بہت بڑے ادبی گھیلے کی نشان دہی کر دی ہے۔
 ————— قیصر مخفی بنام مدیر "تحلیق" اگست ۲۰۰۰ء

مسرودہ مخطوطہ دیوانِ غالب کی سرخیابی پر

عصرِ نوبہ رنگ تیرا قابلِ انوس ہے جو بھی کر گس ہے بزمِ خویش وہ طاف ہے
 ڈاکٹر ہمیں فراقی نے کیا یہ رازِ فاش قد ساق سے بڑا چدری کا یہ طہوس ہے
 جب کسی تارِ رخِ باغ نے تو تہید اُکھا اے خدا تو دیر گھر و قافرو قدوس ہے
 نسو ملو کہ چناب یویرِ سستی
 نسو مسرودہ گنجینہ انوس ہے

۲۱ ۱۴۳ھ

باتف زعفرانی

دیوان غالب

نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ
ایک جائزہ

سید قدرت نقوی

پہلی اشاعت : اگست ۲۰۰۰ء

نسخہ خواجہ

ڈاکٹر سید مبین الرحمن نے ۱۹۹۸ء میں دیوان غالب کے ایک مخطوطے کو ”دیوان غالب نسخہ خواجہ“ کے نام سے ملان کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر سید عبداللہ نے رسالہ ”ملا نو“ کوچی دہشت جولائی ۱۹۵۳ء میں بعنوان ”دیوان غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ“ ایک مضمون لکھ کر چھپوایا اور ساتھ ہی اس کے پہلے دو صفحات کے عکس بھی۔ ۱۹۵۷ء میں قاضی عبدالودود پاکستان آئے اور بقیاب یونیورسٹی لاہوری میں یہ نسخہ دیکھا اور اس کے فوٹو لے گئے جو بعد میں مولانا عرشی کو بھیج دیئے کیونکہ اسی زمانے میں وہ دیوان غالب مرتب کر رہے تھے۔ قاضی عبدالودود نے رسالہ ”نقوش“ لاہور ۱۹۵۸ء میں اس نسخے کا مختصر تعارف ”مترقات“ کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر کرایا۔ مولانا عرشی کا مرتب کردہ دیوان غالب نسخہ عرشی بھی ۱۹۵۸ء میں چھپ کر آیا۔ انہوں نے قاضی عبدالودود کے ارسال کردہ فوٹوز سے استفادہ کیا اور اس کو ”نسخہ لاہور“ کا نام دیا۔

ان تین بزرگوں کے بیانات کے پیش نظر مبین الرحمن نے اپنے مرتب دیوانا خواجہ میں بطور ”مخطوطے کا تعارف“ ص ۳۵ کے زیر عنوان یہ تسلیم کیا ہے کہ:

”قاضی عبدالودود نے ”مخطوطہ دیوان غالب“ کتب خانہ دانش گلہ بقیاب (لاہور) اور مولانا امتیاز علی عرشی نے ”نسخہ لاہور“ کے طور پر جس مخطوطے کے کوائف پیش کیے ہیں، بڑی حد تک جزئیات سمیت اس کی تفصیلات اور علامات دی ہیں جو زیر نظر نسخہ خواجہ میں موجود ہیں۔ یونیورسٹی لاہوری (لاہور) کے جس نادر نسخے کا ڈاکٹر سید عبداللہ نے تعارف کرایا ہے، وہ بھی نسخہ

خواجہ کے مسائل ہے لیکن اس میں کچھ اختلافات بھی ہیں۔ یہ اختلافات اور فرق تعداد اشعار اور شمولیات کا ہے۔

اس بیان کے پیش نظر یہ بات ضروری ہے کہ پہلے ان بزرگوں کے بیانات کو پیش کیا جائے کہ ان حضرات نے اس کے متعلق کیا کیا کہا ہے؟ اور وہ کہاں تک اور کس نظر سے اس مخلوطے کو دیکھ پائے ہیں؟ اصولاً معین الرحمن کو سب سے پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے کو پیش کرنا تھا کیونکہ سب سے پہلے انہی نے اس کو تحارف کرایا تھا۔ اسی تحارف کی بدولت قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کو اس کا علم ہوا۔ بلکہ مولانا عرشی سے تو اس کے بارے میں خط و کتابت بھی ہوئی اور ڈاکٹر عبداللہ نے اپنے مضمون میں مولانا عرشی کے خط کا اقتباس بھی شامل کیا۔ مولانا عرشی کے مرتبہ روح ان اور قاضی عبدالودود کے مضمون ”متفرقات“ میں اس نسخے کی وضاحت و مطابقت ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون ۱۹۵۳ء کے چار سال بعد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون بہر حال مقدم ہے، اس لیے اس کا ذکر پہلے ہونا چاہیے تھا۔ معین الرحمن نے اس کو موخر کر کے اصولی تدابیر کی خلاف ورزی کی ہے، جبکہ ان کے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ قاضی عبدالودود کا مضمون ۱۹۵۸ء میں چھپا اور مولانا عرشی کا مرتبہ روح الہی غالب نسخہ عرشی بھی ۱۹۵۸ء میں چھپا۔ ۱۹۵۳ء کا مضمون مقدم ہے، اس کے ذکر کو موخر کرنے میں شاید کوئی خاص مصلحت ہو۔ اب ہم ان تینوں بزرگوں کے مضامین من و عن پیش کر رہے ہیں۔



دیوانِ غالب کا ایک نادر قلمی نسخہ

از : ڈاکٹر سید عبدالقدیر (ماہنامہ ”ماہ نو“ کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء)

مرزا غالب کو وفات پائے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ان کی تصنیفی سرگرمیوں کا زمانہ بھی ہمارے زمانے سے چنداں فاصلے پر نہیں۔ مگر محب اتفاق ہے کہ ان کی زندگی کے بعض عقدے ایسے لائنل اور ان کی تصانیف سے متعلق بعض مسائل اس طرح پیچیدہ ہو کر رہ گئے ہیں گویا ہم میں ان میں کئی صدیوں کا فاصلہ ہے۔ یہ تو خوش قسمتی ہے کہ مرزا اپنی زندگی کے بہت سے بھید اپنے خطوں کے ذریعے کھول گئے ورنہ مرزا کی شخصیت اور سیرت کے کئی پہلو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تاریکی میں رہ جاتے۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ قرب زمانہ کے پلوجہ ہمارے پاس مرزا کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کے متعلق دستاویزی مواد کی پڑی کمی ہے اور جتنا کچھ مواد ہے وہ بھی یکجا نہیں۔ غالب کی زندگی میں غدر کی آندھیاں کچھ اس طرح چلیں کہ بے شمار دوسرے اہلِ کمال کی طرح ان کی تصانیف کا شیرازہ بھی بکھر گیا اور کوئی ایسی صورت نہ نکلی کہ ان کے یہ ”اوراقِ قسمتِ دل“ جو ”ہوا“ ہو چکے تھے، یکجا کر لیے جاتے۔ تمام قیمت ہے کہ زمانے نے جلد پلٹا کھایا اور مرزا کی قدر اور عزت کچھ اس طرح بڑھتی گئی کہ لوگوں کو ان کی تصانیف کی جستجو ہوئی۔ اس پر زمین خود بخود سوتی اُٹھنے لگی۔ ان کی تصانیف (یا ان کی زندگی کے ماخذ) جن کی کہیں موجود تھے منظرِ عام پر آئے گئے اور رفتہ رفتہ ان کی سوانح عمری کے تاریک گوشے معلومات کی شعاعوں سے روشنی پا کر روشن سے روشن تر

ہے۔ رامپور لاہوری کے قلمی نسخے کے آغاز میں بھی یہ دیاچہ ہے جس کی تاریخ دی قعدہ ۱۲۳۸ھ/۱۸۳۲ء ہے۔ ہانگی پور والے نسخے پر تاریخ ۱۲۵۵ھ/۱۸۴۸ء ہے۔ اس میں دیاچہ بلا تاریخ ہے۔ اس نسخے کے آخر میں خاتمہ کے عنوان سے ایک تقریظ ہے جو نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کا سرنامہ یہ ہے:

”دمیدان سپیدہ محری از حیدر شب سواد اوراق بفر قرون مستری عبارت تقریظ کہ پیدائی آں اثری ایست از آچار خرام خلصہ دلربا۔ برادر بدل نزدیک بہاں برابر عالی دودان والا مکر نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ۔“

اس تقریظ میں ۱۲۵۳ھ (ایک ہزار بست و پچہ و چار سو سو دس) اس تقریظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ”ہنگی اشعار شعرائی شعار غزل و قطعہ و رہائی ہزار و پانصد و پچہ و اندہ پانچم۔“ تقریظ کا آخری جملہ یہ ہے جس پر نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔ ”از من یادگارے و برائے دیگران تذکارے ہو۔“

میں نے اس نسخہ کا صحیح زمانہ متعین کرنے کے لیے شیخ محمد اکرام صاحب اور مولانا امتیاز علی مرثی (ناظم کتب خانہ رامپور) سے بھی خط و کتابت کی۔ مولانا مرثی کے گرامی نامے کا وہ حصہ جس میں ”دیوان غالب“ کے مختلف نسخوں کی تفصیل دی گئی ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

”اب میں دیاچہ دیوان اور تقریظ کے بارہ میں کچھ عرض کرتا ہوں۔۔۔

(۱) میرزا صاحب نے اپنے دیوان اردو کا دیاچہ ۲۳ ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ (مطابق

۱۳ اپریل ۱۸۳۲ء) کو لکھا تھا جیسا کہ برلن کے نسخے کے آخر میں موجود ہے۔

(۲) غالب اس کی اشاعت کے نتیجے پر نواب ضیاء الدین خان بہادر نے

۱۲۵۳ھ میں تقریظ لکھی۔ یہ سنہ مطابق ہے ۱۸۳۸ء کے۔

(۳) اس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ترتیب دیوان کے ۵ سال بعد اشاعت و

طباعت کا ارادہ کیا گیا تھا۔

(۴) ہمارے پاس ایک قلمی نسخہ ہے جس میں دیاچہ ہے مگر تقریظ نہیں

ہے۔ اس میں اشعار کی مقدار ۱۰۶۷ ہے لیکن تقریظ میں ۱۰۹۰ سے کچھ اوپر

اشعار بتائے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پانچ برس کے عرصے میں

جو کچھ کہا گیا تھا ۳۵-۳۰ شعرے زیادہ نہ تھا۔

(۵) سب سے پہلی بار دیوان کی طباعت و اشاعت دہلی میں میر محمد خان

بہادر کے چھاپے خانے کے بھتیجہ گراؤٹ پرپریس میں شہر شعبان ۱۲۵۷ ہجری نبوی مطابق ماہ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں سید عبدالغفور کے اہتمام میں واقع ہوئی۔

(۶) اس ایڈیشن میں تقریباً مذکورہ بالا جڑوں کی نوں چھپ چکی ہے۔ چنانچہ وہی ۱۲۵۴ء سال اور وہی ”ہزار و نود و اند“ مقدار اشعار مذکور ہے۔ گویا نے ”اند“ کے ہوتے ہوئے لفظ ہشت بھی اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔

(۷) اس اشاعت کے چھ سال بعد مئی ۱۸۴۷ء میں دہلی ہی کے اندر دوبارہ طباعت کی نوبت آئی تو اس بار بھی تقریباً کاسہ وہی ۱۲۵۴ء رہا مگر مقدار اشعار بدل کر ۱۱۰۰ نکلی گئی۔

(۸) اس کے بعد مرزا صاحب نے جو کچھ کہا جب وہ خاصی تعداد میں اکٹھا ہو گیا تو انہوں نے ایک اور نسخہ صاف کرایا۔ اس میں بھی تقریباً کاسہ وہی برقرار رکھا گیا لیکن تعداد اشعار ۱۵۵۰ سے اوپر بتائی گئی۔ یہ نسخہ وہی ہے جو آپ کے زیر مطالعہ ہے۔

(۹) بعد ازاں ایک اور نسخہ مرتب کیا گیا۔ یہ نسخہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں پہلی بار تقریباً کاسہ ۱۲۵۴ / ۱۸۵۳ء کر دیا گیا اور تعداد اشعار ۱۶۹۰ سے اوپر ظاہر کی گئی۔

یہ نسخہ کہاں گیا اس کا پتا نہیں چل سکا۔

(۱۰) اس کے بعد میرزا صاحب نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم الدینی رامپور کے لیے ایک خوشخط نسخہ لکھوایا۔ اس میں ساری تقریب اور تعداد اشعار دونوں نمبروں کے مطابق درج ہوئے۔ حالانکہ واقعی تعداد اشعار ۱۷۵۵ تھی۔

یہ نسخہ مئی ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل رامپور آیا اور کتب خانے میں اب تک محفوظ ہے۔

(۱۱) دہلی ایڈیشن کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۷۸ء (۱۲۹۱ء) میں دہلی کے مطبع احمدی میں چھپا تو اس میں بھی تقریباً کاسہ سال اور تعداد اشعار دونوں نمبروں اور ۱۰ کے مطابق رہے۔

(۱۲) لیکن ہمارے نسخے کی نقل میرزا صاحب نے مٹھی شیخ زائن کو آگرے سے طباعت کے لیے بھیج دی تھی۔ یہ نسخہ چھپ کر نکلا تو سنہ ۱۲۷۷ء رہا مگر تعداد اشعار ۱۷۵۰ سے اوپر مندرج ہوئی۔ اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں سے

تقریباً خارج کر دی گئی، اس لیے میں اب نتیجہ عرض کیے دیتا ہوں:
(الف) میرزا صاحب نے تقریباً کے سال میں تھیر کرنے میں بہت سہل انگاری سے کام لیا ہے، اس لیے اس سہ سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔

(ب) یہی صورت حال تعداد اشعار کے اظہار میں بھی پیش آئی ہے لہذا کسی ایڈیشن کی تقریباً میں جو تعداد اشعار ظاہر کی گئی ہو اسے بغیر شعر گنے ہرگز نہ ماننا چاہیے۔

(ج) آپ کے نسخے کی تقریباً کسی سابق نسخے کی نقل ہے اور یہ نسخہ ۱۸۸۳ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان مرتب ہوا ہے، اس سے مقدم کسی طرح نہیں۔

میں نے اس سلسلہ میں باہمی پور لاہوری اور پنجاب یونیورسٹی لاہوری کے فلسفی اور مطبوعہ نسخوں کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اس جستجو سے میں نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کو یہاں درج کرتا ہوں:

اس نسخے کے حلقے میں جو اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں، یہ ہیں:
(۱) کیا یہ نسخہ تقریباً کی عبارت کی نو سے ۱۲۵۳ھ میں مرقوم ہوا؟ یا اس کے بعد؟

(۲) کیا یہ نسخہ ان نسخوں میں سے ہے جو نواب فیاض الدین تیر نے مرتب کرائے تھے، مگر بعد میں خود میں کم ہو گئے تھے۔
(۳) کیا یہ وہ نسخہ تو نہیں جس کے متعلق مولانا مرنے لکھا ہے کہ ”ایک شہزادے نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل کی۔“

یہ صحیح ہے کہ تقریباً میں تاریخ موجود ہے۔ افسوس ہے کہ اس نسخے کی تقریباً میں جو تاریخ درج ہے ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرزا غالب کا اردو دیوان ۱۲۵۳ھ = ۱۸۳۸ء میں بھی مرتب ہوا جس کے لیے یہ تقریباً لکھی گئی۔ یہ تقریباً شاید طباعت کے خیال سے پہلی مرتبہ ۱۲۵۳ھ میں ہی لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد جسٹس ایڈیشن مرتب ہوتے رہے ان کے آخر میں یہ تقریباً شامل ہوتی رہی مگر اصلی سن کو باقی رکھا جاتا رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دیوان کے متعدد نسخے جن میں تقریباً ہے ان میں سن تو یہی ہے مگر تعداد اشعار مختلف ہوتی گئی ہے۔ مثلاً دیوان اردو طبع ہول کی تقریباً میں تعداد اشعار ۶۰۷۲ طبع جاتی میں ۱۷۹۳ء پھر اس نسخے میں جو خود مرزا نے ۱۸۸۵ء سے نقل شاید

(۱۸۵۳ء=۱۲۷۱ھ) نواب محمد یحییٰ علی خان دہلی رامپور کے نذر گزارا تھا اس میں کل ۱۲۹۰ اشعار تھے گئے ہیں۔ (ملاحظہ ہو دیباچہ نقلائی ایڈیشن)

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ تقریباً کامل اٹھارہویں صدی یعنی جس نسخے میں یہ تقریباً ہو اور سال بھی یہی درج ہو ضروری نہیں کہ یہ نسخہ اسی سال کا ہو کیونکہ یہ تقریباً اصل سے نقل اور نقل در نقل ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طرح مرزا غالب کا اپنا نسخہ ہوا دیباچہ بھی کیس تو بتیو تدریج ہے، کیس بلاقیہ تدریج۔ رامپور لاہوری کے قلمی نسخے کے شروع میں دیباچے کی تاریخ ذیقعدہ ۱۲۳۸ھ درج ہے (یعنی ۱۸۳۲ء/اپریل ۱۸۳۲ء)۔ (نیز ملاحظہ ہو "مرزا غالب" ص ۱۷۷) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کے دہان کا کوئی نسخہ ۱۸۳۲ء میں ضرور مرتب ہوا ہو گا جس کے لیے یہ دیباچہ مرقوم ہوا۔ بعد میں یہ دیباچہ اکثر نسخوں کے ساتھ شامل ہوتا رہا البتہ بعض نسخوں میں رفع تضاد کے خیال سے سنہ کو حذف کر دیا گیا چنانچہ ہمارا موجودہ نسخہ بھی بغیر تدریج کے ہے، اس لیے اس نسخہ کا زمانہ تدوین (جہاں تک ان شواہد کا تعلق ہے) غیر متعین ہی رہتا ہے۔

اب اس بحث کے فیصلے کے صرف دو طریقے نظر آتے ہیں جن سے مسئلہ شاید آسان ہو جائے گا۔ اول تعداد اشعار سے زمانے کا تعین۔ دوم غزلیات اور دوسرے اشعار کی داخلی شادقوں سے کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ غالب کے اشعار کی تعداد میں برورد وقت اضافہ ہوا گیا ان کا پرانا دہان تو خیر پرانا ہوا اس سے بحث نہیں۔ منتخب دہان کے مختلف نسخوں کے اشعار میں بھی بہت فرق پایا جاتا ہے اور یہ فرق بالکل قدرتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ۱۲۵۵ھ کے نسخے میں تعداد اشعار ۱۰۷۲ ہے، رامپور کے نسخے میں ۱۱۶۰ اور طبع ثانی میں ۱۰۷۳۔ یہ تعداد اشعار کسی حد تک ہر نسخے کے زمانے کے لیے کلیہ کا درجہ رکھتی ہے یعنی کم اشعار والا نسخہ اقدم ہو گا اور زیادہ اشعار والا نسخہ موسر ہو گا۔ اس لحاظ سے موجودہ نسخہ رامپور والے نسخے سے پہلے کا ہونا چاہیے۔

اب ہمارے موجودہ زیر بحث نسخے میں ۱۵۶۸ اشعار ہیں، ان میں ۱۳۳۲ شعر غزل کے ہیں باقی دوسری اصناف کے، میں یہ تو ظاہر ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۳۸ء سے بعد اور ۱۸۵۵ء سے پہلے کا ہو گا مگر ذرا اور کوشش سے ہم شاید صحیح تاریخ کے قریب تر ہو جائیں۔ اس لیے آئیے اس مسئلہ کو دوسری حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کریں۔

شیخ محمد اکرام صاحب نے مرزا غالب کے کلام کی توقیت کرتے وقت ان کے تمام کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پسلادور	۱۸۹۰ء سے ۱۸۹۲ء تک	(رینخت)
دوسرا دور	۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۳ء تک	(فہم خانہ شباب)
تیسرا دور	۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۴ء تک	(بہارِ بچم)
چوتھا دور	۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۵ء تک	(نوائے ظفر)
پانچواں دور	۱۸۹۵ء سے ۱۸۹۶ء تک	(چراغِ محری)

یہ تو مسلم ہے کہ ہمارا یہ نسخہ ۱۸۹۲ء سے بعد کا ہے مگر ۱۸۹۵ء سے کتنے سال پہلے کا ہے؟ اس کے لیے اس کی غزلیات کی چھان بین ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے لیے بہت سی غزلیں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ اس نسخے میں جہاں تک میں سمجھ سکا ۱۸۹۵ء کے بعد کا کلام نظر نہیں آتا۔

۱۸۹۵ء میں خوابِ امیر علی خاں ضمیمہ نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور ذوق، سوسن اور غالب کو بھی اس میں دعوت دی تھی۔ اس مشاعرہ میں مرزا نے جو غزل پڑھی تھی اس کا مطلع یہ ہے۔

نویں امن ہے بیدار دوست جاں کے لیے
رہی نہ طرفِ ستم کوئی آسماں کے لیے

۱۸۹۵ء کی یہ غزل موجود نسخے میں موجود ہے، اس کے علاوہ مذکورہ بالا ادوار میں سے دورِ چہارم (۱۸۹۴ء-۱۸۹۵ء) (نوائے ظفر) کی بھی بہت سی غزلیات اس میں موجود ہیں۔ مگر قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ”ارمغانِ غالب“ میں درج شدہ نوائے ظفر کی سب غزلیات اس نسخے میں نہیں، جو غزلیں موجود نہیں۔ ہم ان کے مطالعہ یہاں درج کرتے ہیں:

”دردِ خویرِ قہر و غضب جب کوئی ہم ساتھ ہوا“

”دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا“

”دونوں جہاں دے کے وہ کبھی یہ خوش رہا“

”ضمیمہ کے مجھ کو قیامت کا انتقال نہیں“

”دل ہی تو ہے نہ سنگ و فشت درد سے بھر نہ آئے کیوں“

”کیسے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کیس“

”گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو“

”قلعہ میں ہوں گر اچھا بھی نہ جا میں میرے شیون کو“

”کسی کو دے کے دل کوئی نوا بچ نکال کیوں ہو“

"دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا"

"دل لیجئے مگر مرے اور میں نکال کے"

"غیر میں مفضل میں ہوئے جام کے"

"پھر اس انداز سے بہار آئی"

"وہا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہنے"

"نکتہ جیس ہے فیم دل اس کو سنائے نہ ہے"

"باز یہ مفضل ہے دنیا مرے آگے"

"کہوں جو حال تو کہتے ہو دعا کہنے"

"روندی ہوئی ہے خاک سرور گزار کی"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"

"لازم تھا کہ دیکھو موارستا کوئی دن اور"

"خوش ہواے بخت کہ ہے کہ آج ترے سرسرا"

"ہاں اے نفس باز سحر شعلہ فضاں ہو"

"سلام اسے کہ اگر بادشہ کہیں اس کو"

"ہاں دلی درد مند دمنہ ساز"

"اے شہنشاہ آمل اورنگ"

"نصرت الہک بہادر مجھے ہلا کہ تجھے"

"اے چار شہید آخر باد صفر چلو"

"اے شاہ جما گیارہ"

مفرقات، رباعیات وغیرہ میں سے جو اس نسخے میں نہیں ان کی فہرست نظر انداز ہوتی ہے کیونکہ ہمارے مقصد کے لیے غزلیات کا حوالہ کافی ہے۔

"نوائے ظفر" کی یہ غزلیات (جو اس نسخے میں نہیں) اس بات کی شہادت دیتی ہیں

کہ اس نسخے میں ۱۸۵۷ء تک کا سارا کلام موجود نہیں جس کا سبب ظاہر یہ ہے کہ یہ نسخہ

اس سے پہلے کا ہے۔ ان غزلوں میں مندرجہ ذیل غزلیات قابل توجہ ہیں:

(۱) "لازم تھا کہ دیکھو موارستا کوئی دن اور"

(۲) "خوش ہواے بخت کہ ہے آج ترے سرسرا"

نمبر (۱) عارف کا مرثیہ ہے۔ عارف کا انتقال ۱۸۵۴ء میں ہوا ہے۔ اس مرثیے کا اس

دیوان میں نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ نسخہ اس سن سے پہلے مرتب ہوا ہو گا ورنہ اتنا اہم کلام اس سے کس طرح خارج ہوتا۔

نمبر (۳) وہ مشہور نظم ہے جس سے ذوق و غالب کے ایک ادبی معارضے کا واقعہ وابستہ ہے (اس کی تفصیل "آپ حیات" میں موجود ہیں) یہ واقعہ شیخ محمد اکرام صاحب کی تحقیق کی رو سے دسمبر ۱۸۵۵ء میں پیش آیا تھا۔ اس اہم نظم کی عدم موجودگی بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ اس نسخے کی ترتیب ۱۸۵۱ء میں یا اس سے کچھ قبل عمل میں آئی ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نسخے میں اگرچہ سہرا موجود نہیں مگر وہ معذرتی قطعہ موجود ہے جو سرے سے وابستہ ہے، یعنی ۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی

اپنا بیاننا خشن طبیعت نہیں مجھے

یہ ایک معما ہے اور میں ہر دست اس معنی کا کوئی حل پیش نہیں کر سکتا۔ دو صورتوں میں سے ایک ہو سکتی ہے 'یا تو یہ قطعہ سرے سے کچھ متعلق نہیں رکھتا یا پھر یہ دیوانِ مکمل نہیں۔

موجودہ حالات میں، میں ان دونوں تضایا میں سے کسی ایک کے متعلق کوئی قطعی رائے پیش نہیں کر سکتا کیونکہ قطعے میں استعارہ سے پڑ غاش کا اشارہ "سہرا لکھا گیا ذرہ اختلال امر" اور "مقطع میں آپنی تھی سخن مسترانہ بات" یہ سب چیزیں موجود ہیں۔ ان باتوں کی موجودگی میں اس کو سرے والے واقعہ سے کس طرح غیر متعلق مان لیا جائے۔ دوسری طرف یہ تسلیم کرنا بھی مشکل ہے کہ یہ دیوان مکمل نہیں۔

بہر حال جو صورت بھی ہو ہم اس کو ۱۸۵۱ء سے بعد کا نسخہ نہیں کہہ سکتے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۱ء میں ہدون ہوا ہو گا۔ ممکن ہے اس کی تدوین اس شہزادے نے کی ہو جس کا ذکر مولانا قمر نے کیا ہے یا کسی اور نے۔ یہ مسلم ہے کہ یہ کوئی خاص نسخہ ہے کیونکہ اس کی کتابت میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے جس سے مرتب کی مرزا کے ساتھ غیر معمولی عقیدت اور محبت کا ثبوت ملتا ہے۔

اس نسخے کی دریافت سے شیخ محمد اکرام صاحب کا قائم کردہ عنوان "نوائے ظفر" دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے یعنی ایک نیا دور قائم ہو جاتا ہے جس کو ہم ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا دور کہہ سکتے ہیں۔ مین ممکن ہے کہ اس نسخے کے گہرے مطالعہ سے کچھ اور انکشافات بھی ہوں مگر ہر دست ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ذریعے کلامِ غالب کی

تاریخی تدوین کی مشکل کسی قدر اور آسان ہو گئی ہے اور ”نوائے ظفر“ کی بہت سی غزلیات کے متعلق (جو اس نسخے میں موجود ہیں) یقینی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء سے پہلے کی ہیں۔“



ڈاکٹر سید عبداللہ مذکورہ مضمون میں بیان کرتے ہیں کہ:

”حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوانہ اردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے۔“

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ سن ۱۸۷۰ء اور سن ۱۸۸۰ء کے مابین داخل ہوا اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کا تعارف شائع کرایا۔ تعارف کے ابتدائیہ یا تمہید میں معین الرحمن نے محل تحریف سے کام لیا اور عبارت کی تخریف کی نشاندہی فقط یا بغیر ڈال کر نہیں کی۔ یہ اصول تحقیق کی خلاف ورزی اور عدم دیانت ہے۔ تمہید کے بعد کی عبارت نقل کی ہے اس میں بھی ”حال ہی میں“ کے الفاظ محذوف کر دیئے ہیں۔ نسخے کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ نے مولانا مہر کی کتاب ”غالب“ ص ۳۸۴ سے ان کی تحریر کا ایک اقتباس دیا ہے اور پھر دو سرا یہ دونوں غالب کے خطوط سے مولانا مہر نے لیے ہیں۔ مولانا ڈاکٹر سید عبداللہ کو اصل خطوط پیش کرنے تھے جن سے یہ بیان مقتبس ہے۔ مولانا مہر نے اپنی کتاب ”غالب“ میں خط بیام فشی شیوہ زائج کا ذکر کیا بھی تو بغیر حوالہ مانغ۔ آپ اصل خط غالب کا ملاحظہ فرمائیے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آ جائے۔ (غالب کے خطوط، از ظلیق انجم،

(۱۰۷۳:۳)

”کیا کہوں؟ تم سے اخیاء الدین خلی جاگیردار لوہارو، میرے بھائی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ جو نظم و نثر میں۔ جس نے کچھ کچھ وہ انہوں نے لے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون بیچین جزو اور بیچ آہنگ اور سر نمرود اور دیوانہ ریختہ سب مل کر سو سو سا جزو مسطور اور مذہب اور انگریزی امیری کی جلدیں الگ الگ کوئی ایک سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ کلام میرا سب ایک جا فراہم ہے۔ پھر ایک شاہزادے نے اس مجموعہ نظم و نثر کی نقل لی۔ اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا۔ کہیں سے یہ قند

(خدا) بڑا ہوا اور شہر لٹے۔ وہ دونوں جگہ کا کتب خانہ خوان بیٹا ہو گیا۔ ہر چند میں نے آدمی دوڑائے، کہیں سے ان میں سے کوئی کتب ہائے نہ آئی۔ وہ سب تھکی ہیں۔“

اس سے قبل حاتم علی بیگ مرکو بھی کتب خانے کے لٹنے کے متعلق لکھا تھا۔
(عقاب کے خطوط، از خلیق انجم، ص ۷۰۷)

”میرا کلام میرے پاس کبھی کبھی نہیں رہا۔ نواب ضیاء الدین خاں اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتے تھے۔ جو میں نے کہا انہوں نے لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے۔ ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کے دیکھنے کو ترستا ہوں۔“

اسی زمانے میں جوسف علی خاں مرزا نے بھی عقاب سے ان کا کلام طلب کیا تو انہیں لکھا: عقاب کے خطوط ۸۶۱:۳

”تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی خدا میں میرا کمر نہیں لٹا مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا؟ کہ نہ تھا۔ بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناصر حسین مرزا صاحب ہندی اور قادری نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے، سو ان دونوں گھروں پر بھانڈو بھر گئی۔ نہ کتب دہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟“
ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان لٹے ہوئے کتب خانوں کا ذکر کرنے کے بعد اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے:

”میرا قیاس ہے کہ اہل اہل کو بر آیدار یعنی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مذکورہ اعداد نسخہ اسی لٹے ہوئے خزانے کا ورثہ ہے ہمارے۔“

سید عبداللہ کا یہ قیاس اس لیے درست نہیں کہ ذرا بحث کرنے میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے۔ اگر یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کا ہوتا تو اس میں ۱۸۵۶ء تک کا کلام ہوتا، جو نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارت گری کا نہیں بلکہ کسی اور انقلاب میں ٹوٹا گیا ہے۔ مصین الرحمن کو اس پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے تلاش و جستجو کرنی تھی جو نہیں کی گئی۔ گمشدگی کے حوالے بغیر کسی مکتبہ کے صرف مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ درج کرنے سے پہلے مصین الرحمن نے سید عبداللہ ہی کے بیان کو اپنے الفاظ میں دہرا دیا کہ ”دیوانی عقاب کا یہ بار نسخہ ۱۸۵۷ء کی ٹوٹ مار اور غارت گری کی بقایات میں

سے ہے "نور کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔"

سید عبداللہ نے جو باتیں دیباچے کے متعلق اپنے مضمون میں بیان کی ہیں وہ غور طلب اس لیے ہیں کہ انہوں نے دیباچے کے لیے دو حوالے دیئے ہیں۔ ایک نسخہ رامپور اور دوسرا نسخہ بانگی پور، مگر بانگی پور والے نسخہ میں دیباچہ بلا تاریخ اور رامپور والے نسخہ میں بھی بلا تاریخ ہے، صرف نسخوں کی تاریخ تکلیف دی ہے جس سے یہ ظاہر ہوا کہ دیباچہ سب سے پہلے نسخہ رامپور قدیم میں شامل دیوان ہوا۔ البتہ مولانا عرشی نے نسخہ رامپور کو ۱۸۳۳ء کا مرتبہ قرار دیا ہے۔ مبین الرحمن نے دیباچے کے متعلق کچھ حصیں لکھا، انہیں سید عبداللہ نے جو حوالے دیئے ہیں، وہ دیباچے کے کس پہلو کو اجاگر کرتے ہیں؟ اور دیباچے کی تاریخ تحریر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ بیان کنی تھی۔

حقیقت حال یہ ہے کہ یہ دیباچہ کلکتہ میں مغل رعنا کے دیباچے کے ساتھ لکھا گیا۔ میں نے اپنی مرتبہ مغل رعنا مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے ص ۱۶ میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ دیباچہ کلیات نثر غالب ص ۵۶ پر چمپا ہے، اس سے پہلے دیباچہ مغل رعنا ہے اور بعد میں خاتمہ مغل رعنا ہے۔ مغل رعنا کے خاتمہ کی تاریخ غرضاً رجب الاول ۱۲۳۳ ہجری خود غالب نے لکھی ہے۔ (نوشہ غالب نمبر: حصہ دوم، ص ۳۲۰) گویا یہ دیباچہ دیوان ریختہ مغل رعنا کے دیباچے کے بعد اور خاتمہ سے پہلے لکھا گیا۔ تاریخ مذکورہ کی مطابقت سن ۱۲۳۵ سے ۱۱ ستمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ کلکتہ ہی سے یہ دیباچہ حکیم احسن اللہ کو بھیجا جس کا ذکر غالب نے اپنے ایک قاری خط میں کیا ہے۔

"سطرے چند کہ بدیا بچی دیوان ریختہ کسوت حرف و رقم پے شیدہ، و دور سودائی کہ بہ آرائش سفینہ موسوم بہ مغل رعنا بہ سودا جو شیدہ است۔ ارمنان ی فرستم و از شرم نک باگی آب ی گردم۔"

(کلیات نثر غالب، ص ۵۰)

یہ دیباچہ تمام تہی و مطبوعہ نسخوں میں بلا تاریخ شامل ہے۔ صرف مولانا عرشی نے ایک نسخہ مولانا نکلائی بدایونی میں تاریخ دیباچہ منقول از مخطوط احمد علی شوق قدوسی ۲۴ ذیقعد ۱۲۳۸ھ (مطابق ۱۵ اپریل ۱۸۳۳ء) لکھی ہے۔ مخطوطے کی کوئی تفصیل نہیں لکھی، نہ کاتب کا نام اور نہ مقام تکلیف بتایا۔ اس لیے یہ تاریخ نہ ترتیب کی ہو سکتی ہے اور نہ دیباچے کی کیونکہ دیباچہ ۱۱ ستمبر ۱۸۴۸ء سے پہلے دیباچہ مغل رعنا کے ساتھ لکھا جا چکا تھا گویا اگر ایک مینہ پہلے کا تصور کریں تو یہ اگست ۱۸۴۸ء کے پہلے مشرو میں لکھا گیا ہو گا۔

مولانا عرشی کی بتائی ہوئی تاریخ اس مخطوطے کے کاتب نے جس دن تکلیت دیباچہ مکمل کی وہ تاریخ لکھ دی۔ یہ تاریخ کسی اور جگہ نہیں درج کی گئی اور یہ تاریخ غالب کے طم میں نہیں تھی ورنہ وہ یہ مطلوبہ نسخوں میں تو ضرور درج کرتے۔

سید عبداللہ نے اس کے بعد نواب محمد ضیاء الدین خاں قیصر دہلوی کی تقریق میں لکھی ہوئی تاریخ و تعداد اشعار سے بحث کی ہے اور اس کی تاریخ تحریر و تعداد اشعار کو غیر مستحکم قرار دیا ہے کہ اس سے مخطوطے کا سن متعین کرنا درست نہیں۔

سید عبداللہ نے اس نسخے کا سن تکلیت متعین کرنے میں شیخ محمد اکرام اور مولانا عرشی سے بھی خط و کتابت کی۔ شیخ محمد اکرام کا کوئی خط اپنے مضمون میں نہیں درج کیا حالانکہ انہوں نے شیخ اکرام کو خط میں کوائف لکھے تھے جس کے بعد شیخ اکرام نے یہ لکھا ہو گا کہ بغیر نسخہ دیکھے ہوئے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مولانا عرشی نے سید عبداللہ کے تحریر کردہ کوائف کی روشنی میں اپنی رائے کا اظہار بذریعہ خط کیا چنانچہ سید عبداللہ نے مولانا عرشی کا خط اپنے مضمون میں نقل کر دیا۔ زیادہ تر بحث دیباچہ و تقریق سے متعلق ہے۔ دیباچہ کی تاریخ پر ہم پہلے بحث کر چکے ہیں مگر مولانا عرشی نے یہاں حوالہ نسخہ برلن میں مندرج تاریخ ۱۳ اپریل ۱۸۴۲ء بتائی ہے۔ ۱۸۴۲ء غلط ہے صحیح ۱۸۴۳ء ہے، شاید یہ تکلیت کی غلطی ہو۔ متعین الرحمن نے اول تو مولانا عرشی کے مضمون خط پر کوئی بحث نہیں کی۔ یہ عمل تحقیق کے خلاف ہے، انیس سن کی درستی کرنی تھی۔

مولانا عرشی نے مختلف دواویں کے سن تقریق و تعداد شمار کے حوالے دے کر اس نسخے کو طباعت دوم ۱۸۴۷ء عیسوی کے بعد مرتب ہونے والا نسخہ قرار دیا ہے اور سن ۱۸۴۷ء اور ۱۸۴۸ء کے درمیان مرتب ہونے والا نسخہ بتایا ہے۔ سید عبداللہ نے مختلف غزلیات کی موجودگی اور عدم موجودگی سے بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "بہر حال جو صورت بھی ہو ہم اس کو ۱۸۵۱ء سے بعد کا نہیں کہہ سکتے۔ تمام قرائن بتاتے ہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۱ء میں عدون ہوا ہو گا۔" سید عبداللہ کا اندازہ غلط ہے، جبکہ اس میں ۱۸۵۲ء کی غزل موجود ہے تو اسے ۱۸۵۲ء کا مکتوب ہی ماننا پڑے گا۔

سید عبداللہ کے بعد اس نسخے کو قاضی عبدالودود نے دیکھا اور اس کے فوٹو بھی حاصل کیے۔ انہوں نے رسالہ نقوش میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہاں نو والے مضمون کے چار سال بعد اپنا ایک مضمون شائع کرایا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

متفرقات

قاضی عبدالودود

(رسالہ "نقوش" لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء، شمارہ نمبر ۷۰-۶۹، ص ۳۰۹-۳۰۸)

مخطوطہ دیوانِ غالب: کتب خانہ دانش گاہ پنجاب میں دیوانِ غالب کا ایک نعلی نسخہ (=پ) ہے جو (شامل صفحہ اول سادہ و دیباچہ غالب و تقریظ تیرہ) ۱۳۸ سطحوں پر مشتمل ہے۔

دیباچہ (ص ۲ تا ص ۱۴) وہی ہے جو نسخہ مرتبہ جنتب مالک رام (=م) ہے مگر پہ میں تاریخ تحریر درج نہیں۔ پہ میں (ص ۳ تا ص ۱۰۶) غزلوں کا آغاز و انجام تم (ص ۳۱ تا ص ۲۸۰) کی طرح ہے اور غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد علی الترتیب ۲۱۶ اور ۱۳۱۲ ہے۔ م میں یہ تعداد علی الترتیب ۲۳۳۳ اور ۱۳۶۰ ہے۔ غزلنامے ذیل پہ سے غیر حاضر ہیں: در غور..... سا..... نہ ہو..... درد..... دوا نہ ہو..... کیوں..... جانی عزیز..... نہیں..... اعتقاد نہیں، دل..... آئے کیوں، بھولا..... کشت کوہ، قفس..... شیون کو، مٹی..... متنگم تو کیونکر ہو، کسی..... فغان کیوں ہو، غیر..... جامہ کے، پھر..... بہار آئی، نکلت..... ستارے نہ بہتے، دیا..... بشر ہے کیا کئے، بانجھ..... دُنیا مرے آگے، کسوں..... دعا کئے، بہت..... کم کیا ہے، روعی..... شیراز کی، ہزاروں..... کم نکلتے۔

مشترک غزلوں کے دو شعر پہ میں صیں ہیں: سبزہ..... النہی نہ ہو، یاں سر پہ شور..... خواب تھا۔ پہ میں ایک شعر ایسا بھی ہے جو تم میں صیں نہ مگر یہ نسخہ شیرازی میں ہے۔

ہو کر شبید عشق میں پائے ہزار جسم!

ہر سوچ گرو راہ مرے سر کو دوش ہے

سے ایک شعر بھی ہے تو غزل قرار دیا گیا ہے۔

سے ایک مصرع کے چند لفظ جن سے ردیف کا قافیہ کامل ہو سکے۔

تصاغر ۳ ہیں (ص ۱۰۶ تا ص ۱۱۷) اور یہ وہی ہیں جو تم میں موجود ہیں (ص ۲۳۳ تا ص ۲۵۹)۔ مانیہ و نوبہ قصیدوں کے عنوان کے لیے دیباچہ تم ص ۱۸ ملاحظہ ہو، قصیدہ مانیہ کا عنوان یہ ہے: ”در مدح شہنشاہ جم جہاں سلیمان ہار گاہ سراج الدین محمد بہادر شہ بادشاہ غازی۔“ جو تھے قصیدے میں ”ایضا“ بطور عنوان مرقوم ہے۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۲۱۳ ہے۔

تغلیات (ص ۱۷ تا ص ۱۲۱) (۱) گئے وہ دن کہ..... الخ (عنوان دیباچہ تم ص ۱۶ میں دیکھا جائے) (۲) گلکتہ کا جو ذکر..... الخ (عنوان دیباچہ مذکور ص ۱۶) (۳) چکنی ڈلی والا قلعہ (عنوان دیباچہ ص ۱۶) (۴) حبشی روٹی والا قلعہ (۵) اے شہنشاہ لک..... الخ (۶) منظور ہے..... الخ۔ اشعار کی مجموعی تعداد ۵۰۔

رباعیات (ص ۱۳ تا ص ۱۲۳) ۱۲ ہیں۔ یہ وہی ہیں جو تم (ص ۲۷ تا ص ۴۹) میں ہیں۔ تم کی آخری ۳ رباعیاں پہ میں نہیں۔

پہ کے کل اشعار ۱۵۳۸ ہیں مگر تقریر میں ”ہزار و پانصد و پنچ واد“ ہے۔

تقریر تیر کی لکھی ہوئی ہے۔ (ص ۱۳۳ تا ص ۱۳۸) اس کا عنوان یہ ہے: ”میدان سیدہ محری از تیرہ شب سواد اور اقی بفر فروغ مستری عبارت تقریر کہ پیدائی آں اثرے است از آثار خرام و لریا برادر بہ دل نزدیک بہ جان برابر“ علی دومان والا گوہر نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ۔ ”کاتب اپنا نام اور زمانہ کنیت بتانے سے قاصر رہا ہے، مرکب لکھا گیا، اس کا ایک حد تک یقین آخری قلم کے زمانہ تصنیف پر غور کرنے سے ہو سکتا ہے۔



قاضی عبدالودود کا یہ شہرہ نہایت جامع ہے۔ میری نظر میں قاضی صاحب کے اس مختصر تعارف میں تین باتیں نکلتی ہیں:

(۱) قاضی صاحب نے دیوان غالب مرتبہ مالک رام سے مقابلہ کیا، جلا کہ انہیں دیوان غالب شیع چارم مطلوبہ مطبع کھلائی کاپیور سے کرنا تھا جو غالب کا آخری تصحیح کردہ ہے۔ اس طرح یہ پتا چل جاتا کہ اس نسخہ میں جو غلطیاں نہیں ہیں وہ غالب نے نسخہ کھلائی میں اضافہ کی ہیں اور یہ نسخہ مطلوبہ کھلائی کاپیور سے اقدام ہے۔ مصنف الرحمن نے اس طرف توجہ

نہیں دی۔

(۳) مشترک غزلوں کے جو دو شعر اس میں نہیں ہیں، وہ طبع اول اور طبع دوم والے نسخوں میں موجود تھے یا نہیں؟ یہ دونوں شعر نسخہ نقای کانپور میں موجود ہیں۔ اس نسخے میں نہ ہونا سو کاتب قرار دیا جاسکتا ہے البتہ یہ شعر:

ہو کر شہید عشق میں پائے ہزار جسم

ہر موج گردہ مرے سر کو دوش ہے

اس نسخے میں ہے، نسخہ نقای کانپور میں نہیں۔ بے شک نسخہ شیرانی میں ہے مگر قاضی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر نسخہ شیرانی کے متن میں ہے یا حاشیہ کا۔ دراصل یہ شعر نسخہ شیرانی کے حاشیہ کا شعر نمبر ۳ ہے (ص ۷۱ الف) گیتا رضائے اسے نمبر دو پر لکھا رکھا ہے اور غیر مطبوعہ ظاہر کیا ہے۔ (دع الیٰ غالب کمال، ص ۲۷۲) مصین الرحمن نے متن کی تشلیق میں یہ شعر شامل نہیں کیا بلکہ متداول شعر۔

نے مژدہ وصل نہ نظارۂ ہجل

دلت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

درج کر دیا ہے۔ یہ متن سے مقابلہ نہ کرنے کی دلیل ہے۔

(۳) زمانہ تحریر کی تعیین کے لیے آخری قطعہ کے زمانہ تصنیف پر غور کرنے پر توجہ دلائی ہے، یہ آخری قطعہ قطعہ معذرت ہے جس کا پہلا شعر ہے:

منظر ہے گزارشی احوال واقعی

اپنا بیانِ خشن طریقت نہیں مجھے

یہ قطعہ معذرت سرے کے سلسلہ میں ہے جو مارچ ۱۸۵۲ء سے متعلق ہے۔ اس طرح یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کا کتبہ ۱۰۱۰ پاتا ہے۔ اس نسخے میں غزل:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ چنایں ہو گئیں

بھی موجود ہے جو اگست ۱۸۵۲ء کی ہے۔ اس طرح یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کا ہے۔ ۱۸۵۲ء کے بعد کا کلام اس میں نہیں پایا جاتا۔ قاضی صاحب کے قول کے مطابق مارچ ۱۸۵۲ء کا ہونا درست نہیں، مصلحت بحث آنکھ کی جانے کی۔

قاضی صاحب کے اس بیان کے بعد مولانا عرشی کے نسخہ دع الیٰ غالب اردو (نسخہ عرشی) طبع اول سے یہ بیان عرشی ہے:

نسخہ لاہور

از امتیاز علی عرشی

اس کی تقطیع ۶x۹x۷۸ انچ ہے۔ متن کا ٹپ ۷/۳ انچ ہے۔ کل مکتوبہ ورق ۶۳ ہیں۔ مسطرہ اسطر کا ہے۔ کلفہ ویسی پارک باوای ہے۔ عام حالت بست اچھی ہے۔ ورق الف پ پر سنہری، سفید، آبی، نیلی، سرخ اور زرد رنگ لوح کے نیچے فارسی دیباچہ شروع ہوا ہے۔ اس صفحے اور اگلے صفحے کے حاشیوں میں پارک اور نازک نظم سے مسطرہ و طون نکل چکی گئی ہے۔ نیز ان دونوں صفحوں کا بین السطور مسطرہ ہے۔ پوری کتب میں چھ رنگ کی جدول ہے۔ ہر دو صفحوں کے درمیان ایک سطر کے ہندو جگ چھوڑی گئی ہے اور اسے رقصین نکل سے بھرا گیا ہے۔ جہاں کہیں آخری شعر کو دو سطروں میں لکھا ہے وہاں دونوں جانب کی جگہوں کو ٹو بھروسہ نکل دونوں سے بھر دیا ہے۔

کتب کا نام اور تاریخ کتابت درج نہیں ہے تاہم خط بتاتا ہے کہ نواب فخر الدین محمد خاں دہلوی کا لکھا ہوا ہے جو میرزا صاحب کے مشہور کاتب تھے۔ روش خط اصولی فن پر پوری ضمیمہ اُترتی، لیکن خط کی یکسانی اور پختگی نے بے حد دیدہ زبانی پیدا کر دی ہے۔ پوری کتب میں فقط "اک" کو "امک" بدون نقطہ لکھا ہے۔ "ت" میں شخصی "ط" کے نیچے دو نقطے بھی لگاتے ہیں۔ "نہ" اور "جگہ" کو "نہ" اور "جگہ" بھی لکھتے ہیں۔ شعر میں ہنر سے کو لفظوں میں لکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ایسی جگہوں میں لفظ کے اوپر ہود کی شکل بھی بنائی ہے۔ مجھ سے تھم سا اور جھکو، جھکو وغیرہ کو بدون حائے غلوٹ اور "منہ" کو عموماً "منہ" اور کبھی "مونہ" لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق عموماً اردو فارسی الفاظ میں ذکی جگہ ذ لکھتے ہیں اور "غرضید" میں واو نہیں لکھتے۔ خوشنمائی اور دفع التباس دونوں کے لیے لفظوں پر اعراب بھی لگاتے ہیں۔

اس نسخے کے مشتملات کی ترتیب سابق نسخوں جیسی ہے۔ چنانچہ ورق سب کی

جو تھی ستر سے دو سری لوح کے نیچے غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ورق ۵۳ ب سے قصیدے، ورق ۵۸ الف سے قطعے اور ورق ۶۰ الف سے رباعیاں شروع ہوتی ہیں۔ آخر میں نیر کی تقریظ ہے، جو ورق ۶۳ ب سے شروع ہو کر ورق ۶۳ ب پر ختم ہوئی ہے۔ اس تقریظ میں نسخہ م کی طرح سال ترتیب دیوان ۱۲۵۲ھ (مارچ ۱۸۳۸ء - مارچ ۱۸۳۹ء) مندرج ہے۔ لیکن اس میں میرزا صاحب کی مشہور غزل: ”سب کہیں، کچھ ایلو و گل میں نمایاں ہو گئیں“ بھی شامل ہے جو دہلی اردو اخبار مورخہ ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں اس تصریح کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتے کے مشاعرے کا کلام ہے، اور ۱۸۵۳ء کی کسی ہوئی کوئی غزل وغیرہ موجود نہیں، اس لیے یہ قیاس کرنا بیجا نہ ہو گا کہ یہ نسخہ ۱۸۵۲ء کے نصف آخر میں مرتب کیا گیا تھا اور تقریظ کی تاریخ ازراہ سوتیل نہیں کی گئی ہے۔

تقریظ میں اشعار کی تعداد ”ہزار و پانصد و پچہ و اند“ (۱۵۵۰) سے کچھ اور بڑھائی ہے۔ میں نے شمار کیا تو ۱۵۳ شعر نکلے جس سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اشعار کے ٹھننے میں بھی احتیاط نہیں برتی گئی تھی۔ اشعار کی تفصیل یہ ہے:

غزلیات: ۶۳۹ قصائد، ۶۶۴ قطعات، ۱۵۰ رباعیات، ۲۳ کل: ۱۵۳۔ الف: ۲۸۳۔
ب: ۶۲۔ ج: ۶۹۔ د: ۳۳۔ ح: ۶۶۔ ز: ۳۰۔ س: ۷۔ ش: ۳۔ ع: ۸۔ ف: ۳۔ گ: ۱۵۔ گ: ۴۔
ل: ۱۹۔ م: ۸۔ ن: ۳۰۔ و: ۳۳۔ ی: ۱۵۔ ۱۳۹۔ کل: ۱۳۹۔

اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے چڑھا ہے اور اکثر جگہ اخلاط کاتب کی اصلاح بھی کی ہے چنانچہ مندرجہ ذیل مقامات پر ان کے قلم کی واضح اصلاحیں موجود ہیں:

- (۱) ورق ۱۰ ب: جس دل پہ باز (تھا) مجھے، وہ دل نہیں رہا
- (۲) ورق ۲۰ الف: گری بزم (ہے) اک رقص شرر ہوتے تک
- (۳) ورق ۲۱ ب: رونق ہستی ہے (مشتق) جانہ ویراں ساز سے
- (۴) ورق ۲۳ الف: آپ بے سہرا (ہے) جو معتقد میر نہیں
- (۵) ورق ۲۵ ب: غلم کر غلم، اگر لطف دریغ آتا (ہو)
- (۶) ورق ۳۷ الف: ساقی گری کی شرم کو آج (ورنہ) ہم
- (۷) ورق ۳۶ الف: ہم رنگ کو اپنے (بھی) گوارا نہیں کرتے

ان میں سے ۳۳ ۳۴ ۳۵ اور ۷ میں جو لفظ بریکٹوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ اصل میں خود میرزا صاحب نے اپنے قلم سے بڑھائے ہیں۔ نمبر ۵ میں کاتب نے ”ہو“ کی جگہ

”ہے“ لکھ دیا تھا میرزا صاحب نے اول کو پھیل کر دو سرائفہ عہ ہے۔ نمبر ۶ میں کاتب نے ”دورنہ آج“ لکھ کر ”دورنہ“ کے اوپر ”خ“ (جو موخر کا نشان ہے) اور ”آج“ کے اوپر ”م“ (جو مقدم کا نشان ہے) بنا دیا تھا۔ میرزا صاحب نے ”دورنہ“ کو ”آج“ کے بعد (دورنہ) اپنے قلم سے لکھ دیا ہے۔

تاہم بہت سی غلطی نقلیں اب بھی موجود ہیں مثلاً:

(۱) ”کیا رہوں غرت میں خوش“ جب ہو حواث کا خیال“ (۳ پ) حالانکہ صحیح الفاظ ”حواث کا یہ حال“ ہیں۔

(۲) ”جلوہ از بیکہ۔۔۔“ مڑ گئی ہو گا“ (۵ پ) جب کہ صحیح روایف ”ہونا“ ہے۔

(۳) ”ورق ۷ پ پر“ ”سوچ“ ۱۰ الف پر ”خورشید“ ۱۲ الف پر ”دھنواں“ اور ۱۸ الف پر ”تغذیر“ ۱۴ پ ہے، جو غالب کے اٹلے کے خلاف ہے۔

(۴) ”نہ سنو کر چرا کے کوئی“ نہ کو کر چرا کے کوئی“ (۳۸ پ) حالانکہ صحیح روایف ”کرے کوئی“ ہے۔

(۵) ”رو گیا خط (میری) چھاتی پر کھلا“ (۷۵ پ) اس میں بریکٹ کے اندر کا لفظ کاتب اور صحیح دونوں سے چھوٹ گیا ہے۔

(۶) ”شہا (کے) آگے دھرا ہے آگے“ (۵۸ الف) یہاں بھی بریکٹ کا لفظ رو گیا ہے۔

(دو ایوان غالب آئروڈ، نسخہ عرشی زادہ، طبع اول ۱۹۵۸ء، دہلی، ص ۸۷-۸۴)



مبین الرحمن نے مولانا عرشی کے بیان سے نقل اپنے تعارف کے ص ۲۵ متن نمبر ۵ میں لکھا ہے:

”نسخہ لاہور کے تحت مولانا امتیاز علی عرشی نے دو ایوان غالب (نسخہ عرشی طبع دوم ۱۹۸۳ء دہلی) کے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے بعض غیر اہم جزوی اختلافات کے ساتھ اپنے مشمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے ذیل نظر نسخہ خواجہ کے کم و بیش عین مطابق ہے۔“

مولانا عرشی کو نسخہ لاہور کے فوٹو کاپی عبدودود نے دیئے تھے۔ جب وہ نسخہ خواجہ کے عین مطابق ہے تو پھر نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور دونوں ایک ہوئے۔ نسخہ عرشی طبع اول

کا اقتباس ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ معین الرحمن نے نسخہ عرشی کا تعارف ہیئت نسخہ لاہور نقل کرنے کے بعد حواشی میں چند غیر اہم اختلافات دیئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں کہ پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ غلط و فہم کا اضافہ ممکن ہے اور ”ہوگا“ کا ”ہوتا“ بنانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ ”خرشید“ اور ”خورشید“ دونوں املا مولانا عرشی نے بنائے ہیں۔

معین الرحمن نے اشعار کے شمار میں مولانا عرشی کی تصانیف کی ہے اور یہ نہیں بتایا کہ یہ غلطی کہاں ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ نسخہ عرشی طبع اول کے اس تعارف میں ردیف ”و“ کی پہلی غزل کے ایک شعر:

از مرآ پذرہ دل و دل ہے آئندہ

غلطی کو شش بہت سے مقلد ہے آئندہ

کو مولانا عرشی شمار کرتا بھول گئے اور یہ ان کا سہوا تھا۔ دوسری غزل کے دو شعر شمار کر لیے اور ردیف ”و“ کے سامنے ”و“ کا ہندسہ لکھ کر مجموعہ اشعار غزلیات ”۲۷“ صحیح لکھا۔ نسخہ عرشی طبع اول، ص ۱۸۶، ردیف وار اشعار کو جمع کیا جائے تو یہی مجموعہ بنتا ہے۔ نسخہ عرشی نقض ثانی میں ردیف ”و“ کی صحیح تعداد ”۳“ تو لکھ دی مگر مجموعہ میں ایک عدد کا اضافہ پھر بھی سوا رہ گیا۔ (نسخہ عرشی نقض ثانی، ص ۱۸۶)

معین الرحمن نے جہاں مولانا عرشی کے ایک شعر کی غلطی شمار کرنے میں بتائی ہے، غزلیات کے اسی گوشوارے کی نقل میں خود ایک بہت بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے کہ ردیف ”ر“ کے اشعار کی تعداد مولانا عرشی نے (صفحہ ۶۹) درج کی ہے مگر موصوف نے اسے چھیانوے (۶۶) بتا دیا ہے اور مجموعہ ۱۵۴ ہی لکھا ہے جو نسخہ عرشی طبع اول میں درج ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندسے حمل حقیقہ کا شمار کاتب کی غفلت سے ہو گئے لیکن تصحیح کرتے وقت معین الرحمن نے صحت نہیں کی۔ اس طرح ستائیس (۲۷) اشعار کا اضافہ ہوا۔ یہ غلطی معین الرحمن کاتب کے سر ڈالنے کی ناکام کوشش کریں گے۔ انہوں نے نسخہ عرشی نقض ثانی یا تو دیکھا ہی نہیں، اگر دیکھا ہے تو مقابلہ نہیں کیا ورنہ ”و“ کے ”۳“ کے بجائے اپنے دیئے ہوئے گوشوارے میں ”۳“ کہاں سے نقل کیا۔ حقیقت و تدوین کی اتنی بڑی غلطی کو کیسے چھپایا جاسکتا ہے۔ مولانا عرشی کی ایک عدد کی غلطی تو نظر آگئی مگر اپنے ۲۷ شعروں کا اضافہ انہیں نظر نہیں آیا۔ یہ اضافہ کیسے فہم کیا جائے گا؟

معین الرحمن نے اپنے تعارف کی فتح نمبر ۱۰ میں دیا اپنی غالب مطلوبہ طبع دوم اور نسخہ خواجہ کا مقابلہ کر کے نسخہ خواجہ میں زاید کلام پر روشنی ڈالی ہے۔ ردیف وار زاید

غزلیات کے اشعار میں قصائد میں شامل دو غزلیات کے اشعار کو بھی شمار کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک نئی روایت قائم کی ہے کہ وہ غزل جو دیگر اصنافِ کلام میں شامل ہو وہ غزلیات ہی کے تحت شمار کی جائے گی، خواہ سیاق و سباق کے مطابق الگ ہی کیوں نہ ہو۔ طرفہ تربت یہ ہے کہ ان کے اشعار غزلیات کے زمرے میں بھی شمار کیے ہیں اور قصائد میں بھی۔ اب ان کا پیش کردہ گوشوارہ زاید غزلیات ملاحظہ فرمائیے۔

”غالب کی درج ذیل جہیں (۳۲) غزلیات پہلی بار ”نسخہ خواجہ“ میں شامل ہوئیں“ اس لیے ان کا زمانہ نگارش مئی ۱۸۸۳ء (دیوانِ غالب طبع دوم) ۶ اور اگست ۱۸۵۴ء (نسخہ خواجہ) کے درمیان خیال کرنا چاہیے:

نسخہ خواجہ صفحہ تعداد اشعار

۱۰	۹-۸	۱- ہزم شمشاد..... و فتر کھلا
۱۱	۱۳-۱۲	۲- یہ نہ تھی..... پیار ہوتا
۲	۱۶	۳- میں اور ہزم سے..... ہوا تھا
۳	۱۷	۴- گھر ہمارا..... دیر اس ہوتا
۳	۱۷	۵- نہ تھا کچھ..... ٹھہرا ہوتا
۱۱	۱۹	۶- ہوئی تاخیر..... تاخیر بھی تھا
۸	۲۲	۷- ذکر اس پر ہی وش کا..... اپنا
۷	۲۳-۲۲	۸- جو رے..... آئیں کیا
۹	۲۹	۹- گھر دب چلیا..... کے بغیر
۱۱	۳۲-۳۱	۱۰- ہے بسک..... نکلیں اور
۱۰	۳۳	۱۱- لازم تھا..... اور
۱۰	۳۷	۱۲- حیراں ہوں..... جگر کو میں
۳	۵۰	۱۳- دو غنوں رحل..... خوش رہا
۸	۵۱	۱۴- وا غم پہنا..... نہیں ہوں میں
۱۶	۵۴-۵۳	۱۵- سب کہیں..... ہو گئیں
۷	۵۸	۱۶- تم جانو..... راہو
۹	۶۸	۱۷- اس ہزم میں..... حیا کیے
۷	۷۲	۱۸- تسکین کو..... نظر ملے

نسخہ خواجہ صفحہ تعداد اشعار

۶	۷۳-۷۴	کوئی دن گر..... اور ہے	۲۹
۱۰	۷۳	کوئی امید نہیں آئی	۳۰
۱۱	۷۳-۷۴	دل تاراں تجھے ہوا کیا ہے	۳۱
۹	۷۵-۷۶	کتنے ہو تم..... آئے	۳۲
۱۰	۸۱-۸۰	حسن نہ کرچہ..... اچھا ہے	۳۳
۱۳	۸۳-۸۴	شکوے کے نام..... ہوتا ہے	۳۴
۱۰	۸۳-۸۴	ہر ایک بات..... کیا ہے	۳۵
۴	۸۴	میں انیس چھیڑوں..... پتے ہوتے	۳۶
۱۰	۹۳-۹۲	حضور شاہ..... آدنا کش ہے	۳۷
۱۰	۹۷-۹۶	ابن مریم ہوا کرے کوئی	۳۸
۹	۱۰۴-۱۰۳	منظور تھی یہ شکل..... ظہور کی	۳۹
۹	۱۰۴	غم کھانے میں..... بہت ہے	۴۰
۷	۱۱	ذہر غم..... بدنام ص ۲۸	۴۱
۹	۱۱۵	کچن میں بیخار ہوں..... در کھلا ص ۲۹	۴۲

غزلوں کے اشعار کی مجموعی تعداد = ۲۷۳

در مدح ظفر غالب کے ”درج ذیل دو قصائد“ نسخہ خواجہ (= اگست ۱۸۵۴ء) ہی میں

پہلی بار شامل ہوئے:

صفحہ	اشعار	
۱۱۳-۱۰۹	۵۸	۱- ہاں نہ نوشتیں ہم اس کلام
۱۱۳-۱۰۹	۸۳	۲- صبح دم دروازہ خاور کھلا

قصائد کے اشعار کی مجموعی تعداد = ۱۴۵

غالب کے ”درج ذیل دو قطعات“ (تعداد اشعار = آنتیس ۲۹) اور یہ دو گزیاں بھی

نسخہ نظر ”نسخہ خواجہ“ ہی میں پہلی مرتبہ شامل ہوئیں:

(۱) (قطعه): اے شمشاد فلک منظر ہے شکل و نظیر (ص ۱۱۸-۱۱۹)

(۲) (قطعه): منظور ہے گزارش احوال واقعی (ص ۱۱۹-۱۲۰)

(۳) (زبانی): حق، شہر کی جتا سے خلق کو شاہ کرے (ص ۱۲۲)

(۳) (ڑباہی): اس رشتے میں لاکھ تار ہوں، بلکہ سوا (۱۲۲)

اس طرح بتیں (۳۳۱) غزلوں، (۵۱) قصیدوں، (۲) ڑباہیوں اور (۳) قطعات کے کوئی چار سو اکتیس (۳۳۱) اشعار کی حد تک کلام غالب کا زمانی تعین، نسخہ خواجہ بی کی مدد اور مستند حوالے سے ممکن ہوتا ہے۔ یہ اس نسخے کی ایک بڑی وجہ فضیلت اور اہمیت ہے۔

(مخلوطے کا تعارف، ص ۳۸-۳۹)

معین الرحمن نے دیوان کی تحسین (۳۰) غزلوں کے بعد قصائد میں شامل دو غزلوں کو آخر میں لکھ کر غزلوں کی مجموعی تعداد بتیں (۳۳۱) لکھی ہے۔ اگر ان دو غزلوں کو دیوان کی غزلیات میں شامل کر لیتے تو کیا ہی اچھی بات ہوتی۔ پہلے قصیدے کی غزل کو ردیف نیم میں اور دوسرے قصیدے کی غزل کو ردیف الف میں درج کرنا تھا مگر دشواری یہ تھی کہ متن میں تو ان کا اندراج اس لیے نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دیوان کی غزلیات کو شتعلیق کر رہے تھے۔ دیوان کی غزلیات میں یہ قصیں نہیں تو ان کو وہاں کس طرح درج کرتے اور اندراج کی گنجائش کیسے نکالتے؟ البتہ گوشتارہ میں شامل کر لیتے مگر قادی جب دیوان میں ردیف کے اشعار گنتا تو تعداد و شمار زائد پا کر گنتی کو غلط کہتا۔ اس لیے آسانی اسی میں خیال کی کہ ان کے اشعار کی تعداد کو آخر میں لکھ دیا اور تعداد اشعار غزلیات دو سو ہجرت (۲۷۲) لکھ دی۔ حالانکہ دیوان میں شامل غزلیات کے اشعار کی تعداد دو سو ستون (۲۵۷) ہے مگر انہوں نے گوشتارے میں درج غزل نمبر ۳ کے اشعار کی تعداد دو لکھی ہے جبکہ صحیح تعداد تین (۳) ہے۔ اس طرح دو غلطیاں کہیں۔ ایک تو غزل کے اشعار کی تعداد غلط لکھی دو سرے غزلیات کے اشعار کی مجموعی تعداد بھی یہ شمول تعداد اشعار غزلیات قصائد غلط لکھی گئی۔

یہاں تک تو غزلیات کی تعداد کی بات ہے۔ اب آئیے قصائد کی طرف تو پہلے قصیدے کے کل اشعار اٹھاون (۵۸) ہیں جن میں سات شعر غزل کے بھی شامل ہیں۔ حالانکہ حاشیے میں لکھا ہے کہ ان کو قصیدے میں شمار نہیں کیا۔ اگر غزل کے اشعار کو شمار نہ کیا جائے تو تعداد اکیاون رہ جاتی ہے۔ مگر شمار کیا گیا تبھی تو گوشتارے میں تعداد اشعار اٹھاون (۵۸) لکھی گئی۔ یہ سو تو کاتب کا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ تو مرتب کی غفلت اور غیر حاضر دماغی کی الجھ بھکاری ہے۔

دوسرے قصیدے میں اور بھی زیادہ عجیب خیز بات یہ ہے کہ قصیدے کے کل

اشعار تراسی (۸۳) گوشوارے میں درج کیے ہیں۔ متن میں شمار کیا گیا تو تعداد تینتالیس (۳۳) ہے۔ یہ چالیس (۴۰) شعر کہاں سے آئے اور کہاں غائب ہو گئے، اس کا علم مصنفین الرضیٰ ہی کو ہو سکتا ہے۔ قاری گوشوارہ کا اور متن کا موازنہ کرتا ہے تو چالیس شعروں کے فرق پر حیران رہ جاتا ہے۔ غزل کے نو (۹) شعر گھٹائیں تو چوترا (۴) اشعار رہ جاتے ہیں۔

قصائد کے اشعار کی کل تعداد ایک سو پچیس (۱۳۵) نکلی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ گوشوارہ کے مطابق اشعار (۵۸) + تراسی (۸۳) کا مجموعہ ایک سو اکتالیس (۱۳۱) ہوتا ہے۔ سولہ (۱۶) کا فرق ہوا شاید بلا اندراج غزلیات قصائد کے اشعار سات (۷) + نو (۹) = سولہ (۱۶) کو ۱۳۱ (ایک سو اکتالیس) میں سے گھٹا کر مجموعہ ۱۳۵ (ایک سو پچیس) بنالیا گیا ہے۔ یہ اعداد و شمار کی بوجھیں کیسے حل کی جاسکتی ہیں؟ حل مصنفین الرضیٰ ہی بتا سکتے ہیں۔

درحقیقت پہلے قصیدے میں اشعار مع اشعار غزل ہیں اور دوسرے قصیدے میں تینتالیس اشعار مع اشعار غزل ہیں۔ جن کا مجموعہ ایک سو ایک (۱۰۱) بنتا ہے۔ مصنفین الرضیٰ مجموعہ ایک سو پچیس (۱۳۵) لکھتے ہیں۔ یہ چوبیس (۲۴) زائد اشعار کہاں سے آئے اور کہاں گئے؟ اس کا جواب یا ہوا مصنفین الرضیٰ کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔ دو قطعات کے اشعار اکتیس (۲۹) دو ڈیڑھوں کے چار شعروں کا مجموعہ تینتیس بنتا ہے۔ غزلیات، قصائد، قطعات اور ڈیڑھیوں کے کل اشعار کا مجموعہ لحاظ متن ۳۲۳ (چار سو تینتیس) بنتا ہے مگر مصنفین الرضیٰ لکھتے ہیں:

”اس طرح تیس غزلوں، دو قصیدوں، دو ڈیڑھیوں اور دو قطعات کے کوئی

چار سو اکتیس (۳۲۱) اشعار کی حد تک کلام غالب کا زبانی قصین نقی خواجہ کی مدد

اور مستند حوالے سے ممکن ہوتا ہے۔“

(تعارف ص ۲۰)

مصنفین الرضیٰ نے اشعار کی چار سو اکتیس (۳۲۱) کتنی نکلی ہے۔ وہ بالکل غلط ہے۔ یہ کتنی بظاہر متن و ابواب درست نہیں ہے۔ البتہ ان کے درج کردہ گوشوارہ کے مطابق ہے۔ یہ گوشوارہ ملاحظہ فرمائیے اور مصنفین الرضیٰ کی ذہانت کی دلدور دیجئے۔

اشعار لحاظ متن
صفحات ۳۸ تا چالیس

اشعار لحاظ متن

۲۷۳

کل اشعار غزلیات = ۲۵۷

۱۲۵

کل اشعار قصائد = ۱۲۱

(۴۹) تعداد عبارت میں درج کی مگر قطعات

کل اشعار قطعات = ۴۹

(۳) نوڈ باعیات کے سامنے درج نہیں کی۔

کل اشعار باعیات = ۳

۳۳۱

کل میزان = ۳۳۱

متن اور گوشوارے کا فرق دیکھئے تو آپ کو اشعار کی تنقیہ میں چالیس اشعار رائج نظر آئیں گے۔ یہ چالیس شعر کہاں سے آئے اور ان کا اندراج متن میں کہاں ہے؟ اس کہیں ٹرکے دور میں جمع کرنے میں اتنی بڑی لفظی واقع ہوئے ایک قصب خیر امر ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز و قصب خیر مصین الرحمن کا یہ بیان ہے جس سے ان کی فن ادب اور نظم و نثر کی اقسام سے واقفیت بدرجہ اتم ہو رہا ہے۔ اپنے تعارف کے صفحہ ۱۸ پر لکھتے ہیں:

”اصلاً متن کے اشعار کی قطعی تعداد ۱۵۳۸ بنتی ہے۔ ”قطعات“ کے

منظوم فارسی عنوانات کو شمار کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر ہو جاتی ہے۔“

متن میں تین قطعات کے عنوانات کو کاتب نے دو سطری لکھا ہے۔ یہ دو سطری انداز تحریر عموماً شعر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی انداز تحریر سے مصین الرحمن کو انتہاں ہوا اور وہ ان کو ”منظوم فارسی عنوانات“ سمجھ بیٹھے اور ان کو شہیل اشعار کر لیا۔ یہ عنوانات چونکہ دو فارسی کے معنی جملے ہیں جن میں قافیہ کی رعایت کا لحاظ ہے۔ ان کو اگر منظوم قرار دیا جائے تب بھی ان کا شمار اشعار میں نہیں ہو سکتا۔ اشعار میں شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں شعری خیال کیا ہے۔ ورنہ ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر تعداد کیسے بنتی ہے؟ پہلے عنوانات ملاحظہ فرمائیے:

”قطعہ در فائنش عنوان دلاویزی گفتار

و آسنان آردن اندوہ چشمنی بر دل دلداد“

اس میں ”گفتار“ اور ”دلداد“ ہم قافیہ ہیں۔ کوئی وزن نہیں ہے۔ کیونکہ منظوم میں وزن شرط ہے۔ معنی جملوں میں صرف قافیہ کی شرط ہے۔ وزن کی نہیں۔ گفتار کے بعد دلا

عطف کو لانا نثر ہونے کی ایک دلیل قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف نثر محقق کے دو مربوط جملوں پر مبنی عنوان ہے جسے کاتب نے ہر جملے کو لحاظ قافیہ ایک ایک سطر میں اوپر نیچے لکھ دیا ہے۔ یہ انداز تحریر ہی وجہ التباس ہے۔

”چمن سرمایہ کردن گفتار بتائش نکلت

اگر فردوس نتوان گفت ارم است البتہ“

یہ بھی مثل قلعہ اوتی کے ہے۔ ”نکلت“ اور ”البتہ“ ہم قافیہ ہیں۔ کوئی وزن نہیں ہے، کاتب نے لحاظ قافیہ دو سطروں میں لکھا ہے۔ اگر وہ نثری انداز میں لکھتا تو شعر کا التباس نہ ہوتا

”با دوست از سپاس عطائے بد یہ سخن راندن

و محتاج گزید؛ سخن در برابر آں افشاندن“

اس میں بھی ”افشاندن“ اور ”راندن“ ہم قافیہ ہیں، کوئی وزن نہیں ہے۔ اس کو بھی کاتب نے دو سطری بلند از شعر لکھ کر ایک قسم کا التباس پیدا کر دیا ہے۔ اسے نثری انداز میں لکھتا تھا۔ اگر کلمات نثری انداز کی ہوتی تو التباس کا شکار نہ ہوا جاتا۔ مصنف الرحمن اسی کلمات کے انداز سے التباس کا شکار ہوئے اور لکھ دیا کہ ”قطعات کے منظوم فارسی عنوانات کو شمار کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ اوپر ہو جاتی ہے۔“ جتنا کہ تین قطعات کے عنوانات کو شمار کر لیں تو تعداد ۱۵۵۱ ہوتی ہے۔ ”کچھ اوپر“ لکھنا اس بات کی قیادی کرتا ہے کہ ان کے ذہن میں قصائد کے عنوانات اور خانہ کی عبارت کو بھی اشعار میں شمار کرنا تھا لیکن ان کی سطور کے آخر میں قافیہ نہیں تھا۔ گو کاتب نے ان کو بھی دو سطری انداز میں لکھ کر شعر کا مدپ دیا ہے۔ اگر یہ بھی محقق ہو تیں تو مصنف الرحمن ان کو بھی شعر شمار کر لیتے اور اس طرح چار اشعار کا مزید اضافہ ہو جاتا اور اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۵ تک پہنچ جاتی اور تحقیق کا ایک کارنامہ انجام پاتا۔ انیسویں کے غالب نے ان عبارات کو محقق میں دیکھا اور مصنف الرحمن چار اشعار کا اضافہ کرنے سے محروم رہ گئے۔ غالب چاہتا تو ان کو بھی محقق بنا سکتا تھا۔

پسلا قصیدہ حضرت علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے جس کا عنوان کاتب نے دو سطروں میں لکھا ہے

”افرائق آہوئے سخن گوہر بخش بہ ثنائے

ابوالاسم حضرت علی مرتضیٰ علیہ التحیہ والثناء“

کیونکہ ان دونوں سطروں میں قافیہ کا لحاظ نہیں۔ اس لیے شعر نہیں بنایا، مگر معصوم زہنی شعری رہا۔ کیونکہ ککسٹ کا انداز شعری انداز ہے۔ اسی طرح بہادر شاہ کے مدحہ قصیدہ کی عبارت کو بھی کاتب نے دو سطروں میں لکھا ہے:

”در مدح شہنشاہ جم جاہ سلیمان ہارگاہ
سراج الدین محمد بہادر شاہ پادشاہ غازی“

اس دو سطری عنوان کو بھی ککسٹ کی وجہ سے شعر قرار دیا جاسکتا تھا۔ غالب چاہتا تو اسے با آسانی مقلی کر سکتا تھا۔ اگر وہ اس کو معقلی کر دیتا تو ککسٹ اور قافیہ کی بنا پر معین الرحمن اسے بھی اشعار کے زمرے میں شمار کر لیتے۔ مگر ذہن میں شعری رہا۔ کاتب نے غلامہ کی چو سطری عبارت کو بھی شعری انداز میں چار سطروں میں لکھا ہے:

”مدیدن سپید سحری از تیرہ شب سواد اوراق بفر فردغ مصتری
عبارت تقریر کہ پیدائی آں اثریست از آثار خرام غلامہ
دکڑا برادر بہ دل نزدیک بجاں برابر علی دودیں والا کمر
لواب خیام الدین خاں بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ“

اس چو سطری عبارت کو پانچ انداز شعر لکھا گیا ہے۔ غالب اس عبارت کو معقلی بڑی آسانی سے بنا سکتے تھے مگر ککسٹ میں کئی سطریں بن چاتیں۔ کاتب نے بھی اس کو ککسٹ تو شعری انداز میں مگر رعایت قافیہ ملحوظ نہیں رکھی۔ اس لیے معین الرحمن نے اس کو بھی اشعار میں شمار کرتے ہوئے نال سے کام لیا ورنہ یہ بھی دو شعر بن جاتے۔ اس طرح چار شعروں کا اضافہ لازماً ہو جاتا۔ ”۱۵۵۰ء سے کچھ اوپر“ لکھا جاتا ان کے معصوم زہنی کا عکاس ہے۔ ورنہ حتیٰ تعداد ۱۵۵۱ لکھنے میں کیا قباحت تھی اور کون سا امر ملح تھا؟ کیونکہ یہ تین عبارتیں جن کی ککسٹ کا انداز تو شعری تھا، مگر قافیہ کی عدم موجودگی نے مجبور کر دیا۔ اگر قافیہ ہوتا تو معین الرحمن ان کو بھی اشعار کے زمرے میں شمار کر لیتے۔ اسی وجہ سے قصائد و غلامہ کا ذکر نہیں کیا صرف قطعات کا ذکر کر دیا۔

اندراج متن کے بعد اضافات کی پہلی شق ”انسان واد کلام غالب کی توقیت“ کے پہلے پیرا کراف میں معین الرحمن نے بڑی اہم باتیں بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”زیر نظر نسخے (نسخہ طوابع) میں شامل غالب کی قدیم ترین نگارش

۱۸۱۳ء کی ہے۔ اس کا زمانی تعین غلامی کے نام غالب کے ایک خط (سورخ

۲ جولائی ۱۸۱۲ء) سے ہوتا ہے۔ دہلی الی غالب (اردو) کا قدیم ترین

دستیاب غلطی نسخہ ۱۸۱۶ء کا مکتوب ہے۔ یہ تمام و کمال غالب کے اپنے خط /
 حکم سے لکھا ہوا ہے۔ غالب نے یہ نسخہ مولانا امتیاز علی عرشی کے بقول مشک
 ۱۳ رجب ۱۲۳۱ھ کو تمام کیا، جو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء کے مطابق ہے۔ (مقدمہ، نسخہ
 عرشی، طبع دوم دہلی ۱۹۸۳ء صفحہ ۸۵) اس نسخے کی ساری غزلیں، قصیدے،
 قطعات و رباعیات وغیرہ گویا حد سے حد ۱۱ جون ۱۸۱۶ء تک کے زائیدہ فکر
 ہیں۔ اس غلطی نسخے (۱۸۱۶ء) کے حاشیوں پر کچھ غزلیں وغیرہ بڑھائی گئی ہیں۔
 یہ اضافہ غالب کے قلم سے نہیں ہے۔ ان اشعار کو اس نسخے کے اتمام و
 تکمیل (۱۸۱۶ء) کے کچھ بعد کا کلام خیال کرنا چاہیے۔

معین الرحمن نے غالب کے جس خط نام علانی مورخہ ۲ جولائی ۱۸۶۴ء کی بنا پر
 جس کلام کو ۱۸۱۴ء کی قدیم ترین نگارش قرار دیا ہے وہ غلطی ہے چینی نہیں ہے۔ غالب نے
 علانی کو اپنے طویل خط میں اس غزل کے متعلق یہ لکھا ہے:

”پچاس برس کی بات ہے کہ اٹنی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین بنی نکال۔ میں نے
 حسب القلم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے ادک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ:

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
 کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے
 اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت
 الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنائی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔
 مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اور کے۔“

(غالب کے خطوط، ۳۸۵۹)

غالب کی یہ پانچ شعری غزل دیا ان غالب مطبوعہ مطبع لکھنؤ میں ہے۔ حیدر
 حید ورق سادہ نمبر ۳، ص ۲۸۶ پر، شیرانی کے متن ص ۸۸، الف پر اور نسخہ عرشی ص ۲۴
 اور ص ۲۹ پر چھ شعری ہے۔ بعد میں ایک شعر:

یہ کون کہوے ہے آباد کر ہمیں لیکن
 بھی زمانہ مرا دلی خراب تو دے

خارج کر کے پانچ شعر پر قرار رکھے۔ غالب نے خارج کردہ شعر کا ذکر اسی لیے نہیں کیا۔ مولانا عرشی نے حاشیہ میں وہ پوری غزل صاحب عالم کے روزنامے سے نقل کی ہے۔ (نسخہ عرشی م ۱۲۹۰) جس میں خارج کردہ شعر بھی شامل ہے۔ اس طرح غالب کا یہ کتا کہ ”مقتل“ اور ایک شعر میرا ”بالکل درست ہے۔

دہرے حلق اعظم معین الرحمن نے غزل کے مطلوبہ مطلع کا یہ مصرعہ ”وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے“ لکھ کر پوری غزل کو ۱۸۷۲ء کا قرار دیا ہے۔ کیونکہ خط نام ملاتی ۱۸۷۲ء میں غالب نے اندازاً پچاس برس کی پخت ہے لکھا۔ انہوں نے اس کو حقیقی، حسی اور فحشی خیال کر کے ہاتھ میں سے پچاس کو گنتا کر بدھ لکھ دیا۔ جلتا کہ ان کے مرشد مولانا عرشی اور ان کے گرد گھومتا رخصانے بعد از ۱۸۸۱ء لکھا ہے۔ حمید اور شیرانی میں خارج کردہ شعر کا نمبر ۳ ہے مگر گھومتا رخصانے اسے نمبر ۵ پر رکھا ہے۔ نمبر ۵ پر رکھنے کی نکتہ بندی کسی ماخذ سے نہیں کی۔

نسخہ امروہہ (بیاض غالب، نسخہ عرشی زوہ) کا سن کتابت سب سے پہلے میں نے بدلائل معین کیا جس میں علم حیات کے طریقہ سے سن کتابت کی تعیین ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ مطابق ۸ جون ۱۸۱۶ء سے کی ہے۔ (انروہ نمبر ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳

”خوش قسمتی سے اس (طبع دوم) کا ایک نسخہ ۱۹۳۷ء کے بعد ایک براتی کتابیں بیچنے والے سے بھی مل گیا ہے۔ اس میں صفحات ۵ تا ۳۰ تو نہیں لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کے آخری سادہ اوراق پر مرزا صاحب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے اس دوج ان کی اشاعت کے بعد کہا تھا۔“

مولانا عرشی نے اس بارہ کی ترتیب بھی بتائی ہے اور اسے اختلاف نسخ میں جگہ دے کر اس کے وقوع ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ گویا آخر میں مندرجہ کلام مستند ہے۔ مگر مصین الرحمن اس کے متعلق اختلاف پہلی حق ”اسلاف دار کلام غالب کی توقیت“ ص ۲۹۹ میں یوں رقم طراز ہیں:

”دوج ان غالب کے دوسرے ایڈیشن (۱۸۸۳ء) کا ایک مطبوعہ نسخہ ۱۹۳۸ء میں مولانا امتیاز علی عرشی کو ایک براتی کتابیں بیچنے والے سے ملا۔ یہ ناقص ہے۔ اس میں صفحات ۵ تا ۳۰ سرے سے موجود ہی نہیں۔ عرشی صاحب کے بقول اس کے آخری سادہ اوراق پر غالب کا وہ کلام نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے اس دوج ان کی اشاعت (۱۸۸۳ء) کے بعد کہا تھا۔ ناقص بحول الاسم ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اندراج کب کیا گیا۔ اب یہ ایڈیشن کہیں محفوظ بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا۔ اس لیے اس اندراج پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔“

مصین الرحمن نے مولانا عرشی کے بیان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نسخہ خواجہ کی اہمیت جتنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے بیان کے آخر میں اس کا اکتہار ان الفاظ میں خود ہی کر دیا ہے ”یہ سارا کلام زیر نظر نسخے، نسخہ خواجہ کا اضافہ و امتیاز ہے۔“ مولانا عرشی کے بیان کو غیر وقوع قرار دے کر نسخہ خواجہ کو اہم بنا کر اس لیے زہب نہیں دینا کہ طبع دوم والے نسخہ میں اضافہ جس نے بھی کیا اسے جس ترتیب سے کلام ملا گیا وہ گھستا رہا۔ درست اگر وہ کہیں سے نقل کرنا تو ترتیب بدلی ہوئی ہوتی۔ مثلاً قطعہ ”اے شہنشاہ... عدیل الخ“ بالکل آخر میں ہوتا اور غزلیات ”یاں ہوتا؟ غدا ہوتا؟“ روایت الف میں ہوتیں۔ مولانا عرشی کی شبہات استنباط کے باوجود اس پر بھروسہ نہ کرنا مصین الرحمن کی حیرت انگیز برأت ہے۔

مولانا عرشی نے ۱۹۳۷ء کے بعد اس کا ملتا لکھا ہے۔ مصین الرحمن نے اسے ۱۹۳۸ء بنا دیا۔ مولانا عرشی نے کوئی حقیقی سن نہیں لکھا۔ ان کو صرف اتنا یاد رہا کہ یہ نسخہ ۱۹۳۷ء

کے بعد ملا۔ بعد کو ملنے سے یہ کب ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۳۸ء میں ملا۔ ممکن ہے کہ یہ مدت نسخہ عرشی طبع اول ۱۹۵۸ء کی درمیانی مدت کے کسی سن میں ملا ہو۔ مولانا کو ۱۹۴۳ء کے بعد ملنا یاد رہا صحیح سن ان کے ذہن میں محفوظ نہیں رہا۔ مصین الرحمن نے ۱۹۴۸ء کو حتیٰ سن کس بنا پر قرار دیا؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شاید یہ حتیٰ سن اس لیے قرار دیا ہو کہ مولانا عرشی کو یہ نسخہ پر اپنی کتابیں بیچنے والے ہی سے ملا تھا اور مصین الرحمن کو بھی نسخہ خواجہ (نسخہ لاہور) ایک پر اپنی کتابیں بیچنے والے ہی سے ملا تھا اور اس کا سن یافت ۱۹۸۱ء کے پس و پیش بتاتے ہیں۔ حتیٰ سن کیوں نہیں؟ ملائکہ آج کل کتاب کی خریداری یا بیچنے والے والی کتاب تاریخ درج کر کے اپنے دخل خط کرنے کا عام رواج ہے۔ اس نسخہ خواجہ پر مصین الرحمن کے نہ دخل خط ہیں اور نہ تاریخ خریداری وغیرہ۔ آخر اس کی کوئی تو وجہ ہوگی۔

قاضی عبدالودود پنجاب یونیورسٹی سے اس نسخے کے فوٹو ۱۹۵۷ء میں لے گئے اور مولانا عرشی کو دے دیے۔ ۱۹۶۹ء میں جب مصین الرحمن اشاریہ غالب مرتب کر رہے تھے تو انہیں یہ نسخہ نہیں ملا اور لاہوری والوں نے بتایا کہ سید عبداللہ کے نام پر جاری ہے اور ان کے پاس ہے۔

مصین الرحمن اشاریہ مرتب کرتے وقت ڈاکٹر سید عبداللہ کی طرف رجوع کر کے اشاریہ میں اس نسخے کے کوائف درج کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ تو لاہور میں موجود تھے۔ مصین الرحمن تو لاہور سے باہر کے حضرات سے غالب پر لکھنے والوں سے ان کے مضامین کی فرمائش منگا منگا کر اپنے اشاریہ میں درج کر رہے تھے۔ اس نسخے کے کوائف ان سے مل کر درج نہ کرے ایک کوتاہی ہے۔

مصین الرحمن نے اپنے ایک مکتوب میں رشید حسن خاں کو لکھا ہے کہ ”میرا احساس ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو دہان غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں۔“ اگر فی الحقیقت دو نسخے تھے تو ایک تو سید عبداللہ کے پاس تھا وہ سرا تو لاہوری میں ہوتا۔ اس کے کوائف بھی اشاریہ میں کیوں درج نہیں کیے؟ اگر ہوتا تو یقیناً اشاریہ میں درج کرتے۔ درج نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ہی نسخہ تھا یہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام جاری ہوا تھا۔ ان کے احساس کی اساس کس داخلی ثبوت پر مبنی ہے؟ یہ بیان نہیں کیا۔ مصین الرحمن کا یہ کہنا ”ایک وہ (نسخہ) ہے جسے قاضی عبدالودود نے دیکھا اور جسے عرشی صاحب نے ”نسخہ لاہور“ بتایا ہے۔۔۔ اس سے مختلف دو سرا نسخہ وہ تھا جسے ڈاکٹر

سید عبد اللہ نے متعارف کر لیا ہے۔ ”مبین الرحمن کے اس بیان کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالب کے اردو دوج ان قلمی کے دو تذکرہ نسخے ہوئے اور تیسرا ان کا مرتب کردہ نسخہ خواجہ ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

”نسخہ خواجہ نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا تو اہم ضرور ہے۔ لیکن یہ سید عبد اللہ کے نسخے سے مماثل مگر اس سے مختلف ہے۔“

ایک نسخہ کو دوسرے کا قوام بنانا اور دوسرے کا مماثل مگر مختلف قرار دینا بڑی عجیب بات ہے۔ یہ تو خلیعت کو وحدانیت کا درجہ دینے والی بات ہوئی، مگر عقیدہ ان کے الگ الگ ہونے کا کوئی قطعی و حتمی ثبوت سامنے نہ آئے اس وقت تک ان کی مماثلت ایک ہی ثابت کرتی ہے۔ اہل نظر کی اکثریت تینوں کو ایک ہی بتاتی ہے۔ ”مبین الرحمن نے رشید حسن کے نام اپنے خط میں لکھا ہے کہ:

”نسخہ خواجہ کے بارے میں میرا پختہ یقین ہے کہ یہ غالب کی نظر سے گزرا ہے اور اگر یہ آپ کے ابتدائی اندازے کے مطابق مبین میں نسخہ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے تو پھر اس کے بارے میں عرشی صاحب کا مشاہدہ یہ ہے کہ اندرونی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ اسے اول سے آخر تک میرزا صاحب نے پڑھا ہے اور اکثر جگہ غلط کتابت کی اصلاح بھی کی ہے۔“

مولانا امتیاز علی خان عرشی مرحوم نے جن سات مقامات پر غالب کے قلم کی گواہی دی ہے، وہ ساتوں صورتیں ”نسخہ خواجہ“ میں بھی من و عن موجود ہیں۔“

مبین الرحمن کے اس اعتراف کے بعد نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کے ایک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ مولانا عرشی جسے نسخہ لاہور کہہ رہے ہیں، اس کے تفسیر قاضی عبدالودود، غلاب یونورشی لاہور کی لاہوری سے لے کر مجھے اور مولانا عرشی تک پہنچائے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ان تین مروجہ نسخوں کو غالب نے ایک ہی من میں کس لیے لکھوایا؟ اگر یہ غالب نے لکھوائے تو انہیں کسے کسے اور کہاں کہاں بھیجایا؟ اس کا جواب ”مبین الرحمن کے پاس کچھ نہیں اور اس کا اپنے تعارف میں کہیں بھول کر بھی ذکر نہیں کیا۔ اس پہلو پر ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی نے بھی توجہ نہیں کی اور نہ یہ جستجو کی کہ غالب نے اپنا اردو دوج ان کے کسے کسے بھیجایا؟ غالب کے فارسی اور اردو خطوط میں دو اور جی بھیجے کا ذکر موجود ہے۔ ”مبین الرحمن کو تو اس پہلو پر توجہ دینی چاہیے

تھی۔ یہ تحقیق کی کوئی ہے کہ انہوں نے اس پہلو کو پیش نظر نہیں رکھا۔ اگر یہ سب حضرات غالب کے خطوط میں اس امر کی جستجو کرتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ غالب نے اپنے قلمی و مطبوعہ دواوین کے کے پیچھے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

گل رحمان مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر مرتب کی تو انہیں ضرور دی ہوگی۔ ٹکڑی رحمان سے پہلے کے دو قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ حیدرہ دو سرائف شیرانی۔ ان دونوں کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا۔

غالب کا اردو دیوان پہلی مرتبہ دہلی میں مطبع سید المطالع میں ۱۸۳۱ء میں چھاپا دوسری مرتبہ ۱۸۳۷ء میں مطبع دارالسلام دہلی میں اور تیسری مرتبہ مطبع احمدی دہلی میں ۱۸۶۸ء میں چھاپا۔ انہی تین طباعتوں کے نسخے متعدد حضرات کو بھیجے گئے جن کا ذکر فارسی خطوط میں ہے۔ تو سین میں صلیفہ نیرکیات نثر غالب مطبع نو کشتور کانپور ۱۸۸۸ء مطبع چندام کے درج کر دیئے گئے ہیں۔

(۱) ہجر جان جاگوں (۱۷۷۳) (۲) شہزادہ سلطان محمد خاں میسوری (۲۳۹) (۳) امین الدولہ آغا علی خان (۱۸۴۱) (۴) شیخ امام بخش علی (۱۷۷۳) (۵) مولوی سراج الدین احمد خاں (۱۸۴۰) (۶) نواب علی بہادر خاں (۲۳۳) (۷) سلطان زادہ بشیر الدین میسوری (۲۳۳) (۸) نواب مختار الملک نائب دہلی حیدر آباد (۲۳۶)

قلمی نسخے صرف دو حضرات کو لکھوا کر بھیجے گئے (۱) مداراجہ سب پور (۲) نواب یوسف علی خان دہلی رامپور۔

غالب نے نسخہ رامپور کے متعلق فشی شیونرائی کو بالتفصیل لکھا۔

(غالب کے خطوط، ۱۸۸۱ء)

”اب تم سنو! دیوان رنیتہ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے نذر سے پہلے لکھوا کر نواب یوسف علی خان بہادر کو رامپور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دہلی سے رامپور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لے کر اس کو کسی کاتب سے لکھوا کر مجھ کو بھیج دیجئے۔ میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بہ سبیل ذاک ضیاء الدین خاں کو دہلی بھیج دیا تھا۔“

یہ نقل فشی شیونرائی کو بھیجی جسے انہوں نے ۱۸۶۳ء میں اپنے مطبع واقع آگرہ میں چھاپا۔ یہ دیوان کی طباعت بیہم ہے۔ یہ دیوان مرتبہ ضیاء الدین خاں پر مبنی ہے۔ گویا

اس میں ۱۸۵۷ء تک کا کلام شامل ہے۔ اس کی ترتیب اصنافِ خنّی دوسرے مطلوبہ نسخوں سے مختلف ہے۔ اس لیے یہ نسخہ اہلری بحث سے خارج ہے۔ نسخہ لاہور میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے اس کے بعد کا نہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ۱۸۵۲ء تک کے کلام پر جتنی کون سا نسخہ ہے؟ جملہ محققین کی مختلف رائے ہے کہ نسخہ لاہور میں ۱۸۵۲ء تک کا کلام ہے، بعد کا نہیں۔ معین الرحمن بھی اپنے مرتبہ دیوانِ غالب موسوم بہ نسخہ خواجہ میں اسی سن تک کا کلام بتاتے ہیں تو نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور ایک ہی قرار پاتے ہیں۔ ہم اس کو نسخہ جے پر کے نام سے متعارف کراتے ہیں کیونکہ اس نسخے کے علاوہ اور کوئی قلمی نسخہ کسی اور کو نہیں بھیجا گیا۔ اس نسخے کے متعلق جملہ کارروائی خطوط میں ملاحظہ فرمائیے۔

غالب اس زمانے میں بڑی ملی مشکلات میں مبتلا تھے۔ بے حد مقروض تھے۔ ان کی ملی مشکلات دور کرنے میں ان کے بہادر احباب، شاگرد، اعزاء و اقربا بھی کوشش رہے۔ سب موقع خود بھی امداد کرتے اور امداد کے دیگر ذرائع بھی تلاش کرتے رہے۔ غالب خود بھی امداد طلب کر لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے ایک شاگرد بابو جانی بانگے لال نے کئی مرتبہ ملی مدد کی ہے۔ چنانچہ خطوطِ مہم خشی ہر گوبال تختہ میں ان کی امداد کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں ان کا ایک مخلص دوست نے بے پور سے لکھا کہ اخبارِ سلطانی میں تمہارا ہر کلام پہچتا ہے، راجہ اسے پڑھتا اور پسند کرتا ہے۔ اگر تم اپنا دیوان راجہ کی نذر کرو تو دو چار ہزار بطور صلہ مل جائیں گے۔ اس دوست کی تحریر کا غالب نے اس خطِ مہم ہر گوبال تختہ میں ذکر کیا ہے:

”یکے از دوستان یک دستگے از بے پور بہ من نوشت کہ راجہ جو اس دولت جو اس سال مختار ترا ہرچہ از روئے اخبارِ سلطانی پوسے رسیدہ است عزیز میدارد و ترای خواہد۔ بدل کستم از من کہ دریں باب از دوستان و یکگان مضافتہ نمی کستم، باوایی ہے پورچہ اور پنج رود۔ نخست بہ بابو صاحب ششم، کہ میخوانم دیوان رنختہ بایک عرضداشت شوقیہ ارمغان راجہ سلطان نشان کردن..... اگر وکیل ریاست ہے پور رابر آں می توانید آورد کہ ارمغان مرا بہ خوش گاہ صدارت رساند من آں جزوے چند باورق کہ نامہ نام دارد، شما فرستم۔ چون بابو صاحب پدیرفتند آں نسخہ را بلع و ہدول و جلد چنانکہ بہ پیشکش ارزد آراستم۔“

غالب کا کلام سراج الاخبار وغیرہ میں چھپتا تھا۔ اخبار سلطانی سے بھی اخبار مراد ہے۔ اس کے علاوہ اردو اخبار دلی میں چھپا کرتا تھا۔ چنانچہ غالب کی یہ غزل ”مٹلیاں ہوئیں“ نہیں ہوئیں۔ اردو اخبارات ۱۸۵۲ء میں ۲۸ اگست ۱۸۵۲ء میں چھپی تھی اور یہی اخبار سلطانی میں بھی۔ یہ غزل چارہ کر راجہ خوش ہوا ہو گا اور غالب کی تعریف کی ہو گی۔ مجلس دوست نے راجہ کی پسندیدگی اور دلچسپی دیکھ کر لکھا ہو گا کہ راجہ کی خدمت میں اپنا اردو دیوان بھیجو۔ اس تحریک و ترغیب پر انہوں نے ستمبر کے آخر میں اپنا دیوان بطور تحفہ و نذرانہ پیش کرنے کے لیے کاتب کو دیا ہو گا۔ اس نے آخر نومبر میں دیوان غالب کی حسب خطا لکھ کر دیا ہو گا۔ کیونکہ خط مذکورہ کے بعد تقہ کو ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کو لکھا ہے:

”صحاف کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا۔ آج کل آجائے گا۔ پھر اس کے جزو ان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا۔“

(غالب کے خطوط: ۷۵: ۲۳)

غالب نے دیوان عمدہ کاتب سے لکھوایا جس کی لوح منقش اور جودیس رنگیں بنوائیں۔ صحاف نے عمدہ جلد بنا کر دیوان، غالب کو دیا۔ غالب نے اس کے لیے عمدہ جزو ان تیار کرایا۔ جب دیوان مجلس کے لائق ہو گیا تو اسے ۱۷ دسمبر ۱۸۵۲ء کو پیر جلی ہائے لال کے پاس بھرت پر بذریعہ پارسل بھیج دیا کہ اسے کسی محنت کے قوسل سے راجہ کی خدمت میں پیش کرادیں۔ چنانچہ تقہ کو ۱۹ دسمبر ۱۸۵۲ء کو تریل دیوان کے حلق لکھا:

”پرچہ و ذکر روز آئینہ مخدوم و ممبریود، دیوان رنگت باعزضداشت
موسومہ راجہ سلطان نشان دراجیرتخت پایو صاحب رواں داشت شد، تا
کے رسد و پس از رسیدن چہ روئے دید، در آرائش آن اوراق نگ دلی
نمودہ ام، شست زرے بھرف آورده۔ ہم کتاب زرنگار و ہم جزو ان نظر
فریب۔“

(بلخ دود: ۲۹۵)

غالب دیوان کا پارسل پہنچنے کی اطلاع ملنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار ۳ جنوری ۱۸۵۳ء کو دیوان کا پارسل پہنچ جانے کی اطلاع ملی تو تقہ کو لکھا:

”نہاں ممانا کہ امروزہ شنبہ چہارم جنوری آغاز سال محسوی است۔
ساجے بر نیم روز گزشتہ باشد کہ سرہنگ ذاک آمد و نامہ شاد نامہ پایو صاحب

آورد۔ بند غم گسست و آرا مل صورت بست۔ ہمیں قدری خواہم کہ
رسیدن پارسل بد انتم۔“

(پارخ دور: ۱۸۵)

غشی نبی بخش حقیر کو بھی دیوان کا پارسل پہنچنے کی اطلاع ۸ جنوری ۱۸۵۴ء کو دیتے
ہوئے لکھا:

”ہاں صاحب! اجیر سے خط آگیا۔ پارسل پہنچ گیا، تردد رفع ہو ا۔ اب جو
کچھ ہوتا ہے، وہ ہو رہے گا۔ کل تشویش و تردد نہیں۔“

(تذرات: ۳)

غالب کے لیے سب سے پورا کا معاملہ ایسا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ جلد ملے ہو جائے۔ وہاں
سے کچھ مل جائے تو فرض سے بکدوش ہو جائیں۔ دیوان ابھی راجہ کی خدمت میں پیش
نہیں ہوا تھا۔ جانی جی نے راول شیو سنگھ کے ذریعہ راجہ کی خدمت میں دیوان پیش کرایا۔
اس کا حال قند کو لکھا ہے:

”ذاک کا ہر کارہ آیا۔ جانی جی کا خط لایا۔ اس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور
ہو کہ خلاصہ اس کام کو لکھوں۔ یہ قند لکھا۔ خلاصہ بطریق ایجاز یہ ہے کہ
مرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجہ صاحب
دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا مسد اللہ
خاں دکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ حکمران اب کا ہے۔“

(خطوط غالب از مر: ۳۹)

غالب اس معاملے کے ملے ہونے کا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ گھر چچ میں
ایسے واقعات درجش آئے کہ صلہ ملنے میں رکاوٹیں پڑتی رہیں اور وہاں سے صلہ کی رقم
جو ملنے والی تھی، اس کے حلق حرد تھے۔ غشی نبی بخش حقیر کے خط میں قند کو لکھا:

”ہاں بھائی صاحب! اب میں جدا خط کیا لکھوں۔ ضرور یاد کر کر غشی
ہر کو پال صاحب کو میری دعا کو۔ اور یہ کہو کہ بھائی وہ تو میں تم کو اطلاع
دے چکا ہوں کہ اپنی راج سب سے چرے ہر دو سنگھ سے بعد ہوئی رخصت
کرنے کا وعدہ کیا ہے..... نہیں معلوم کہ رخصت عمل میں آئی یا نہ آئی۔
اگر آئی تو جانی جی شاید اجیر میں نہیں بھرچہ رکھے ہوئے ہیں۔“

(تذرات: ۳۳)

غالب ہندوی آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی عالم میں چار دن بعد قذافی کو خط لکھا اور ہندوی کے متعلق یہ لکھا:

”یقین ہے کہ آج کل میں پایہ صاحب کا خط مع ہندوی آ جاوے گا۔“

(خطوط غالب از مر: ۳۳)

آخر کار انتظار کی گزریاں ختم ہوئیں۔ غالب نے یہ خط قذافی کو ۹ جون ۱۸۵۳ء کو لکھا تھا۔ اس کے بعد ۱۳ جون ۱۸۵۳ء کے خط میں ہندوی ملنے کی خبر دی جس سے معلوم ہوا کہ ہندوی ۳ جون کو انہیں مل گئی تھی۔ ہندوی سے روپیہ وصول پانے اور ان کے خرچ ہونے کی تفصیل قذافی کو لکھی ہے:

”جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہر دیو سنگھ کی مرضی اور بچپن کی رسید اور پانسو کی ہندوی پہنچی۔ تم بھگے! پایہ صاحب نے بچپن ہر دیو سنگھ کو دیئے اور مجھ سے مجرا نہ لے۔ بہر حال ہندوی بارہ دن کی میعاد کی تھی، چہ دن گزر گئے تھے، چہ دن باقی تھے مجھ کو صبر کس؟ مئی کاٹ کر روپے لے لے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا“ بہت بیکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے خوش خانی میں موجود ہیں۔“

(خطوط غالب از مر: ۳۵)

آپ نے اس نسخہ سے پور کی روداد ملاحظہ فرمائی۔ سید عبداللہ کاظمی عبدالودود اور مولانا مرثی نے ان خطوط کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ حیرت ہے کہ اس وجہ ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی طویل داستان سترہ خطوط میں مندرج ہے۔ خطوں کی یہ تعداد معمولی نہیں کہ ایک آدمی میں ذکر ہو اور ذہن میں نہ رہے۔ ان تینوں حضرات نے نسخہ کا معمولی تعارف کرایا۔ گہرائی میں نہیں گئے جیسا کہ خود سید عبداللہ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ ہم نے بھی ان سترہ خطوط میں سے کچھ کے ضروری اقتباسات درج کیے ہیں ورنہ پورے خطوط دیکھے جاتے تو مضمون بہت طویل ہو جاتا۔ طوالت سے بچنے کے لیے ہم نے ایسا ہی مناسب سمجھا۔ آپ زیادہ تفصیل ان خطوط میں ملاحظہ فرمائیے جو بلخ و دور، نارایت غالب، خطوط غالب از مر اور غالب کے خطوط از طبعی انجم میں موجود ہے۔

بڑے تعجب کی بات ہے کہ اتنے خطوط و ملاحظات کی موجودگی میں مصنفین الرحمن نے اس نسخہ کی تدوین کرتے وقت یہ نہیں سوچا کہ یہ نسخہ کون سا ہو سکتا ہے؟ اس کی وجہ

صرف یہ ہے کہ بجز مولانا مراد کسی نے بے پور سے پانسو روپے ملنے کا ذکر نہیں کیا اور وہ بھی سرسری طور پر۔ پانسو کی رقم بطور صلہ دیوان نہیں بلکہ بطور اعداد ملتی بتاتی ہے۔ (غالب از مز: ۳۲۸) اس وجہ سے کسی محترم محقق کا خیال ان خطوط کی طرف مبذول نہیں ہوا کیونکہ اس طرف اشارہ نہیں کہ یہ رقم بطور صلہ دیوان مذکور ملی تھی۔ اس لیے مصنف الرحمن کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔ حق قدس جب ادا ہوا کہ از خود نسخہ کی حقیقت معلوم کرتے۔ نسخہ کے متعلق ان کے تمام تر بیانات سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا عرشی کے بیانات کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ ان کے بیان کے خلاف عمل ملتا ہے۔ مثلاً قاضی عبدالودود نے ایک شعر کی شکایت کی ہے کہ یہ خطوط میں ہے حداول میں نہیں۔ نستعلیق کرتے وقت خطوط میں موجود شعر کو چھوڑ دیا اور حداول کا شعر نقل کر دیا۔ ایسا صرف اس وجہ سے ہوا کہ نسخہ عرشی یا کسی اور دیوان سے وہ شعر نقل کر دیا جو حداول میں تو ہے مگر مذکورہ نسخے میں نہیں ہے۔ الحب الحب۔ اسے کہتے ہیں کورانہ تقلید۔ یہی حال لوح، جدول اور منقش ہو۔ نہ کا ہے۔ نہ لوح کی کوئی صراحت ہے اور نہ نقوش کی وضاحت اور نہ کمال، پورے اور بیلوں کی حالت و کیفیت بیان کی ہے۔

میں نے نسخہ شیرانی کی منقش و رنگین لوح اور عود ہندی کے سلوہ نقشین سرورق کے نقل پونوں وغیرہ پر تفصیلاً روشنی ڈالی ہے۔ مصنف الرحمن ان دونوں سے رہنمائی حاصل کر سکتے تھے اور مذکورہ نسخہ کی کیفیات ترغیب بیان کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اول تو انہوں نے ان تین بزرگوں نے جو کچھ لکھا اس کو نقل کر دیا اور اپنی دید و دانست سے کچھ نہیں لکھا۔ دوسرے یہ کہ وہ خطاطی و ترغیب و آرائش کے فن سے عملاً اور محلاً بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ وہ روش قلم اور تزئینی گلکاریوں کے انداز کو نہیں جانتے۔ ان کے فرق و اختلاف کو نہیں پہچانتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس نسخہ کی بہت کوئی تفصیلی بات لوح کی کیفیت اور اس کے نقوش کی حالت کے متعلق نہیں لکھی۔

ہمارے پیش نظر اصل خطوط نہیں اس کے عکس ہم ملے ہیں۔ تاہم لوح کے متعلق ایک واضح بات ثابت ضروری سمجھتے ہیں اور یہی بات اس کو نسخہ بے پور ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ متعدد خطوط کی الواح دیکھنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مسلمان کے لیے لکھا گیا ہے اگر تو اس کی ابتداء میں مسلمانوں میں حبرک کلمات لکھے جاتے، خواہ وہ لوحیں منقش ہوں یا سلوہ ہوں، نسخہ شیرانی کی لوح منقش ہے۔ اس

کے تعویذ میں یا پھوٹی محراب میں "یا قح" لکھا ہوا ہے۔ اس سے نیچے دو سطر کے برابر منقش پٹی ہے۔ اس کے بعد ایک چوڑی پٹی میں "رب یر" سرخ روشنائی سے اس کے بعد سیاہ روشنائی سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" لکھا ہے اور اس کے بعد "و تعظم بالخیر" بھی سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ پٹی کی زمین سفید اور نقل جگہ میں زمیں قوس نمائش اور شاخص ہیں۔ اس کے بعد ایک منقش پٹی ہے جس کی زمین سنہری ہے، جس پر نقل نمائی گئی ہے۔ پھول سرخ ہیں۔ اس کے بعد غزلیات شروع ہوئی ہیں۔ نسخہ اسودہ رقم بیاض غالب مطبوعہ نقوش لاہور غالب نمبر حصہ دوم اکتوبر ۱۹۶۹ء میں نسخہ کی ابتدا بھی "یا علی المرتضیٰ علیہ وعلیٰ اولادہ الصلوٰۃ والسلام" پہلی سطر اور دوسری سطر "یا حسن، یا حسین" اور تیسری سطر "ابو العلیٰ میرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ" سے خود بقلم غالب لکھی ہوئی ہے۔ سولانا عرش نے نسخہ عرش حنفی حنفی میں یہی ابتدا یہ دیا ہے۔ مگر انہوں نے "ابو العلیٰ" لکھا ہے۔ صحیح لفظ "ابو العلیٰ" ہے، ابو العلیٰ مکمل ہے۔ غالب نے گو اس میں ان کا نقطہ نہیں لگایا مگر لکھ دیا ہے۔ بلکہ فن شعر "ابو العلیٰ" ہی صحیح ہے۔ ثار احمد فاروقی نے نقوش کے اسی شمارے میں "بیاض غالب" کے زیر عنوان مضمون لکھا تو اس میں "ابو العلیٰ" لکھا ہے۔ مگر جب نسخہ تحقیق کیا گیا تو اس میں "ابو العلیٰ" ہی لکھا ہے۔ (ص ۱۵۱) یہ تحقیق کرنے والے کی غلطی ہے۔

ان دو خطوط کی طرح دیگر خطوط میں بھی یہی عمل ہوا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ نسخہ ہے پورا نسخہ لاہور اور نسخہ خواجه کی منقش لوح کے تعویذ یا پھوٹی محراب اور اس کی حقیقی پٹی میں کوئی حبر کہ نہیں اور دونوں کو نقوش و نگار سے کیوں مزین کیا گیا ہے۔ اگر غالب نے معین الرحمن کے احساس کے مطابق کئی نسخے کھوائے تھے تو وہ کسے کسے نذر ہے۔ معلوم یہ کہ تک تو صرف ایک نسخہ کھوانے کا ذکر خطوط میں اور وہ صرف مبارکہ ہے پور کی نذر کرنے کی خاطر نہایت اہتمام سے نقوش و مزین مع محمد جزدان پیش کرنے کا تذکرہ خطوط میں ملتا جاتا ہے اور اس کی تجارتی میں معقول رقم صرف کی گئی۔ یہ کئی دلی بات صرف اپنے مقبوضہ و عدونہ نسخہ کی اہمیت جتانے کی خاطر ہے۔ ورنہ معین الرحمن کئی بونے کا ثبوت داخلی و خارجی ذرائع سے پیش کریں۔ صرف احساس و قیاس سے یہاں کام نہیں چلے گا۔ خارجی ذرائع یعنی غالب کے فارسی و اردو خطوط صرف ایک نسخہ کے کھوانے کی شہادت مہیا کرتے ہیں اور وہ مبارکہ ہے پور کو نذر کیا جانے والا نسخہ ہے۔ داخلی شہادت نسخہ کی لوح میں کسی حبر کہ لفظ یا جملہ کا نہ لکھا جاتا ہے جس

کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے کسی حبرک لفظ یا جملے کا لکھنا اس لیے مناسب خیال نہیں کیا کہ وہ یہ نسخہ ایک غیر مسلم کو بطور نذرانہ پیش کر رہے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ حبرک لفظ یا لکھ پڑھ کر راجہ کی طبیعت پر ناگوار اثر پڑ گیا تو صلہ کا معاملہ کشائی میں پڑ جائے گا۔ اس لیے انہوں نے اسی میں بہتری خیال کی کہ صرف منقش ہی رکھا جائے۔ اگر کسی مسلم کی پیشکش کا معاملہ ہوتا تو وہ حبرک الفاظ ضرور لکھتے۔ اگر یہ نسخہ کسی مسلمان کے لیے لکھوایا ہوتا تو تب بھی لوح میں حبرک کلمات ضرور لکھے جاتے۔ کلمات خیر و برکت کی عدم موجودگی سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی غیر مسلم کے لیے لکھوایا گیا۔ ایسا معاملہ صرف مہاراجہ سے ہر کے ساتھ پیش آیا۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ نسخہ بے پر ہے۔

سید عبداللہ نے اپنے مضمون مطبوعہ ۱۹۵۳ء میں لکھا ہے کہ حال ہی میں یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں داخل ہوا ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تقسیم ہند عمل پائے ہوئی۔ اس کے بعد بھارتی حکومت نے ریاستوں، جاگیروں اور زمینداروں کو ختم کیا۔ اسی کی ذمہ میں ریاست سے پرہیز بھی آئی۔ وہاں انتظامی تبدیلیاں ہوئیں اور بہت سے ملازمین کو ہر طرف یا تبدیل کیا گیا۔ اس کی بدولت وہاں افرائقہری چلی۔ کوئی ضابطہ نہ رہا۔ ریاست کی بیشتر اشیاء جو جس کے ہاتھ لگیں، لے اڑا۔ اسی افرائقہری کے زمانہ میں یہ نسخہ دیوان خانبہاؤ پیش قیمت جزدان میں قہہ کسی کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جزدان اور منقش جلد اور اس کے ساتھ سادہ اوراق کو دور کیا۔ نہ معلوم ان اوراق پر کیا کیا لکھا ہو گا۔ الغرض اس نسخہ کو لے کر وہ پاکستان آگیا اور پنجاب یونیورسٹی میں فروخت کے لیے پیش کر دیا۔ اس پر کسی شخص کا نام نہیں تھا اس لیے اس لنڈ منڈ منقش نسخہ کو پنجاب یونیورسٹی نے خرید کر لائبریری میں داخل کر دیا۔ سید عبداللہ نے اس کا تعارف مضمون لکھ کر کرایا۔ قاضی عبدالودود نے اس نسخہ کے ٹکس ۱۹۵۷ء میں لاہور میں حاصل کیے۔ یہ ٹکس یقیناً سید عبداللہ کی شکایت اور تعلق سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔ بھارت پہنچ کر یہ ٹکس ۲۵۰۰۰ اختیار علی خاں عرشی کو بھیج دیئے۔ انہوں نے "نسق لاہور" کے نام سے اس کا تعارف اپنے دونوں دیوان خانبہاؤ (نسق عرشی) کے مقدمہ میں کر دیا۔ قاضی عبدالودود نے ۱۹۵۸ء میں ایک مضمون لکھا۔ مولانا عرشی نے بھی اسی سن میں مقدمہ دیوان میں تعارف لکھا اور قاضی عبدالودود کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے نسخہ شیرانی اور اس نسخہ کے ٹکس دیئے۔ اس طرح اس نسخہ لاہور کے تین گواہوں کی گواہیاں موجود ہیں۔ لوح اور صفحہ ۲ الف کا ٹکس سید

عبداللہ نے شائع کرایا تھا۔ اس کو جب مزمور نسخہ خواجہ کے نقش سے ملایا تو بالکل مطابق پایا۔ ہمیں سرسوقیات نظر نہیں آئی۔ عین عین دونوں ایک ہیں۔ معین الرحمن جو جزوی اختلافات متن و شمار اشعار کے بتاتے ہیں تو سید عبداللہ سے گفتی میں غلطی ہوئی۔ مگر خود معین الرحمن نے متن اور شمار اشعار میں کتنی غلطیاں کی ہیں؟ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ قتی اختلافات تو باآسانی پیدا کیے جاسکتے ہیں مگر لوح کی کیفیت نقوش و دیگر متغیرات سطور میں کوئی تبدیلی نہیں اور اگر یہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ تھا تو کچھ تو فرق ہوگا۔ فرق کا نہ ہونا دونوں کو ایک ثابت کرتا ہے جو فی الحقیقت نسخہ ہے پور ہے۔ وہاں سے کوئی اڑا لایا۔ گویا پہلی مرتبہ یہ چرایا گیا اور لاہور بچا گیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے سید عبداللہ نے اسے اپنے نام جاری کرایا، تعلیفی مضمون لکھا۔ ۱۹۶۸ء میں معین الرحمن نے اشارہ یہ غالب لکھا تو انہیں بتایا گیا کہ یہ نسخہ سید عبداللہ کے پاس ہے۔ غالباً سید عبداللہ اسے مرتب کر کے چھاپنا چاہتے ہوں گے اور کسی وجہ سے وہ ایسا نہ کر پائے۔ اس کے بعد یعنی ۱۹۶۸ء کے بعد اس کا پتہ نہیں کہ کہاں گیا اور کیا ہوا؟ ہر حال لاہوری میں موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ سید عبداللہ کے پاس سے یا لاہوری سے اسے کسی نے اڑا لیا، گویا یہ دوسری مرتبہ چرایا گیا۔

مزمور نسخہ خواجہ کے آخری صفحہ پر نیری تقریر کے خاتمہ کے بعد متغیر حصہ پر چوں سچ کسی مظلوم شخص ”فتے دین، فتح دین“ کے ہم کی بھیگی لگی ہوئی ہے۔ بھارہ یہ اعداد ملکیت کے لیے ہے۔ ملکیت کا اعداد مولا ابتدا میں کیا جاتا ہے۔ اس کا اعداد آخر میں بھی لگا کر کرنا کچھ عجیب سی بات ہے۔ صفحہ الف جو سادہ ہے اس پر یہ لکھا جانا چاہیے تھا۔ یہ بھی ظاہر کرتی ہے کہ ”کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے“ معین الرحمن کی تحقیق کی پہلی منزل اس بھیگی کو ہٹا کر اصل حقیقت معلوم کرنی چاہیے تھی جو انہوں نے نہیں کی۔ یہ اس امر کی گواہی کر سکتی ہے کہ معین الرحمن کو اس بھیگی کی حقیقت کا علم تھا اور اس کے پیچھے جو راز پوشیدہ تھا وہ اسے بھی جانتے تھے۔ پہلی ہوئی بھیگی کا چھڑنا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا جبکہ آج کل واک کے ٹکٹ جمع کرنے والے طلبہ تک لفاظوں سے ٹکٹ آبی عمل کا عمل تبخیر کے ذریعہ باآسانی اچھی حالت میں ادا کر لیتے ہیں تو پھر معین الرحمن جیسے ”ذریعہ تحقیق“ کے لیے یہ کون سا دشوار کام تھا؟ انہوں نے صرف اس وجہ سے اس بھیگی کو الگ نہیں کیا کہ اس کے ہٹ جانے سے وہ پوشیدہ امر ظاہر ہو جاتا ہے وہ راز رکھنا چاہتے تھے اور جسے کسی ”فتے دین، فتح دین“ کے ہم کے سادے چھپایا گیا تھا۔

اس نسخہ پر کئی افتادیں پڑیں۔ پہلی افتاد اس کی پچکٹش کے سلسلہ میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ خطوط غالب (قاری و اردو) میں موجود ہے۔ دوسری افتاد ہے پور میں تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ ریاست ہے پور سے کوئی اڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ تیسری افتاد: لاہوری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمن کے ہاتھ آیا۔ یہ مسودہ نسخہ اب نسخہ مقبوضہ معین الرحمن ہے، جسے انہوں نے ”نسخہ خواجہ“ کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ طباعت اور پچکٹش اچھی ہے۔ مقدمہ و تحارف اور مثنوی نستعلیق میں غلاماں پائی جاتی ہیں۔ مختلف اہل الرائے نے اسے اور مولانا مرثی کے بتائے ہوئے نسخہ لاہور کو سن دین ایک قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ نسخہ ہے پور سے جس کا ثبوت غالب کے سترہ فارسی و اردو خطوط میں موجود ہے۔

الحاصل یہ نسخہ ہے پور ثم نسخہ لاہور، ثم نسخہ خواجہ ایک ہی خطوط کے مختلف نام ہیں جو مسودہ ہوتے ہوئے اب مقبوضہ ہو گیا۔ معین الرحمن نے اسے اپنے قبضہ میں لے کر اس کی بازیافت کی اور نسخہ خواجہ کے نام سے چھاپ دیا۔ بحوالہ یہ مقبوضہ ہونے کے باوجود مسودہ ہی رہے گا۔

خواجہ منظور حسین مرحوم مشہور انگریزی کے عالم کے نام سے منسوب کر کے ”نسخہ خواجہ“ کہنا اس لیے ذہب نہیں دتا کہ خواجہ منظور حسین نہ اس کے مالک تھے کہ ہوجہ ملکیت اس کے نام سے منسوب ہوں جیسے حافظ محمود شیرانی کی ملکیت ہونے کی وجہ سے ”نسخہ شیرانی“ مشہور ہے اور نہ یہ مرحوم کا مدونہ ہے جیسے مولانا امتیاز علی خاں مرثی کا مدونہ دیوانہ غالب ”نسخہ مرثی“ کہلاتا ہے۔ عقیدت کا اظہار بذریعہ احتساب کیا جاتا ہے، مرحوم کے نام سے موسوم کرنا تو مرحوم کی صراحتاً ہذا مذم ہے۔ وہ ان کے نام معنون کر سکتے تھے، جس کا اظہار انہوں نے ”میرے کرم فرما“ کے زیر عنوان منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرنے کے ساتھ کیا ہے۔ کیا معین الرحمن ”منسوب“ اور ”موسوم“ کے فرق کو نہیں جانتے؟ کتنی عجیب بات ہے جس کے نام سے موسوم کیا جائے، اسی کے نام سے منسوب بھی کیا جائے۔ یہ خواجہ صاحب سے اعتقاد عقیدت کا کوئی اچھا طریقہ نہیں، بالخصوص اس حالت میں کہ نہ وہ مالک تھے اور نہ مرتب۔ مرحوم کے طبعی مرتبہ کو اس سے جھجک پہنچتی ہے اور معین الرحمن اس عجیب و غریب حرکت کے مرتکب ہوئے، یہ مرحوم کی توہین و تحویل کا سبب بھی بن سکتی ہے۔



دیوان غالب نسخہ خواجہ ... اصل حقائق

از ڈاکٹر جمین فراقی

اور _____

دیوان غالب نسخہ خواجہ صحیح صورت حال

از ڈاکٹر معین الرحمن

ایک تقابلی جائزہ

ڈاکٹر عارف ثاقب

دیوان غالب نسخہ خواجہ - اصل حقائق از ڈاکٹر حسین فراتی

----- اور -----

دیوان غالب نسخہ خواجہ - صحیح صورت حال از ڈاکٹر مصین الرحمن

---- ایک تقابلی جائزہ ----

ڈاکٹر مصین الرحمن کا مرتب کردہ دیوان غالب "نسخہ خواجہ" (اصلاً نسخہ لاہور) چھپ کر منظر عام پر آیا تو صحنِ علم و ادب میں ایک شور مچا ہوا۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس کی شدت کو بہت سے سچے محققین نے محسوس کیا۔ مسئلہ ایک دیوانِ غالب کے "نسخہ مسودہ" کا تھا جو درحقیقت پنجاب یونیورسٹی لاہور لائبریری کی ملکیت تھا مگر وہ وہاں سے کسی دستِ گستاخ نے غائب کر دیا تھا۔ اگر یہ نسخہ غالب ہی رہا تو اس "کسی دستِ گستاخ" کا سراغ نہ ملا۔ مگر جب ڈاکٹر مصین الرحمن نے اسے "نسخہ خواجہ" کے نام سے شائع کر دیا تو گویا اس مالِ مسودہ کی بازیافت ہو گئی جو درحقیقت پنجاب یونیورسٹی لاہور لائبریری کی ملکیت تھا اور جو درحقیقت "نسخہ لاہور" تھا۔ ڈاکٹر مصین الرحمن نے اس "دریہ بہا" کو خود چوری کیا یا شائع اگر ہم صاحب کی فحی لائبریری سے آڑا یا یہ نسخہ لائبریری سے کسی طالب علم کے ذریعے الٹا کر دیا گیا یا بقول ان کے بڑے بھائی کنہویں کے کسی بیوی باری سے حاصل کیا یہ معہرہ اب معہرہ نہیں رہا۔ کیونکہ مصین الرحمن صاحب یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ بڑے بھائی کنہویں کا وہ بیوی باری کون تھا؟ اب اہل الذکر تین باتوں میں سے کوئی ایک بات درست ہے۔ وہ بات کون سی ہے؟ اس کا ہیرو صرف مصین الرحمن صاحب جانتے ہیں، لیکن ایک بات طے ہے کہ یہ دیوانِ غالب کا نسخہ خواجہ نہیں، نسخہ لاہور ہے۔ رشید حسن خاں کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے کہ "ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا"۔ کسی شے کو خود چوری کرنا یا چوری شدہ مال کو خریدنا یا کسی سے اسے آڑا لینا جرم ہی کی مختلف صورتیں ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مصین الرحمن اس جرم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

میں نے ابھی عرض کیا کہ ڈاکٹر مصین الرحمن کے مرتب کردہ دیوانِ غالب نسخہ خواجہ (اصلاً نسخہ

لاہور کی اشاعت کے بعد حلقہ علم و ادب میں ایک شور مچا ہوا۔ گزشتہ چھ سات ماہ سے لاہور، اسلام آباد، کراچی سے شائع ہونے والا کوئی ادبی اخبار، ادبی رسالہ اور ڈوسرے قومی اخبار ایسے نہیں ہیں کہ جن میں قارئین کے ساتھ اس موضوع پر نہ لکھا جا رہا ہو۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ادبی سطح پر بحرال میں ایک معمولی موضوع نہیں بلکہ غیر معمولی موضوع ہے۔ بعض دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نسخہ خواجہ کو اتنی اہمیت نہ دی جائے اور اس پر گفتگو بند کر دی جائے ورنہ قاطع برحان جیسی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ مگر کیا ایسا کہنے سے ہم ادبی دیانت کا ثبوت دے رہے ہیں؟ کیا حقیقتاً یہ موضوع انتہائی معمولی ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے؟ ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے یہ بات ذہن میں ضرور رکھئے کہ یہ دوجہ اپنا غالب کے ایک ایسے مسودہ نسخے کا معاملہ ہے جسے بددیانتی اور جلسہ بازی سے کسی ڈوسرے نام سے شائع کر دیا گیا ہے جبکہ اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ کیا اس بات کا فیصلہ کرنا غیر ضروری ہے کہ یہ نسخہ خواجہ ہے یا نسخہ لاہور؟ کیا ڈاکٹر سید عبداللہ، امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود جیسے محققین کی اس حوالے سے تحریریں بے معنی ہیں؟ اور انہیں محض ردی کا امیر سمجھنا چاہئے؟ ہاں مصلحت کے تقاضے اور ہیں۔ مگر ادبی دیانت کے تقاضے بھی ذرا مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں سے صرف نظر کرنا ادب کی تاریخ کو مسخ کرنا ہو گا۔ چنانچہ بعض جرات مند ادیبوں اور محققین نے اس اہم ترین مسئلے پر تاریخی کاوشیں کی ہیں اور نسخہ خواجہ کے مرتب کے لیے بہت سے سوالات اٹھا دیے ہیں جن کے جواب فراہم کرنا ان کی اخلاقی اور تحقیقی ذمہ داری بنتی ہے۔

اس تاریخی تحقیق کاوش کے ضمن میں ایک اہم نام ڈاکٹر حسین فراقی کا ہے، جنہوں نے "دوجہ اپنا غالب نسخہ خواجہ" کے حوالے سے ساتھ (۶۳) صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب تحریر کی اور آخری پارہ (۱۳) صفحات میں اس نسخے کے حوالے سے بعض اہم نکات شائع کئے۔ اس مختصر کتاب کا نام "دوجہ اپنا غالب نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق" ہے۔ جسے بک وائر لاہور نے شائع کیا۔ اس سے قبل کہ ہم اس مختصر کتاب میں اٹھائے گئے سوالات کو دیکھا جائے کہ ان کا تعلق ڈاکٹر معین الرحمن کے دہنے گئے جوابات سے کریں؟ ایک اہم بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ آپ ایمان داری اور دیانت داری سے ڈاکٹر حسین فراقی کی مختصر کتاب کا مطالعہ کریں آپ کو شروع سے آخر تک بحث کا ایک طبعی انداز نظر آئے گا۔ کہیں بھی کوئی ذاتی نوعیت کا غلو و کمالی نہیں دیتا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے اس مختصر کتاب کے جواب میں جو کتابچہ تحریر کیا اس کا انداز کہیں بھی طبعی نہیں رہا۔ فراقی صاحب نے اپنی مختصر کتاب میں ڈاکٹر معین الرحمن کا یا تو توہیناً نام لکھا یا معین صاحب لکھا۔ مگر آپ ان کے لکھے ہوئے کتابچے کا اندازہ کچھ لیجئے آپ کو معین صاحب کی جھنجھوٹ، فحشہ اور ہرزہ سرائی جگہ جگہ دکھائی دے گی۔ کیا یہ بات ان کی اس وضع داری کے خلاف نہیں جس کا حق کہ بعض اصحاب کرتے ہیں؟ جو شخص طبعی و ادبی سوالات کا جواب دینے کے بجائے کانپوں اور بددیانتی پر اثر آئے اس کے کمزور پہلوؤں کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ خلی اور جعلی شخص کانپوں اور بددیانتی کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتا ہے۔ بحرال میں مجھے اس سے بحث

نہیں۔ میرا مقصد ”روحِ انبیا غالبِ نسخِ خواجہ“ کے ردِ عمل پر کلمی مئی ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب ”روحِ انبیا غالبِ نسخِ خواجہ“ اصل حقائق ”اور اس کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کی تحریر کردہ مختصر کتاب ”روحِ انبیا غالبِ نسخِ خواجہ“ صحیح صورتِ حال ”کا تقابلی مطالعہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ڈاکٹر معین الرحمن نے ان تمام سوالات کے جوابات دیئے جو ڈاکٹر حسین فراقی صاحب نے اٹھائے تھے؟ اور اگر دیئے تو کیا وہ؟ اور جن کے جواب نہیں دیئے تو ان سے چشم پوشی کی کیا وجوہات ہیں؟ تو آئیے پہلے ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب میں اٹھائے گئے مختلف سوالات کا مطالعہ کریں۔ میں انہیں ترتیب اور اختصار سے پیش کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو ان کا تفصیلی مطالعہ اس مختصر کتاب میں کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کے بنیادی سوالات یہ تھے:

- ۱۔ یہ نسخہ (یعنی نسخہ خواجہ) ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا امتیاز علی عرشی اور قاضی عبدالودود کے حعارف ”نسخہ لاہور“ (مملوکہ پنجاب، یونیورسٹی لاہور) یا لاہور سے الگ کوئی نسخہ نہیں، مبین میں وہی نسخہ ہے۔ اس ضمن میں ”روحِ انبیا غالبِ نسخِ خواجہ“ کی نسخہ لاہور سے غیر معمولی مماثلت کی طرف خود ڈاکٹر معین الرحمن قاری سے اشارہ کر چکے ہیں۔
- ۲۔ نسخہ لاہور کے ۶۳ اور اوراق ۱۲۸ صفحات ہیں۔ معین الرحمن صاحب نسخے کے صفحات ایک سو ستائیس ۱۲۷ جاتے ہیں کیونکہ وہ قلمی نسخے کے پہلے خالی سطر کو شمار میں نہیں لاتے۔
- ۳۔ اس قلمی نسخے کے تعارف کی تمام جزئیات مشمولہ تحریر ابجد سید عبداللہ، مولانا عرشی و معین الرحمن میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔
- ۴۔ اس قلمی نسخے کا ساز اور مسطر کی مطر (۱۵) سید عبداللہ، مولانا عرشی اور معین الرحمن صاحب کے یہاں ایک ہی ہیں۔
- ۵۔ نسخہ خواجہ کے نسخہ لاہور ہونے کی ایک ناقابلِ تردید دلیل یہ ہے کہ اس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے فقہی تقریب کے اختتامی جرس کے جو الفاظ نقل کیئے ہیں وہ ایک جیسے ہیں۔
- ۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سے اشعار شماری میں غلطی ہوئی ہے۔
- ۷۔ قاضی عبدالودود، مولانا عرشی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور خود معین الرحمن صاحب کے حعارف نسخوں میں اشعار کی تعداد تقریباً کے آخری جرس میں ایک ہی بیان ہوئی ہے تو یہ نسخے الگ الگ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اسی قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے اسی نسخے پر شدہ رد لکھا۔
- ۸۔ ہر عقیم کے ممتاز محقق رشید حسن خاں نے سید عبداللہ کے تعارف کو ناقص بتایا ہے اور معین الرحمن کے حعارف نسخہ خواجہ کو ”مبین میں نسخہ لاہور“ سے تعبیر کیا ہے۔ معین الرحمن اور رشید حسن خاں کی مراسلت سے معلوم ہوتا ہے کہ رشید حسن خاں ایک لمحے کے لیئے بھی اس بات کے

- ۶۔ کل نظر نہیں آتے کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ ہے۔
- ۷۔ رشید حسن خاں کے اس جملے کے کیا معنی ہیں کہ "حکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا"۔
- ۸۔ نسخہ خواجہ اور نسخہ لاہور کے اختلافات نمایاں کرنے کے اضطراب میں معین صاحب، عرشی صاحب کا نسخہ لاہور پر لکھا ہوا مختصر تعارف بلند بھی غور سے نہیں چڑھ سکے۔
- ۹۔ معین صاحب کو یہ قلمی نسخہ کہاں سے ملا؟
- ۱۰۔ نسخہ خواجہ کے صفحہ نمبر ۲۲ کا زیریں حصہ کھرچا گیا ہے۔ اس جگہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کا ایک کمیشن نمبر تھا۔ صفحہ نمبر ۲۲ کا زیریں حصہ کیوں کھرچا ہوا ہے؟
- ۱۱۔ معین صاحب نے یہ کہا ہے کہ "نسخہ خواجہ" نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا قیام ضرور ہے اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ نسخہ لاہور ہے۔
- ۱۲۔ اس مشکوک (یا مسوق) مال کی خرید پڑائی کتابوں کے کس کاروباری سے کس اصول کے تحت کی گئی اور ان حالات میں کیا اس کا موجودہ مالک قانون کی گشت سے بچ سکتا ہے۔
- ۱۳۔ ان بنیادی نکات کے بعد ڈاکٹر حسین فراقی نے معین الرحمن کی تحقیقی و تدوینی لغزشوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان لغزشوں کا جواب بھی معین الرحمن صاحب کو دینا تھا کیونکہ شاید وہ اپنی پہچان ایک محقق کے طور پر بھی کرتے ہیں۔ یہ لغزشیں کیا ہیں، ایک نظر انہیں بھی دیکھ لیں۔
- ۱۴۔ معین الرحمن نہ تو قلمی نسخے کا متن زیادہ توجہ سے دیکھ پائے اور نہ اس کی اطمینان بخش بازداشت (Transcription) ہی کر سکے۔
- ۱۵۔ معین الرحمن صاحب سوزوں طبع نہیں ہیں۔ ایسا شخص جو مصرع و وزن میں نہیں چڑھ سکتا وہ اشعار کے متن کی تدوین کیونکر کر سکتا ہے۔ اس ضمن میں فراقی صاحب نے متعدد اشعار اور مصرعے نسخہ خواجہ سے نقل کیے ہیں جو ناموزوں ہیں۔ نسخہ خواجہ کے علاوہ بھی فراقی صاحب نے معین صاحب کی دیگر مرتبہ کتب میں سے ان کے ناموزوں طبع ہونے کی مثالیں فراہم کی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے (ماشیعہ صفحہ ۳۹، ۴۰)۔
- ۱۶۔ نسخہ خواجہ میں کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ تراکیب کا لفظ اندراج اور دستور اور کاف سے ہم دم و اقلیت کی بے شمار مثالیں نسخہ خواجہ میں موجود ہیں۔ فراقی صاحب نے اس کا بھی عمل گوشتا رہ دیا ہے۔
- ۱۷۔ مرتب یعنی معین الرحمن غالب کے تصورات لغت و املا سے زیادہ واقف معلوم نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے ایسے الفاظ اور اشعار کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔
- ۱۸۔ تدوین متن شعر میں الفاظ کی شکستہی کے بعد ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنی مختصر کتاب میں نسخہ خواجہ کے دیباچے کے کچھ اور پہلوؤں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً:
- ۱۹۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے نسخہ خواجہ کے علاوہ پڑائی کتابوں کے ایک کاروباری سے جو دو اور قلمی نسخے

حاصل کیے ان میں سے ایک فارسی مخطوطے "معارج البیوۃ" کے کوائف حتیٰ کہ مصنف کا نام تک لفظ نکلا ہے۔

۲۰۔ معین صاحب نے اشعار کی تعداد ۱۵۴۸ بتائی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ قطعات کے منظوم فارسی عنوانات کو شامل کر لیا جائے تو اشعار کی مجموعی تعداد ۱۵۵۰ سے کچھ گویا بن جاتی ہے۔ فراقی صاحب کے نزدیک معین الرحمن نثری مطلق عبارت کو منظوم عبارات سمجھ بیٹھے ہیں۔ کیا یہ الیہ نہیں کہ کسی شعری مخطوطے کی تدوین وہ شخص کر رہا ہے جو نثر اور شعر میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے۔

۲۱۔ فارسی زبان سے ناواقفیت کے سبب مرتب نے غالب کے مختصر فارسی دیباچے اور نثری غزلوں کی تقریباً کی بازوشت میں بھی کئی مقالات پر ٹھوکریں کھائی ہیں افراتی صاحب نے اس کی مثالیں صراحت کے ساتھ دی ہیں!

۲۲۔ غالب کے فارسی دیباچے اور نثری فارسی تقریب کے اردو تراجم معین صاحب کے اپنے قلم سے نہیں ہیں۔ یہ تراجم پہلے بھی ہو چکے ہیں۔ معین صاحب نے مختصر فارسی دیباچے کا جو ترجمہ نگاہیں دیا اس کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر غفور الدین احمد کے ترانے کا چرہ ہے۔ افراتی صاحب نے بالکل اسے اسے ثابت کیا ہے۔

۲۳۔ دیا ان غالب نسخہ خواجہ کے آخر میں مزید آٹھ کے زمرہ عنوان آٹھ کتابوں کے نام درج ہیں جن میں سے تین کا اندراج ہے محل ہے۔ کیا مرتب پر آٹھ کے معنی روشن نہیں۔ جن کتب کے حوالے ہی موجود نہ ہوں کیا انہیں آٹھ کے ذیل میں رکھا جاسکتا ہے؟

میری دانست میں دیا اپنا غالب نسخہ خواجہ (اصلاً نسخہ لاہور) کے حوالے سے یہ وہ بنیادی نکات اور سوالات تھے کہ جن کے جوابات معین صاحب پر قرض تھے۔ کیا ڈاکٹر معین الرحمن اپنی مختصر کتاب میں (کہ جو فراقی صاحب کی کتاب کے جواب میں لکھی گئی) ان سوالات کے جوابات دے سکے؟ اس کا جائزہ لینے سے پہلے دو تین اور سوالات کو پیش کرنا ضروری ہے جن کا تعلق نسخہ خواجہ سے تو نہیں مگر معین الرحمن صاحب کے نام نوا تحقیقی کارناموں سے ضرور ہے۔ چونکہ یہ بھی فراقی صاحب کی اس کتاب میں موجود ہیں لہذا ان کا جواب دینا بھی معین صاحب کا فرض تھا۔ وہ سوالات یہ ہیں۔

معین صاحب نسخے کے صفحہ نمبر ۴۴ کو کہ جہاں بابا بختیار نے ۱۰۱۰-۱۰۱۱ میں قبر تھاکرچج سکتے ہیں کیونکہ انہوں نے

۲۴۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جو ذکر خانی۔

۲۵۔ پر تصویر چندری کی کتاب جاگیر غالب کو اپنے نام سے شائع کیا۔

۲۶۔ بشری ہاسٹ کے ایم اے اردو کے مقالے بہتر ان اور جعفری شخصیت اور شاعری کا بڑا حصہ نقوش لاہور میں اپنے نام سے شائع کیا۔

ان کے علاوہ معین صاحب سے سرزد ہونے والے ایسے ہی دیگر افسوسناک کاموں کو فراقی

صاحب نے استعدا پر چھوڑ دیا ہے کیونکہ ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ لیکن درج ہلا چند سوال بھی فراقی صاحب نے اپنی کتاب میں اٹھائے تھے اس لیے ان کے جواب دینا بھی معین صاحب کا اخلاقی فرض تھا۔

ڈاکٹر حسین فراقی کی اس مختصر کتاب کے شائع ہونے کے بعد علمی و ادبی حلقے متحرک ہوئے۔ ادبی رسائل و جرائد نے اس معاملے کو سنجیدگی سے لیا۔ اشعارات میں خبریں شائع ہوئیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ معین صاحب اپنی روایتی خاموشی سے کام لیتے اور کسی بھی سوال کا جواب نہ دیتے۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ مگر اب کی بار لوگوں کا دباؤ ان پر بڑھتا رہا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے لیے جواب لکھنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ انہوں نے جواب لکھا۔ ان کا جواب بھی ایک مختصر کتاب کی صورت میں ”دیوان غالب نسخہ خواجہ“ صحیح صورت حال کے عنوان کے تحت ان کے اپنے ہی اشاعتی ادارے الو قارہ جلی کیسٹریٹ لاہور سے مئی ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ مختصر کتاب ۶۳ صفحات پر مشتمل تھی۔ لوگ معین الرحمن صاحب سے جواب کی توقع کر رہے تھے مگر ایک مرتبہ پھر معین صاحب نے دو سروں کے اقتباسات ہی درج کرنے پر اکتفا کیا اور اصل معاملے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بظاہر ان کا یہ جواب ایک اور سوال کو ختم دیتا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا یہ جواب ہے؟ یا یہ پر زور دے کر پڑھنے لکھی اور مفہوم نکلیں گے؟

آئیے دیکھتے ہیں کہ معین صاحب نے فراقی صاحب کے کس سوال کا جواب دیا اور کن کن سوالوں کا جواب نہیں دیا۔ معین صاحب کا کہنا ہے کہ:

۱۔ اس میں اپنی نسخہ خواجہ کی تدوین متن میں (کتبیت اور اعراب کے ضبط کی معمولی لغزشوں کو نکال دینے کو قابل قبول باتیں دو چار سے زیادہ نہیں رہ جائیں۔“

فراقی صاحب نے حقیقتاً تدوین متن کی دسیوں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ میں نے گزشتہ اوراق میں سوالات کا جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ ان میں سوال نمبر ۶۵ تا ۱۹۷ ملاحظہ فرمائیں۔ یہ دو چار غلطیاں نہیں بے شمار غلطیاں ہیں۔ کیا یہ مناسب نہ ہو تاکہ معین صاحب ہر ایک بات کا جواب دیتے۔ جبکہ ان پانچ سوالات کا جواب محض درج ہلا ایک خطے میں ہے۔ آپ یہ تمام سوالات پڑھنے پھر ان کی تفصیل فراقی صاحب کی مختصر کتاب میں دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ کیا یہی جواب دیا جانا مناسب تھا۔ البتہ معین صاحب نے معمولی لغزشوں کا اعتراف ضرور کیا ہے اور دو چار باتوں کو قابل قبول کہا ہے۔ اگر وہ مزید غور فرمائیں تو انہیں نسخہ خواجہ کی تدوین متن اور مفہوم کی نارسائی اور تسامحات کی تعداد دسیوں ہی نظر آئے گی۔ نمبر ۱ کے تحت معین صاحب کا درج ہلا جملہ محض ایک بات ہے، فراقی صاحب کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ غور سے مطالعہ کرنے اور غلطی کی نشاندہی کرنے کو معین صاحب خرد گیری کہتے ہیں تو اس کا فیصلہ ان کی طبی استعداد پر چھوڑ دیتے۔

۲۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے ہماری ترتیب کے مطابق سوال نمبر ۶ کے جواب میں یہ کہا ہے کہ کتابت کی خفی فردگزاشوں اور اعراب کے اہتمام پر میں فراقی صاحب کے بیشتر اعتراضات سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی مثال میں انہوں نے استغفار کے انداز کے تین مصرعوں کی مثال دی ہے اور پھر اپنا فیصلہ دیا ہے کہ "ان کے آخر پر استغفار کے لگانا چاہئے تھا یا نہیں یہ میں ہماری کے ذوق پر چھوڑتا ہوں۔" قطع نظر اس کے کہ رموز و کاف کا درست استعمال بھی قواعد کے اصولوں میں سے ایک ہے، غلطی کے استغفار کے انداز کو متعین کر کے مذاہم کی جو جہتیں اہانگر ہو سکتی ہیں ان کے بارے میں معین صاحب کیا کہتے ہیں؟ اگر تمام کچھ ہماری کے ذوق ہی پر منحصر ہے تو پھر ناقدین اور محققین تو فارغ ہوئے؟

۳۔ فراقی صاحب نے اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۷۳ (معین صاحب نے صفحہ ۳۶ لکھا ہے) پر متن کی بازداشت کرتے وقت یہ جانتے والے الفاظ کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ انہیں قارئین میں لکھا جانا چاہئے۔ معین صاحب نے کہا ہے کہ نسخہ خواجہ کے تعارف میں صفحہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ اور ۲۵ پر یہ موجود ہیں۔ فراقی صاحب نے مثالیں تدوین متن میں سے صفحہ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸ اور ۲۹ سے دی ہیں۔ اگر معین صاحب نے تعارف میں یہ اہتمام کیا ہے تو پھر تدوین متن میں کیا اس کا استعمال فیضروری تھا؟ کیا یہ تدوین متن کا اہم ترین اصول نہیں؟ دیکھئے سوال کچھ ہو رہا ہے جواب کچھ دیا جا رہا ہے۔ یہ ہماری ترتیب کے سوال نمبر ۶ کا جواب تھا۔ کیا یہ جواب بنتا ہے؟

۴۔ فراقی صاحب نے کہا تھا کہ معین الرحمن سوزوں طبع نہیں تھا انہوں نے بعض مصرعے اور اشعار بے وزن کر دیئے ہیں۔ (دیکھئے ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۱۶) معین صاحب جواب یہ دیتے ہیں کہ "اصل حقائق کے صفحہ ۳ پر کم از کم سات مصرعے ایسے ہیں جنہیں (فراقی صاحب) نے ہموڑوں یا لفظ ٹھکرایا ہے" پہلی بات تو یہ کہ فراقی صاحب نے اس اعتراض کو صفحہ ۳۱ سے نہیں ۳۰ سے شروع کیا ہے۔ یہ صفحہ ۳۲ تک جاتے ہیں۔ اور ان میں سات مصرعے نہیں بلکہ ۱۸ سے زائد مصرعے اور اشعار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ معین صاحب نے سات کس بنیاد پر کہا ہے؟ معین صاحب کا یہ کہنا ہے کہ نسخہ خواجہ کے متن میں یہ بالکل درست ضبط ہوئے ہیں 'تو پھر متن کے بعد یہ ہموڑوں کیوں ضبط ہوئے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل متن ان کے سامنے نہیں تھا۔ فراقی صاحب نے نسخہ خواجہ کا صفحہ نمبر ۷ کے الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ معین صاحب بھی ایک ایک مثال کا جواب دیتے۔ فراقی صاحب مثالیں دے کر دعویٰ کر رہے ہیں۔ معین صاحب بغیر دلیل کے بات کر کے پھر الجھتا پیدا کر رہے ہیں۔ دو سطریں اس بہت بڑے اعتراض پر لکھ کر معین صاحب ایک جملہ یہ لکھ رہے ہیں "کم تر یہی صورت (فراقی صاحب) کے دوسرے ادعات اور اہتمامات میں دکھائی دیتی ہے" کون کون سے ادعات اور اہتمامات؟ فراقی صاحب نے کھل کر اظہار کیا ہے، مثالوں اور دلیلوں سے کیا ہے۔ معین صاحب بین السطور کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ یہ جواب نہیں گول

مول اعتراف جرم ہے۔ (قارئین ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ میں بریکٹ میں جہاں (فراق صاحب) لکھ رہا ہوں یہاں معین صاحب نے کچھ اور لکھا ہے۔ میں وہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ ایسا لکھنا صرف معین صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔)

۵۔ فراقی صاحب (۱۹۷۱ء) کی ترتیب میں سوال نمبر ۱۲۲ کے جواب میں معین صاحب نے یہاں جواب دینے کے دو تین لوگوں کے اس بارے میں قصصیں آمیز پٹے درج کر دیے ہیں۔ فراقی صاحب نے معین صاحب کے مختصر فارسی ویناچے کا زیادہ تر حصہ ڈاکٹر علور الدین احمد کا ترجمہ لکھا ہے۔ جواب تو اس بات کا دینا تھا لوگوں کے قصصیں آمیز اقتباسات تو درج نہیں کرنے تھے۔ جس کے نتیجے میں یہ سوال اب بھی ایک سوال ہے۔ اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۱۹ اور ۲۰ پر معین صاحب نے جو جواب اور اقتباسات درج کیے ہیں انہیں آپ خود پڑھ لیں۔ میں یہاں انہیں نقل در نقل کے مرحلے سے نہیں گزارنا چاہتا۔ ہاں ان کا ایک جملہ ان کے ليئے بھی مفید ہے جو بقول کہ انہیں یاد آیا کہ "خلیفہ" بن کر کام کرنے کی تخلیق کرتے رہنا ممکن ہے، اہم بات ہو مگر خود کچھ کر کے دکھانا اور کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا اہم تر بات ہے۔ "یہاں بھی معین صاحب سے ایک پھوٹی سی غلطی ہو گئی ہے جسے یقیناً وہ سو کاتب کہیں گے۔ درج بالا قسط میں "ممکن ہے" کے بعد قوم لکھا گیا ہے اگر یہ قوم "اہم بات ہو" کے بعد لگتا تو با معنی ہوتا۔ یہ بھی شاید رسو و بوقاف کا مسئلہ ہے۔ بہر حال ترجمے کو "تکلیل" دینا اور خود کچھ کر کے دکھانا دو مختلف باتیں ہیں۔ معین صاحب نے ترجمے کو تکلیل دیا ہے خود کچھ نہیں کیا۔ اس ليئے یہ بھی ان کا اعتراف ہی ہے۔

۶۔ معین صاحب نے سوال نمبر ۱۹ کا جواب صفحہ ۲۰ پر دیا ہے اور یہ کہا ہے "اس ضمن میں ان کی یہی فراقی صاحب کی اطلاعات محدود اور مستعار ہیں اس ليئے اگر باقی صفحات پر تو قابل معافی ہیں۔" فراقی صاحب نے اس حد کے ایک سچے ممتاز اور گوشہ نشین محقق غلیل الرحمن داؤدی کے حوالے سے یہ معلومات درج کی ہیں۔ یہ داؤدی صاحب وہی ہیں جن کے چوتوں میں خود معین صاحب بھی بیٹھے رہے ہیں۔ چلئے مان لیا کہ "معارف النہۃ" کے حوالے سے فراقی صاحب کی معلومات مستعار ہیں اور فراقی صاحب کا خمس الرحمن فاروقی کے حوالے سے دیا گیا حوالہ بھی درست نہیں تو پھر معین صاحب ثبوت کے ساتھ اسے ثابت تو کرتے۔ وہ اپنے حق میں کوئی مستعار وکیل ہی دے دیتے۔ مگر شاید اس حوالے سے کسی کا اقتباس ان کی دسترس میں نہ تھا۔ ورنہ کیا وہ اسے درج کرنے میں دیر لگاتے؟ ایک یہی تو کام ہے جو وہ تجزی سے کر سکتے ہیں۔

۷۔ فراقی صاحب نے نسخہ خواجہ میں کتابت کی بے شمار غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا دیکھئے سوال نمبر ۱۹ اور ۲۰ نسخہ خواجہ میں "قطعات کے منظوم فارسی عنوانات" لکھا گیا ہے۔ یہاں معین صاحب نے جواب دیا ہے کہ "نیم منظوم فارسی عنوانات" بقول ان کے "نیم" کا لفظ کتابت سے رہ گیا۔ غلطی تھوڑی دیر کے ليئے مان لیا کہ ان کا اہم لفظ ان کی نظر میں نہیں آیا۔ مگر وہ یہ تو بتائیں کہ "نیم منظوم

فارسی عنوانات ”کیا ہوتے ہیں؟ یعنی ”ہیم منظوم“ کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ اوزن کی کوئی نئی صورت ہے؟ ان کا یہ جتنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آج کا جدید شاعر تو پہلے ہی اوزن کی پابندیوں سے گھبراتا ہے۔ شاید انہی کے لیے معین صاحب نے ”ہیم منظوم“ کی آسانی فراہم کی ہے۔ ورنہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ منظوم یا تو ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ جو عروض میں ہو وہ منظوم جو نہ ہو وہ بحر۔ اب یہ بیچ والی صورت یعنی ”ہیم منظوم“ کی صراحت معین صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ فراق صاحب نے اپنی مختصر کتاب کے صفحہ ۳۹ پر تین مثالیں درج کی ہیں۔ ان تینوں بحر کے نکلوان کو جنہیں کاتب نے خوب چمکے لکھ کر معین صاحب کے لیے بھٹکنے کا سہلن پیدا کر دیا ہے، معین صاحب ”ہیم منظوم“ کہتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں معین صاحب سے اشعار شمری میں غلطی ہوتی ہے۔ ہماری دانست میں دانست طور پر معین صاحب نے ایسا کیا ہے۔ یعنی اس کے باوجود کہ وہ منظوم اور ہیم منظوم کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ ایسا کرنے کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ نسخہ خواہ کہ ایک جدا نسخہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صفحہ ۳۹ اور ۴۰ کے حاشیے پر فراق صاحب نے معین صاحب کے درج کیے ہوئے غالب کے کچھ اور مصرعے بھی درج کیے ہیں جو ناموزوں ہیں۔ فراق صاحب نے درست مصرعے بھی لکھے ہیں اور معین صاحب نے جہاں جہاں یہ ناموزوں مصرعے درج کئے ہیں فراق صاحب نے ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔ معین صاحب نے اس کا جواب کیوں نہیں دیا؟ معین صاحب کی مختصر کتاب کے صفحہ ۴۱ پر اس ضمن میں جو الجھڑ ہے اُسے ایک عام قاری بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اوپ کے تنجید و قاری کی قہرات ہی اور ہے ”ہیم“ کا لفظ کتابت سے رو جانے کے حوالے سے مجھے ایک کتاب ”نذر نظیر“ یاد آگئی۔ اس کتاب کے صفحہ ۴۱ پر معین صاحب نے لکھا ہے کہ ”مجھے لاہور، علی گڑھ، کھنٹر اور الہ آباد کی جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا“۔ مٹا ہے اب وہ یہ کہ رہے ہیں کہ ”جامعات میں“ کے بجائے ”جامعات کے“ تھا۔ کاتب نے لفظ لکھ دیا۔ ملاحظہ فرمائیں ”میں“ سے کیا معنی بنتے ہیں اور ”کے“ سے کیا؟ لیکن یہ اس وقت کما جب اعتراض اٹھا۔ میں حیران ہوں کہ معین صاحب سے ایسی غلطیاں پروف ریڈنگ میں کیونکر رہ جاتی ہیں؟ جن سے علم رکھنے والا پکڑا جاتا ہے اور علم نہ رکھنے والا متاثر ہوتا ہے۔

فراق صاحب نے معین صاحب کی فارسی سے عدم واقفیت کی جو بات کی تھی تو اس کا جواب معین صاحب نے یہ دیا ہے کہ ان کے زمانہ طالب علمی میں ایم اے میں یونیورسٹی کے نصاب میں فارسی اور عربی کا ایک پورا لازمی پڑچہ ہوتا تھا۔ وہ صفحہ ۴۱ پر لکھتے ہیں ”اس کے باوجود کبھی اور کہیں میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں فارسی کا شئی ہوں یا مجھے فارسی آتی ہے۔ مجھے تو اردو دان کا بھی کوئی دعویٰ نہیں۔“

پہلی بات تو یہ کہ ایم اے میں فارسی کا پڑچہ لازمی ہوتا یہ کب ثابت کرتا ہے کہ معین صاحب کو فارسی پر دسترس ہے۔ اگر ایسا ہو تا تو وہ وحید کا ترجمہ خود کرتے۔ آج کل تو وہ ایم اے کی کلاسوں کو تحقیق و

تدوین کے اصول بھی پڑھتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ کب ہوئے کہ وہ تحقیق و تدوین کے اصولوں سے واقف ہیں۔ کیونکہ اگر وہ واقف ہوتے تو اسے اپنی تحریروں میں ثابت بھی کرتے۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے بنیادی اصولوں کے عملی انطباق کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

۸۔

فراقی صاحب نے سوال نمبر ۱۱ اور ۱۳ کی دو سے نسخہ خواہ کو مسوقہ نسخہ ٹھہرایا ہے۔ جس کو جدا ثابت کرنے کے لیے معین صاحب نے ترمیم کی۔ جس کی وضاحت فراقی صاحب نے صفحہ ۱۸ اور ۲۰ پر کی ہے۔ معین صاحب نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے۔ ”میں اس کا مطلب خدا کے لایزال پر جھوٹا ہوں۔ انہوں نے بڑی گرواڑائی ہے اور فضا بھائی ہے۔ تعریف، تحریف، تصرف، جعل، بدگمانی، کم علمی کے سارے چالے اور شائبے انہیں مبارک“۔ لاجل والا تو قیام سیدھے سیدھے سوال کرتا ہوں۔ اُنٹے اُنٹے جواب آتے ہیں۔ معین صاحب کو یہ پتا تھا کہ یہ نسخہ انہوں نے پڑائی سکڑوں کے کس کاروباری سے کس اصول کے تحت خریدا؟ کیونکہ یہی تو وہ سوال ہے جو نسخہ خواہ کو جعلی ثابت کرتا ہے اور اس میں تعریف، تحریف، تصرف، بدگمانی اور کم علمی کے شائبے پیدا کرتا ہے۔ محض اتنا کہ دیکھا کہ انارکلی کے فٹ پاتھ سے یہ نسخہ انہیں ملا کافی تو نہیں ہے۔ اتنا کہ دینے سے تحقیق کے تقاضے تو پورے نہیں ہوتے۔ یہ عجیب دینے والے ہیں کہ ان کی چھٹی کے لیے کیا تھا؟ کیا معین صاحب کے لیے یہ چاہنا ضروری نہیں تھا؟ صفحہ نمبر ۲۲، اختتامی طور کیوں چھٹی ہوئی ہیں؟ کیا اس کی وضاحت تحقیقی اعتبار سے ضروری نہیں تھی؟ معین صاحب کہتے ہیں ”اس پر کسی معروف یا معلوم مالک کا نام درج نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ عجیب دینے والے ہیں کی چھٹی کے لیے اصل مالک کا نام یعنی پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی سر بھیجی ہوئی ہے۔ فراقی صاحب نے اس کا عکس اپنی کتاب کے صفحہ ۷ پر دیا ہے۔ کیا اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے اور جعل سازی کا پردہ ہاک کرنے کے لیے معین صاحب خود اس صفحے کا کاربن ٹیسٹ کروائیں گے؟ یا ایئر ڈیوڈ سے اس کے پچھلے بھیجی ہوئی حقیقت کو دیکھنے کا اہتمام کریں گے؟ اس کے لیے تو یمنیشن کو آگاہانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ معین صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے وائس چانسلر کو نسخہ پیش کرنے سے قبل اسے ٹیسٹ کروا دیا ہے۔ یہ محض اس لیے کہ کوئی اس چھٹی کے پچھلے بھیجی تحریر نہ پڑھ سکے۔ مگر شاید انہیں علم نہیں کہ آرنے کے زمانے میں یہ کام اب مشکل نہیں رہا۔ کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں معین صاحب؟ معین صاحب نے صفحہ ۳۰ پر فراقی صاحب کی کتاب کے آخر میں دیئے گئے مختلف صوفات کے عکس کو ایک اچھی پیش رفت کہ ہے۔ یہ پیش رفت نہیں موت ہیں نسخہ خواہ کے نسخہ لاہور ہونے کے!!

یہاں تک معین صاحب کی مختصر کتاب کا صفحہ نمبر ۳۰ قلم ہوتا ہے۔ صفحہ ۳۰ کے اوپر حصے کے بعد نسخہ خواہ کے سلسلے میں تیسری اختتامی درج میں جو صفحہ ۳۳ تک چلتے ہیں۔ یہ وہی اختتامی ہیں (اور ان کے علاوہ بھی جو اس مختصر کتاب میں دو سری بندوں پر بارہ گرو درج ہیں) جو ان کے حق میں

مرتبہ کتاب ”دعائے غالب“ نسخہ خواجہ - تجزیہ و تحسین ”میں شامل ہیں۔ کیا ان اقتباسات کو ایک مرتبہ پھر درج کرنا ضروری تھا؟ یہ تو پہلے بھی کتبھی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ اس مختصر کتاب کو لکھنے کا جو از تو محض فرائی صاحب کے سوالات کا جواب دینا تھا۔ مگر اس کا کیا ہو کہ معین صاحب دوسرے خود بھی لکھتے ہیں اور دوسروں کے اقتباسات بھی درج کرتے رہتے ہیں۔ چاہے اس کا موقع ہو یا نہ ہو۔

۹۔ معین صاحب نے صفحہ ۳۴ کے آخر پر فرائی صاحب کے سوال نمبر ۱ کا ایک مطری جواب دیا ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس قلمی نسخے پر سید عبداللہ کے تعارف نامے کے چار برس بعد قاضی عبدالودود نے ”غالب“ پر نیا نسخہ لاہور کے اسی نسخے پر شکرہ لکھا۔ معین صاحب اس کا جواب یہ دے رہے ہیں۔ (فرائی صاحب) کا اصرار کہ قاضی صاحب کا شکرہ ”اسی نسخے پر لکھا گیا ہے دلیل اور ثبوت ہے۔“ بس اس کا جواب۔ فرائی صاحب نے تو دلیل دی ہے لیکن معین صاحب کے پاس اس کے جواب کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ بس انہوں نے کہہ دیا کہ یہ ثبوت ہے تو یہ ثبوت ہو گیا۔ اسی ضمن میں وہ فرائی صاحب کے (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۱۸) کا جواب بھی دیتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ ”انتیاز علی عرفی“ قاضی عبدالودود اور پاک وہند کے کئی اہل علم کی رائے یہ ہے کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور سے الگ کوئی نسخہ نہیں۔ میں میں وہی نسخہ ہے، معین صاحب صفحہ ۳۵ پر جواب یہ دیتے ہیں کہ ”کئی اہل علم کی رائے سر آٹھوں پر لیکن قطعی مسئلے سے اگر ان نظروں میں فرق دکھائی دیتا ہے تو ان کا میں میں ایک ہی نسخہ ہونا کیونکر باور کیا جاسکتا ہے۔“ خیر اس سوال کا ایک جواب تو خود معین صاحب نے نسخہ خواجہ کے تعارف میں دے دیا ہے۔ یعنی یہ کہ نسخہ خواجہ نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا تو آم ضرور ہے۔

رشید حسن خاں جیسے محقق نے اسے میں میں نسخہ لاہور کہا ہے۔ معین صاحب فرق اشعار کی تعداد اور غزلوں کی کمی بیشی کا بتاتے ہیں۔ یہ بات طے ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ سے اشعار شاری میں غلطی ہوئی (اور اب تو خیر سید قدرت نقوی صاحب نے اپنی تازہ کتاب ”دعائے غالب“ نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروق ایک جائزہ ”میں یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ معین صاحب نسخہ خواجہ کے اشعار کی جو تعداد بتاتے ہیں وہ بھی درست نہیں ہے۔ اور اصل متن اور ان کے شمار کردہ اشعار میں چالیس شعروں کا گھٹا ہے) خود معین صاحب سے اپنے ہی مرتبہ ”دعائے غالب“ کی اشعار شاری میں متعدد غلطیاں ہوئیں۔ اس نئی تحقیق کی روشنی میں نسخہ خواجہ کے حق میں (چاہے وہ اشعار شاری کے ضمن میں ہوں یا غزلوں کی کمی بیشی کی صورت میں) ان کا یہ موقف بھی بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔

معین صاحب کی مختصر کتاب کے صفحہ ۴۱ سے پھر تحسین امیر اقتباسات شروع ہوتے ہیں جو صفحہ ۴۴ تک پہلے ہوئے ہیں۔ صفحہ ۴۵ پر انہوں نے نسخہ خواجہ کے اصل نسخے کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لاہور کو دینے کے سلسلے میں اپنی کاوشوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ نسخہ واپس اپنی اصل جگہ پر پہنچ چکا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوا تھا۔ معین صاحب نے ۷ / اگست ۱۹۹۹ء کو یہ پیش کش کی تھی۔ اور شرائط لکھی تھیں کہ

یہ نثر رشتی اس کی مخالفت کا مناسب بندوبست کرے۔ اب اگست ۲۰۰۰ء کے اواخر میں انہوں نے یہ نثر وائس چانسلر کو پیش کیا تو محض دوپہوں اور دانشوروں کے دباؤ کے بعد۔ کیا اب یونیورسٹی حکام نے انہیں مناسب بندوبست کی تحریر کی مخالفت دے دی تھی؟ اگر نہیں تو اتنے وقت کے بعد اب یہ نثر وہاں کیوں دیا گیا؟

۱۰۔ اب آئیے معین صاحب کی کتاب کے صفحہ ۳۹ پر۔ یہ وضاحتی فیصلہ ہے۔ جس میں فراقی صاحب کے نثر خواجہ سے ہٹ کر تین سوالوں (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۲۳، ۲۴، ۲۵) کا جواب ہے۔ فراقی صاحب نے یہ کہا کہ رشید احمد صدیقی کے ساتھ معین صاحب نے اپنی تصویر جو ذکر بنگالی (ایک ہفت ہفت پہلے لطیف ازماں خاں صاحب نے بھی کئی تھی) معین صاحب نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ انہوں نے اپنے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تصویر کو "تخلیل" دیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی۔ سوال یہ ہے کہ معین صاحب یہ وضاحت اب کیوں کر دے رہے ہیں؟ یہ وضاحت اس پہلے الپٹائن میں کیوں نہیں جس کے پس و پیش پر یہ شائع ہوئی۔ کیا اس وقت یہ مناسب اور ضروری نہیں تھا کہ معین صاحب ایک جملے میں وضاحت کر دیتے کہ یہ تصویر میں نے خود تیار کی ہے۔ وہاں سے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ تصویر رشید احمد صدیقی کے ساتھ کھینچوائی گئی ہے۔ اور خانہ بھی تاثر دینا مقصود بھی تھا۔ لوگوں کے اس معاملے کو اٹھانے پر معین صاحب اب یہ وضاحت کر رہے ہیں۔ فرض کیجئے اگر کوئی مذہب و ملت تو سو سال بعد آئے والی نسل تو یہی سمجھے کہ یہ تصویر اچھے ہی کھینچائی گئی ہے۔ مگر اس کا کیا ہو کہ رشید احمد صدیقی سے عقیدت رکھنے والے لوگ ابھی زندہ ہیں۔ اس "کار خیر" پر معین صاحب کو "قرب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی دلائی۔" یہ قرب اور دور کے خوش ذوق دوست اور بزرگ کون ہیں؟ ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ محض لفظوں کا پیر پھیر اور بجھوت کو بچ ثابت کرنے کا ایک نام نہاد جواز ہے۔ میں یہ جملہ لکھتے ہوئے معافی چاہتا ہوں کہ فراقی صاحب کے لکھے ہوئے کا حساب تو وہ خدا پر چھوڑتے ہیں۔ کیا انہیں اپنی طاقت عزیز نہیں؟ کیا وہ خدا کے سامنے جوابدہ نہیں؟

۱۱۔ فراقی صاحب نے (ہماری ترتیب میں سوال نمبر ۲۹) اپنی مختصر کتاب میں کہا کہ معین صاحب نے ایم اے اردو کی طالبہ بشری ہسل کا مقالہ "ادرا جعفری شخصیت اور شاعری" کا ایک بڑا حصہ نقوش میں اپنے نام سے شائع کیا۔ معین صاحب نے اس کے جواب میں ایک کتابی کٹائی ہے۔ اور وہ کتابی مختصراً یہ ہے کہ طالبہ بشری ہسل کی والدہ شدیدہ طلیل ہو گئیں۔ طالبہ کا فوری امریکہ چلنا پڑا۔ جہاں اس کی والدہ تھیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر مقالے کے نگران تھے۔ انہوں نے کام کی رفتار اور اس کے معیار کی جانب سے بے اطمینانی ظاہر کی۔ مجبوراً مجھے (یعنی معین صاحب) کو کام کی نگرانی کی ذمہ داری اپنے سر لینا پڑی۔ مگر کچھ اور ایک لمحے کے لئے میں غور چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نگران مقالہ تھے۔ وہ کام کی رفتار اور معیار سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ذمہ داری معین صاحب نے لے لی۔ ڈاکٹر سلیم

اختر کی ادبی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ نہانے اب تک وہ کہتے ہی ایم اے، ایم فل کے مقالوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دے چکے ہیں۔ معین صاحب یہاں اُن پر بھی عدم اعتدال کر رہے ہیں۔ کیونکہ مقالے کا جو نگران ہوتا ہے وہی قلم دار بھی ہوتا ہے۔ کیا کام کی نگرانی کی قلم داری جب معین صاحب نے اپنے سرے لی تو ڈاکٹر سلیم اختر صاحب مطمئن ہو گئے تھے؟ اس کا جواب شاید وہی دے سکتے ہیں۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں خود گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب نے ایسا کوئی تذکرہ ہی سے نہیں کیا۔

اب آگے بڑھیے۔۔۔۔۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ طالب نے ”ادب جعفری سے متعلق میری غیر مطلوبہ تقریروں سے بھرپور استفادہ کیا اور اپنے پیش لفظ میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ چلیں مان لیا کہ معین صاحب نے ادب جعفری سے متعلق کچھ لکھا تھا اور وہ غیر مطلوبہ تھا۔ اور بشری باسط نے اس سے استفادہ کیا۔ تو اب اس کے استعمال کی دو صورتیں تحقیقی اعتبار سے جائز تھیں:

۱۔ طالب غیر مطلوبہ مواد کو من و عن گھستے ہوئے دواہن کا استعمال کرتیں اور غیر مطلوبہ تقریر کا حوالہ دیتیں۔

۲۔ طالب دواہن کے بغیر اپنے مقالہ میں لکھیں تو پھر بھی حاشیے میں اس کا حوالہ دیتیں۔

طالب نے یہ دونوں احتیاط نہیں کئے۔ پھر اس بات کو کیسے مان لیا جائے کہ وہ تقریر خود معین صاحب کی تھی۔ کیا معین صاحب تحقیق کے اس اصول سے بھی واقف نہیں کہ بغیر حوالے اور بغیر دواہن کے استعمال کے تقریر ایسی کی ہوتی ہے جو لکھ رہا ہو۔ مگر شاید وہ اس اصول سے واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن کی دیگر کتب بھی ایسی ہی لغزشوں سے بھری ہوئی ہیں۔ جب وہ خود دواہن کی تقریریں اپنے نام سے شائع کر سکتے ہیں تو وہ تحقیق کے ان اصولوں کو کیا سمجھ سکیں گے۔

معین صاحب کا کہنا ہے کہ طالب نے پیش لفظ میں بڑے سلیقے سے اعتراف اور اہتمام کیا ہے کہ تبصرہ کے مولد آخر کے ابواب ”معیارِ رحمت“ (معین الرحمن کی تقریروں پر مبنی اور ان کی محنت کا حاصل) ہیں۔ معیارِ رحمت کے بعد یہ بریکٹ معین صاحب نے خود لگائی ہے۔ اصل مقالے میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

ان باتوں سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ معین صاحب نے طالب کو مقالے کے وہ حصے تقریر کر کے دیئے جو انہوں نے نقوش لاہور میں اپنے نام سے شائع کئے۔ بشری باسط ایک طالبہ تھی۔ اپنے اچھے برے پانچھان کی وہ خود قلم دار تھی۔ یونیورسٹی کیلینڈر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ اگر طالب علم مشکل میں ہو تو اساتذہ انہیں مقالہ لکھ کر دے سکتے ہیں اور بعد میں اپنے نام سے شائع کروا سکتے ہیں۔ بشری باسط کو اسی مقالے کی تکمیل پر ایم اے اردو کی ڈگری ملی۔ یہ پہلے یونیورسٹی میں جمع ہوا۔ معین صاحب نے ان تقریروں کو پڑھ کر (میں نے) کے بعد نقوش لاہور میں شائع کروایا۔ وہ طالب کے بھی بھرم ہیں اور یونیورسٹی کے بھی۔ احتمالی قراءین کی خلاف ورزی کے بھی۔ تحقیقی و ادبیاتی کے بھی وہ مرتکب ہوئے۔ اُن کا یہ

موقف کہ وہ تحریریں ان کی تھیں جسے مقالے میں جگہ دی گئی سراسر غلط ہے کیونکہ طالب نے حوالہ ۱۰، کتابیات میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ مقالہ لکھ کر دینا جرم۔۔۔۔۔ مقالہ جمع ہونے کے بعد اسے اپنے نام سے شائع کرنا جرم۔۔۔۔۔ معین صاحب کی یہ کمائی من گھڑت اور ان کا پرہیزگار بنے معنی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یونیورسٹی حکام نے ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے شک ہے کہ کچھ اساتذہ دیم اس کے ان مقالوں کو اپنے نام سے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں جو انہوں نے اپنے طالب علموں کو لکھ کر دیئے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا معین صاحب کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ کیا یونیورسٹی کے قوانین بھجوتے تو نہیں ہوں گے؟

۱۲۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے سوال (ترتیب میں نمبر ۲۵) کے جواب میں یہ تھوڑی چندری کتاب جاگیر غالب کا ذکر کیا جسے معین صاحب نے اپنے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا۔ سورج کے غالب نمبر میں اس مسئلے کا تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور اصل جاگیر غالب بھی شائع ہوئی ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ اس کا جواب میں تفصیل سے سورج کے مدبر کے سپرد کر چکا ہوں۔ کیا ابھی تک کسی نے وہ جواب چننا؟ وہ جواب کیا تھا یہ تو تسلیم تصور صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر یہاں معین صاحب کیا کہتے ہیں یہ دیکھئے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ یہ تھوڑی چندری کی یہ غلطی کاوش نامور و محدود تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کاوش پر تھوڑی چندری تھی۔ اگر یہ درست ہے تو انہوں نے جاگیر غالب کے سورتی پر مرتب کے طور پر صرف اپنا نام کیوں لکھا؟ یہ تھوڑی چندری نے جو متن کی ترتیب قائم کی تھی اس میں الٹ پھیر کیوں کی؟ اور جب یہ کتاب بعض اصحاب کے پاس موجود تھی جیسا کہ سورج کے غالب نمبر میں یہ اصل حالت میں شائع بھی ہوئی تو پھر ”ترتیب نو“ کے کیا معنی ہیں؟ کیا یہ تھوڑی چندری قائم کی ہوئی ترتیب کو تبدیل کرنا تحقیقی اعتبار سے درست تھا؟ اس کا کوئی جواب دیئے بغیر معین صاحب نے جاگیر غالب کے حوالے سے صفحہ ۵۷ سے ۶۰ تک پھر دو سطروں کے محتاجی اعتبارات درج کر دیئے ہیں۔

میں نے اس تحریر کی ابتداء میں یہ لکھا تھا کہ ہم یہ دیکھیں گے کہ فراقی صاحب کے اٹھائے گئے سوالات کیا تھے اور معین صاحب کے جوابات کیا ہیں۔ انہوں نے کس سوال کا کیا جواب دیا۔ اب آپ یہ شمار کریں کہ معین صاحب نے فراقی صاحب کے کس سوال کا جواب دیا۔ معین صاحب نے فراقی صاحب کے ۱۳ سوالوں کا جواب دیا۔ یعنی ہماری ترتیب میں فراقی صاحب کے سوال نمبر ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ کا جواب معین صاحب نے فراہم کیا۔ ان تمام سوالوں کے معین صاحب نے جو جواب دیئے وہ عجائے خود سوالات کو جنم دیتے ہیں اور اس کا تذکرہ میں ہر سوال کے ضمن میں وضاحت کے ساتھ کر چکا ہوں۔

اب معین صاحب نے فراقی صاحب کے جن سوالوں کا جواب نہیں دیا (ہماری ترتیب میں ان

کے نمبر یہ ہیں۔ ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸-۹-۱۰-۱۱-۱۲ اور ۲۳ یہ تمام سوال (جن کی کل تعداد ۱۲ بنتی ہے) ابھی بہت بنیادی نوعیت کے تھے ان کے جواب معین صاحب نے فراہم کیوں نہیں کئے؟ اور ان سے چشم پوشی کیوں کی؟ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اگر معین صاحب ان کا جواب پوری سچائی سے دے دیتے تو "نفس خواجہ" "نفس لاہور" ثابت ہو جاتا۔

میں نے ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کی مختصر کتاب دج این غالب نسخہ خواجہ اصل حقائق اور اس کے جواب میں ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کی مختصر کتاب دج این غالب نسخہ خواجہ - صحیح صورت حال کا ایک تبدیلی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اور یہ اس لیے کیا ہے کہ کہیں معین صاحب جواب لکھ کر خود کو سرخرو ہونا نہ سمجھ بیٹھیں۔ وہ فراقی صاحب کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ جنوز جواب ان پر قرض ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان پر قرض بڑھتا جا رہا ہے۔ کیونکہ حال ہی میں یعنی اگست ۲۰۰۰ء میں ایک نامور غالب شناس محترم سید قدرت نقوی صاحب کی نسخہ خواجہ کے حوالے سے ایک مختصر کتاب چھپ کر مختصر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کا نام "دج این غالب نسخہ خواجہ یا نسخہ مسروقہ - ایک جائزہ" ہے۔ اس کتاب کو لکھنے حقیقی ادب کراچی نے شائع کیا ہے۔ (۴۷) صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب نے کچھ نئے اور اہم سوال معین صاحب کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جن کی تفصیل میں جانا اس وقت بے محل ہو گا کہ میرا مقصد وہ مختصر کتابوں کا تھیل ہے۔ مگر اس نئی کتاب میں اٹھائے گئے سوالات بھی معین صاحب پر قرض ہیں۔ دیکھیں وہ ان کا جواب بھی دے پاتے ہیں یا نہیں!

نفس خواجہ (اصلاً نسخہ لاہور) کے ضمن میں جو شور مچا ہوا تھا۔ محققین غالب نے اس ضمن میں اپنا بھرپور کردار ادا کر دیا۔ ایک تاریخ رقم ہو گئی۔ کیا آنے والا حقیقی اس سے صرف نظر کر سکے گا؟ میرا یہ سوال ان دانشوروں سے ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نسخہ خواجہ (اصلاً نسخہ لاہور) کو کوئی اہمیت نہ دی جائے اور اس پر محض غور کر دی جائے۔ آج اگر محققین یہ بھی گلی تو تاریخ ضرور بولتی ہے۔ معین صاحب یہ یاد رکھیں!!

عارف

ڈاکٹر عارف ثاقب

لاہور

۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء

حصہ دوم : مضامین اور تبصرے

دیوان غالب، نسخہ خواجہ یونس لاہور
 ڈاکٹر مکیاں چند جین
 ادبی دنیا میں مکروہ یا اور جعل سازیوں کی حیرت انگیز رفیق احمد بخش
 روداد

دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق
 کلبت جہاں
 جاکیر غالب سے دیوان غالب تک
 اختر حیات
 دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق
 رفاقت علی شاہد

دیوان غالب نسخہ خولجہ یا نسخہ لاہور!

ڈاکٹر گیان چند جین

پاکستان کے مشہور ماہر قالمیات ڈاکٹر سید معین الرحمن کے پاس دیوان غالب کا مخطوطہ ۱۸۵۲ء تھا جسے انھوں نے مرحب کر کے ۱۹۹۸ء میں "دیوان غالب، نسخہ خولجہ" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس پر ایک بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ کیا یہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی کا وہ گم شدہ "دیوان غالب، نسخہ لاہور" ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود نے تصادف کرایا تھا اور جسے عرشی صاحب نے "نسخہ لاہور" کہا تھا۔ اس سلسلے میں چند کتابیں سامنے آئی ہیں:

- ۱۔ ڈاکٹر سید معراج حق و امیر تقسیم سید (مرتبین): دیوان غالب، نسخہ خولجہ۔ ترویج و تحسیم۔ لاہور ۲۰۰۰ء۔ صفحات ۳۲۸۔ یہ مجموعہ مضامین ہے جو ڈاکٹر معین الرحمن کو ان کی ۵۷ ویں سالگرہ ۵ نومبر ۱۹۹۹ء کو پیش کیا گیا۔
- ۲۔ ڈاکٹر تحسین فراتی: دیوان غالب، نسخہ خولجہ۔ اصل حقائق۔ لاہور، سنہ ندارد۔ غالب اپریل ۲۰۰۰ء۔
- ۳۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن: دیوان غالب، نسخہ خولجہ۔ صحیح صورت حال۔ لاہور، مئی ۲۰۰۰ء۔
- ۴۔ سید قدوس نقوی: نسخہ مسروقہ۔ یہ میری نظر سے نہیں گزری۔ نگاہِ بون ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ آئی ہوگی۔ (۱)

آفرانہ ذکر کو چھوڑ کر میں نے بقیہ سب کتابوں اور کتابچوں کو بالا شیعاب پڑھا ہے۔ میں کئی ماہ سے اس موضوع پر لکھتا چاہتا تھا لیکن میرے ایک بھی خواہ کا مشورہ تھا آپ کیوں اس جھیلے میں نہرتے ہیں، لیکن اب میں سوچتا ہوں کہ خالص علمی تقاضے سے مجھے لکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر معین الرحمن میرے پاس نے کرم فرمایا، ڈاکٹر تحسین فراتی میرے

لے تقریباً ابھی ہیں۔ (۲) خیال پڑتا ہے کہ میں اکتوبر ۷۹ء میں جب لاہور گیا تھا تو اورینٹل کالج میں ان سے دیکھا ہوا تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ آج تک ان سے مراسلت نہیں ہوئی لیکن میں دونوں حضرات کے لیے غلوں کے جذبات رکھتا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ وہ بھی میری سرورشی تحریر کو اسی جذبے سے دیکھیں گے۔

حمین فراتی کا کتابچہ "اصل حقائق" دقیق اور عالمانہ تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے، لیکن انہوں نے اس میں ذاتیات کو گھول کر بڑی غلطی کی۔ (۳) اس ناگفتی کے بغیر وہ ایسا ہی وقیع تحقیقی مقالہ ہوتا جیسے رشید حسن خاں کا "دیوان غالب" مرحومہ مالک رام یا "علی گڑھ تاریخ ادب" پر تھرو۔ ذاتی اتہامات نے مقالے کی علمی سطح کو آلودہ کر کے مناظرانہ رنگ دے دیا ہے۔ اگر وہ ان معاملات کے انکشاف کی تڑپ کو دہا نہیں سکتے تھے تو انہیں چاہیے تھا کہ ان امور پر مستقل ایک دوسرا مختصر مقالہ لکھ دیتے اور تحقیقی مقالے کی حرمت کو محفوظ رکھنے کے لیے ان مطالب سے سزا رکھتے، لیکن اب تو حیرت کمان سے نکل چکا ہے۔

میں اختصار کی خاطر دونوں حضرات کے ناموں کو ایک لفظ میں محدود کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ حمین نے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر سید عبداللہ کے نسخے، عرشی صاحب اور قاضی عبدالودود کے نسخے اور "نفس خوبہ" کے بعض صفحات کے جو ٹکس دیے ہیں ان کی وحدت و یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی ماہر تحریر کی نظری ضرورت نہیں، ایک عطائی بھی یہ یک نظر پہچان سکتا ہے کہ یہ ایک ہی نسخے کے ٹکس ہیں۔ حمین کا یہ کہنا ہے کہ وہ "نفس خوبہ" کو ڈاکٹر عبداللہ کے حصارف نسخے کا مماثل مانتے ہیں لیکن ان میں فرق اور اختلاف بھی بہت نمایاں ہے۔ عرشی و قاضی کا حصارف نسخہ نسبتاً زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ خیال ہے کہ ان دونوں کی اصل کوئی ایک ہی مسودہ رہا ہو جس سے ایک ہی کاتب نے، ایک ساتھ وہ نقلیں تیار کی ہوں۔ ("دیوان غالب، نفس خوبہ۔ تجربہ و حمین۔" ص ۳۳)

نصروں کے فوٹو پکار پکار کر اعلان کر رہے ہیں کہ ہم ایک ہی نسخے کے ٹکس ہیں۔ ان کے حصارف دینے میں ڈاکٹر عبداللہ، عرشی صاحب اور قاضی صاحب، تینوں نے بے احتیاطی کا ثبوت دیا ہے۔ حمین کے بعض سید اختلافات کے بارے میں جاننے کے لیے میں نے رضا لاہوری رام پور کے ڈائریکٹر کو لکھ کر درخواست کی کہ وہ دونوں گراف میں دیکھ کر صحیح صورت حال سے مطلع کریں اور چاہیں تو رام پور کے ڈاکٹر عبدالحی علی صدیقی کو بلا کر

یہ کام ان کے سپرد کر دیں۔ میرے پاس ڈاکٹر ظہیر کا جواب آ گیا ہے۔ معین الرحمن نے اپنے کتا بچے میں لکھا ہے:

”نسخہ لاہور“ میں عرشی صاحب کی شہادت کے مطابق مصرعے کی صورت یہ ہے:

و ہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہو گا۔ جب کہ گج ردیف ”ہونا“ ہے، ’ہو گا‘ نہیں۔ ”رام پور میں موجود کئی نقل کے اس مقام کو دیکھ لیا جائے کہ یہاں صورت، عرشی صاحب کے مشاہدے کے مطابق ہے یا ان سے چوک ہوئی؟“ اگر کس کی شہادت عرشی صاحب کے مشاہدے کی تانبہ نہ کرے تو پھر گویا پھر ”نسخہ خوبہ“ کے عین عین ”نسخہ لاہور“ ہونے کے بارے میں بظاہر کوئی اشتباہ نہیں رہ جائے گا۔

دو گراف دیکھ کر ڈاکٹر ظہیر نے میرے اختصارات کا جو جواب دیا ہے، میں اس میں ”نسخہ خوبہ“ کا صفحہ نمبر شامل کر کے لکھتا ہوں:

۱۔ ”نسخہ خوبہ“ کے ص ۱۱ کی غزل کے تیسرے سطر میں ’مژگاں‘ کے بعد ردیف ’ہونا‘ ہی ہے ’ہو گا‘ نہیں۔ (معلوم نہیں عرشی صاحب نے اس دو گراف میں ”ہو گا“ کہاں سے چڑھا لیا)

۲۔ ”نسخہ خوبہ“ کے ص ۲۲ کی تہی میں دو گراف میں مہر ہے جس پر Accession No. 5812 تحریر ہے۔

۳۔ ”نسخہ خوبہ“ ص ۳۳ کی غزل: ”لازم تھا کے دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور“ موجود ہے۔

۴۔ ورق ۲۳ پر (”نسخہ خوبہ“ ص ۵۰) تین شعروں کی یہ غزل موجود ہے ”دونوں جہان... تکرار کیا کریں“

۵۔ دو گراف میں ”نسخہ خوبہ“ ص ۱۴۳ کی طرح تقریظ کے اوپر جلی قلم سے عنوان ’خاتون‘ لکھا ہے۔ تقریظ کی پہلی سطریں ’بہر فروغ مستری‘ ہے۔ دوسری سطر کے آخر اور تیسری کے شروع میں ”غرام خندہ درہا“ ہے۔ (قاضی صاحب نے پہلی سطر میں ’بہر فروغ مستری‘ اور دوسری میں ”غرام دل زبا“ لفظ نقل کر کے معین الرحمن کو دونوں نسخوں کو مختلف کہنے کا موقع دیا۔)

۶۔ صفحے کے اختتام پر مہر میں تحریر ہے۔

”نواب یحیٰی نورثی لاہوری، عربک ٹیکشن ۶۸۱۲“

جسے ڈاکٹر ظہیر نے ”نواب“ چڑھا دو ”ناباب“ ہوتا چاہیے۔ معلوم نہیں یہ نسخہ عربک ٹیکشن میں کیوں داخل کیا گیا۔ لاہوری میں اس داخلہ نمبر کی کتاب کی تحقیق کی جائے تو معاملے پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔

دونوں مہروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ”نسخہ خداداد“ لاہوری کا گم شدہ ”نسخہ لاہور“ ہی ہے۔ قاضی صاحب نے ریوگراف ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء میں حاصل کیا۔ اس کے بعد کسی نے غلطی سے لاہوری سے اڑا لیا، دونوں مہروں کی جگہ کمری، آخری مہر کی جگہ ”فتح دین“ کی چھٹی لکائی۔ پھر رائے میں ”فتح دین“ وجود خادگی سے محروم ہے۔ اب سوال آتا ہے نسخہ ڈاکٹر عبداللہ کا۔ اشعار کے شمار میں غلطی ممکن ہے۔ آپ کسی دیوان کے اشعار ایک بار گن جائیں۔ اس کے بعد دوبارہ گنیے۔ زیادہ تر امکان ہے کہ دونوں بار تعداد مختلف نکلے گی۔ ہاں ہر صفحے کی میزان الگ کاغذ پر لکھ کر بھڑی جائے یا گنتے وقت ہر نیکوہ پورا ہونے پر فہم سے مختلف شعر کے برابر لکھ لیا جائے تو دو دفعہ کے شمار سے گھٹ کر تعداد معلوم ہو سکے گی۔ ڈاکٹر عبداللہ کے نسخے کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ اس میں دو غزلیں راج بھگوار کیا کریں، اور راج: رست کوئی دن اور، کیوں نہ مل سکیں، میں ان کی توجہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ڈاکٹر عبداللہ کا اصل مضمون نہیں دیکھا۔ حسین کے کتابچے میں ص ۶۱ اور ۶۳ پر ڈاکٹر عبداللہ کے نسخے کے جن دو صفحوں کا ٹکس ہے، وہ تو یہی کہتا ہے کہ یہ ”نسخہ لاہور“ سے جدا نہیں۔ غالب کی ذمہ داری کے دیوان کے مرصع نسخے سڑکوں میں بکھرے ہوئے نہیں کہ لاہوری میں دو دو نسخے ہوں اور لاہوری کے کاغذات میں صرف ایک چڑھایا گیا ہو۔ ایسا کوئی شخص نہیں جس نے وہاں دو نسخے دیکھے ہوں۔ لاہوری کے accession رجسٹر میں دیوان کے چھتے نسخے چڑھے ہوں گے، اتنے ہی وہاں رہے ہوں گے۔ اگر صرف ایک نسخہ چڑھا ہے تو دو کے ہونے کا امکان نہیں۔

دیوان میں ۷ کی روایت میں تین اشعار ہیں۔ عرشی صاحب نے ”نسخہ لاہور“ میں غزلوں کے اشعار کی جو تعداد دی ہے، وہ نسخہ عرشی طبع اول میں ۷ کے آگے بھادو لکھی ہے اور اسی لیے میزان ۱۵۴۷ دی ہے جو گھٹ ہے۔ نسخہ عرشی طبع دوم میں ۷ کے اشعار کی تعداد گھٹ کر کے تین لکھی ہے لیکن جملہ اشعار کی میزان اب بھی ۱۵۴۷ دی ہے جو کہ ۱۵۴۸ ہونی

چاہیے۔

اب مختصراً حسین فراقی کے نقطے کی کچھ اور باتیں۔ اس میں ص ۳۰ تا ۳۲ پر جو ذاتیاتی عنصر ہے، اسے چڑھ کر انوس ہو تا ہے۔ (۳) انھوں نے ص ۳۷ اور اس کے آ کے ”نحو غولہ“ مطبوعہ کی جن اخلاط کی فہرست دی ہے، اس میں انھوں نے بہت محنت کی ہے، لیکن زیادہ تر ایسی ہیں جو اعراب و علامات سے حلقہ ہیں اور کچھ کتابت ہو سکتی ہیں۔ ص ۳۳ سے ۳۶ تک انھوں نے اوقاف کے بارے میں جو لکھا ہے، اس کے بیشتر حصے سے اتفاق کرنا ہو گا۔ انھوں نے مرتب کے ناموزوں طبع ہونے کے بارے میں ص ۳۹، ۴۰ کے فٹ نوٹ میں جو وہ مثالیں دی ہیں، ان میں اگر کچھ کتابت کا دخل نہیں تو مترسی کا دھوئی ثابت کرتی ہیں۔ ص ۴۰ سے ص ۴۲ تک دیوان میں ناموزوں مصرعوں کی جو فہرست دی ہے، ان میں سے بیشتر کا قطعی اوقاف یا امزہ یا آخری فون کے نقطے سے ہے جو کتابت و طباعت کی قطعی ہو سکتی ہے، لیکن ذیل کے مصرعے یقیناً غیر موزوں ہیں۔

محرم نہیں تو ہی نوا ہائے راز کا ص ۳۰۹

کہتے ہو قوم سب کہ بت غالب مولا آئے ص ۳۰۹

ہاں مرقوم نہیں اس کا نام ص ۳۱۰

بچوں کا بھی نہ دیکھا تراش کوئی دن اور ص ۳۱۶

حسین نے ص ۲۸ کے حاشے میں ذیل کے شعر کے متن کی طرف توجہ دلائی۔

گر یہ نکالے ہے تیری بزم سے تجھ

ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے

(مخلوط۔ ص ۷۹)

مخلوطے میں ”تیری“ ہے لیکن مرتب نے اپنی تشلیق کتابت میں نحو مرثی کی تقلید میں ”تری“ لکھا ہے جس سے مصرع وزن سے خارج ہو گیا ہے۔ یہ مشاہدہ غیر معمولی عروض دان ہی کر سکتا تھا۔ اس قول کا وزن ہے:

مصرع مشن مطوی مشور یا مجدد

مقتلعت فاعلات مقتلعت رفع یا قاع

اس وزن میں فاعلات کے بعد وقفہ رکھا جائے بھی مصرع موزوں بنائی دے گا۔

مثلاً انشراح کوئی نہیں آس پاس، خوف نہیں کچھ۔ غالب نے فاعلات کی ت کو متحرک مان کر اگلے دکن کے شروع میں ملا دیا، جس سے وزن مسخ ہو گیا۔ اس قباحت کے باوجود یہ شجاعت کرنا کہ مصرع، حیرتی، سے موزوں اور تریٰ سے غیر موزوں ہو جاتا ہے، قصین کی مہارت عروض پر قصین کا طالب ہے۔

مرتب نے داکیں ملنے پر غلطی کا ٹکس اور بانیں ملنے پر نستیق قرأت دی ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے جا بجا اسے صحیح کر کے دی ہے جو نوسن کے ساتھ وقاداری نہیں۔ قصین نے ص ۳۷ پر ایسی کچھ مثالیں دی ہیں۔ ان کا یہ مشاہدہ بھی صحیح ہے کہ مرتب نے دیوان کے آخری حصے میں عزم قطع کے تین عنوانات کو شعر سمجھا ہے۔ الرضیٰ نے اپنے جوائی کتابچے میں توجیہ پیش کی ہے کہ وہ نیم معلوم لکھنا چاہتے تھے لیکن اس میں ”نیم“ بھوت گیا (ص ۳۱-۳۰)۔ قاضی عبدالودود نے ایک اصول قائم کیا ہے: ”بھی کسی بات کی، خواہ اپنی ہو یا دوسرے کی، غلط تاویل نہ کی جائے۔ اپنی غلطی کی خواہ خواہ مختلف کی کوشش فائدہ مند نہیں۔“ (مضمون ”غالب۔۔۔ راہاں پہلوان“ رسالہ ”اردو“ کراچی۔ جنوری تا مارچ ۱۹۷۰ء۔ باز مطالعت مجموعہ ”کچھ غالب کے بارے میں“ حصہ دوم۔ پٹنہ، ۱۹۹۵ء۔ ص ۴۴)

مرتب نے غالب کے دیباچے اور نیز کی فارسی تقریفا کا جو اردو ترجمہ پیش کیا ہے، وہ بجا طور پر قابلِ فخر ہے۔ قصین فرائی نے فارسی متن کی برأت اور اردو ترجمے میں جو تصحیحات تجویز کی ہیں، وہ بھی اسی طرح مایہ نضر ہیں۔ اس سے مجھے یہ تکذیب ہو گیا ہے کہ قصین شعبۂ اردو کے استاد ہیں یا شعبۂ فارسی کے؟ انھوں نے ”نسخہ خواب“ سے بیشتر ان نثرؤں کے ترجموں کی جو تفصیلی نکات دی کی ہے، وہ کم از کم میری معلومات میں اضافہ ہے۔

اب ”نسخہ خواب، تجویز و قصین“ کے مضامین کے بعض قابل ذکر دیباچات پر میرے

مشاہدات:

ڈاکٹر ضیف نقوی نے ص ۳۸ پر کہا ہے کہ ان کے نزدیک مولانا عری، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر عبداللہ کا ”نسخہ لاہور“ اور یہ نسخہ تلف نہیں۔ ص ۳۹ پر انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ وہ نسخہ ہو سکتا ہے جو غالب نے مہاراجا سے پور کے لیے پیش کس

کے لائق جلد اور نھر فریب بزدلان میں سمجھا تھا۔ صہبن نے دونوں باتوں کی تردید کی۔ چونکہ یہ نسخہ نہ جملہ ہے، نہ کسی جزو دان میں ہے اس لیے یہ بے پور والا نسخہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے صہبن الرحمن کی پہلی تردید سے اتفاق نہیں، آفرالذکر سے ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود نے کہا کہ ”نمائندہ صاحب“ کا ۱۲۵۹ھ والا پہلا ایڈیشن ان کے کتب خانے میں موجود ہے۔ (ص ۵۱) رشید حسن خان کی رائے میں یہ نسخہ میں مین نسخہ لاہور معلوم ہوتا ہے۔ (ص ۵۵) ڈاکٹر صہبن نے ص ۵۶ کے فٹ نوٹ میں اپنے مرتب ایڈیشن کی وجہ اطلاع کی گنج کی۔ گنج کے لیے یہ مقام طبر مناسب ہے۔ غلط نامہ مرتب دیوان ہی میں ہونا چاہیے تھا۔ صہبن ایک بار پھر کہتے ہیں کہ ان کو احساس ہے کہ ناچاب یونیورسٹی (لاہور) میں اردو دیوان غالب کے دو خطی نسخے رہے ہیں۔ ایک وہ جسے عرشی وقاضی صاحب نے دیکھا، دوسرا وہ جسے ڈاکٹر عبداللہ نے دیکھا۔ (ص ۵۶)

رشید حسن خاں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ اسے ”نسخہ خوبہ“ کہنے کا جواز نہیں۔ (ص ۵۹)۔ میری پختہ رائے یہ ہے کہ نہ صرف اس کا جواز نہیں بلکہ یہ سخت قاطع اعتراض ہے۔ اس نسخے کا طوبہ منظور صہبن سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے اسے شاید دیکھا بھی نہیں۔ وہ ماہر غالبیات نہیں تھے۔ صہبن صاحب کی ان سے حقیقت سر آگھوں پر لیکن وہ اپنے کام کو دوسرے کے نام کیونکر کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دولت خانے کا نام ”نسخہ منظور صہبن منزل“ رکھ دیں تو اس سے ان کا مکان تلاش کرنے والوں کو مقابلے میں ڈالنے کے سوا اور کیا ہو گا۔ اگر اپنی تدوین کو کسی طبر متعلق شخص کا نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے تو اس کا غلط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ضرورت مند اپنی تدوین کو کسی صدر شعبہ، وائس چانسلر، وزیر یا کسی اور صاحب اقتدار کا نسخہ کہہ سکتا ہے، اس توقع پر کہ اس سعادت نرائی سے اس کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کوئی لابی صدر شعبہ اپنے خدو اور شاگردوں کے تدوینی کاموں کو اس کے نام سے وابستہ کرنے اور اس کا مناسب صلہ پانے کا اشارہ کر سکتا ہے۔ مرکزی یونیورسٹی حیدرآباد دکن میں میرے ایک شاگرد نے میری نگرانی میں ریمان لکھنوی کی مشہور ”پانچ بہار“ (گل پکاولی) مرتب کی۔ دہلی یونیورسٹی میں ڈاکٹر خوبہ احمد فاروقی کی نگرانی میں دہاس کی فرنیچ ”تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی“ کا اردو ترجمہ کیا، یہ حضرات حقیقت سے مغلوب ہو کر اپنے کاموں کو نسخہ کیاں چند یا ”نسخہ طوبہ“ احمد فاروقی

کہنے کو مصر ہوتے تو کیا اس کی تہ میں کوئی اور مقصد نہ ہوتا۔ ظاہر ہے ڈاکٹر حسین الرحمن کا اقدام بے لوث تھا، لیکن یہ ایک غلط مثال قائم کرتا ہے۔

حسین صاحب نے کالی داہں گپتا رشنا کے نام کے خط میں لکھا ہے کہ ایک خوش دوستی شخص انھیں ۱۹۸۵ء میں اس خطے کے لیے اسی ہزار روپے کی پیش کش کر رہے تھے۔ اس زمانے میں حسین کو اپنے گھر کی تعمیر کے لیے روپے کی ضرورت بھی تھی لیکن پھر بات وہ گئی۔ (ص ۶۳، مکتوب مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۶ء)۔ اس کے بعد انھوں نے اس خطے کو پنجاب یونیورسٹی کو دینا پیش کر دیا۔ ۸۵ء کے ۸۰ ہزار روپے آج کے تین چار لاکھ کے برابر ہوں گے۔ میں حسین صاحب کے اس غیر معمولی ایثار کی قدر کرتا ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ مسٹر حسین بھی کم سے کم اس علم دوستی کی داد دیں گے۔ (۵) اگلے صفحے پر حسین صاحب کہتے ہیں کہ شاید ہی غالب کی زندگی کے کسی مخطوطے کی ایسی جھیل و کھلیل اشاعت ہوگی (ص ۶۵)۔ میرا خیال ہے کہ نسخہ عرشی زادہ بھی بہت دیدہ زیب ہے۔ نقوش کی بیاض غالب بھی اچھی خاصی ہے۔ ڈاکٹر سلطانہ بخش نے اپنے مفصل مقالے میں بجا کہا ہے کہ مرتب نے متن میں کسی لفظ کے اضافے کو واضح ٹیکروں کے بیچ نہیں لکھا (ص ۱۵۱)۔ خود انھوں نے اس صفحے پر اشعار کے حوالے میں کہیں مخطوطے کے صفحے کا، کہیں مطبوعہ ایڈیشن کے صفحے کا حوالہ دیا ہے۔ اول الذکر عدد شمار صفحے کے اوپری حصے میں اور آخر الذکر صفحے کے چپے کے حصے میں درج ہے۔

انتظار حسین نے لکھا ہے ”پہلا مخطوطہ جو اب نسخہ حیدرہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ (ص ۱۷۵)۔ وہ اہلخانے میں ایک غلطی کے سرکب ہوئے ہیں۔ نسخہ حیدرہ مفتی انوار الحق کے اس مطبوعہ ایڈیشن کا نام ہے جس میں غالب کا منسوخ اور متداول دونوں طرح کا پورا کلام شامل ہے۔ مخطوطہ بھوپال میں صرف ۱۸۴۱ء تک کا کلام تھا۔ ص ۲۳۹ پر سیف اللہ خالد نے لکھا ہے کہ سرسید نے نیر کی تقریظ کو اردو کا لباس پہنایا۔ حسین الرحمن حاشیہ لگاتے ہیں کہ کام سرسید نے نہیں کیا تھا، فیاض محمود اور اقبال حسین کی سہی ہے۔ حسین فراہی کی رائے میں یہ دوبرائے ہاں کا کام ہے (اصل حقائق ص ۳۹، ۵۰)۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے لکھا ہے کہ نئے دریافت شدہ نسخے کو پہلے نسخہ امروہہ اور پھر نسخہ عرشی زادہ کا نام دیا گیا (ص ۲۹۲)۔ انھوں نے ترجمہ الٹ دی ہے۔ نسخہ عرشی زادہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع

ہوا، نقوش کا ایڈیشن کئی بار بعد۔ پھر ”نسخہ عربی زادہ“ مطبوعہ ایڈیشن کا نام تھا، محفوظ کے لئے نہیں۔

مصمیم الرحمن کا کتابچہ ”صحیح صورت حال“ ان کے ولی کرب اور صدے کا آئینہ دار ہے۔ مجھے انھوں نے کہ فریقین کو فوجیاتی امور میں الگ پڑا۔ (۶) مصمیم صاحب نے اپنے کتابچے میں مشفق خویہ کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ ایک صاحب ہیں جن کا کام ہی ہے کہ دوستوں میں خفاق پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں (ص ۱۲)۔ شخص مذکور کا نام نہیں دیا۔ اس سے مجھے گمان ہوا کہ شخصیت مرموز حسین فراقی ہیں۔ میں نے مشفق خویہ سے وضاحت چاہی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ حسین نہیں، کوئی اور ہے۔ کتابچے میں مصمیم صاحب نے مقررہ کے اعتراضات کے جو جواب دیے ہیں وہ کہیں قائل کرتے ہیں۔ (۷) تو بعض اوقات جذبات نگ معلوم ہوتے ہیں۔

انھوں نے ص ۲۸ پر آخری پیرا گراف میں ”نسخہ خویہ“ محفوظ کے لئے بھی استعمال کیا ہے اور مطبوعہ کے لئے بھی۔ وہ اپنے مطبوعہ ایڈیشن کو کوئی بھی نام دیں لیکن محفوظ کو صرف ”نسخہ لاہور“ یا ”نسخہ ۱۸۵۲ء“ کہہ کر ہی اس کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ”ممکن ہے یہ محفوظ کبھی کسی فتح دین، منی شخص کی ملکیت رہا ہو۔“ (ص ۲۹) اس قیاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب قاضی عبدالودود نے ۵۸ء۔۱۹۵۷ء میں نسخے کا رٹو گراف لیا تب تک آخری صفحے پر لاہوری کے نمبر داخل کی ضرورت تھی۔ فتح دین کی جہی اس کے بعد ہی چپکائی گئی ہے، اس لئے میری رائے میں یہ فرضی نام ہے۔

کتابچے کے آخر میں تین وضاحتی صفحے ہیں۔ ان کی ضرورت پڑی، یہ صوبہ انھوں نے۔ دراصل دونوں کتابچوں کو پڑھنے کے بعد دکھ اور اداسی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ (۸)

اب میں مصمیم الرحمن کی تدوین کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ دراصل اس موضوع پر سب سے پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن میں نے دوسری کتابوں کو اس لئے پہلے لیا تاکہ نسخے کے کئی پہلو زیر بحث آجائیں تو تدوین کے سلسلے میں غلطی نہ کرنی پڑے۔

مطبوعہ ایڈیشن کے ”حرفے چند“ میں لکھتے ہیں کہ ان کے پاس ”امانہ عجائب“ طبع اول ہے جو فسانہ عجائب پر کام کرنے والوں کو بھی ذہل سا (حاشیہ ص ۵)۔ حقیقت یہ ہے

کہ میں نے ۱۹۶۲ء یا ۶۳ء میں رضا لاہوری رام پور میں یہ ایڈیشن دیکھا تھا۔ "نظری داستانیں" طبع دوم کے ص ۳۴۰ پر اطلاع دی ہے کہ یہ ڈاکٹر محمود الہی کو بھی مل گیا۔ نیز مسعود کے ذاتی کتب خانے میں اس کے ہونے کا ذکر پیچھے آچکا ہے اور رشید حسن خاں کے بارے میں مرتبہ خود ہی لکھ چکے ہیں کہ ان کے پاس ہے۔ یہ چار نسخے ہوئے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نایاب نہیں۔ "حرفے چند" کے آخر میں کوئی تاریخ درج نہیں لیکن یہی تحریر "تجزیہ و تحسین" میں بھی شامل ہے جہاں اس پر ۲۳ مارچ ۱۹۹۷ء درج ہے۔ (دیکھیے اس کا ص ۱۹۰)

ابتدا میں انہوں نے مخطوطے کے چار صفحوں کا جو رنگین فوٹو دیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دیوان غالب کے چھٹے نسخے ابھی تک افلا کیے گئے تھے، ان میں سے کوئی بھی اتنا مرصع و مذہب نہیں۔ اس کے شروع میں مخطوطے کے تعارف میں، جو دراصل مقدمہ ہے، مرتب نے تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ (۹) لیکن وہ جو بار بار مخطوطے کو "نسخہ خولبہ" کہتے ہیں اس سے مجھے دھچکا لگا ہے (ص ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳ وغیرہ) مثلاً لکھتے ہیں، "نسخہ خولبہ" میں غالب کے اپنے قلم سے جو ترنیم یا مثنوی ہوئی ہے" (ص ۲۰)۔ غالب نے خواب میں بھی نہ سوچا ہو گا کہ وہ جس نسخے میں تصحیح کر رہے ہیں، وہ نسخہ غالب نہیں، "نسخہ خولبہ" ہے۔ کون سا خولبہ، خولبہ نظام الدین اولیا یا خولبہ میر درد؟

مقدمے کے مختلف اجزاء کے، مثلاً غالب کے قلم کی اصلاحوں کی تفصیل، یہی ہوئی انشاء کا متصل بیان، لکھتے ہیں فاضل مرتب نے بہت محنت کی ہے۔ (۱۰) انہوں نے عرش، قاضی اور ڈاکٹر عبداللہ کے بیانات کو نقل کر کے قاری کے لیے بہت سہولت ہم پہنچا دی ہے۔ اس کے لیے وہ ہر شے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ آخری فصل میں انہوں نے دکھایا ہے کہ مئی ۱۸۳۷ء (دیوان غالب طبع دوم) اور اگست ۱۸۵۲ء (موجودہ نسخہ) کے درمیان غالب کی کون کون سی غزلیں اور دوسرے اشعار وجود میں آئے۔ اس طرح جہاں تک ہمارا سوال ہے، مقدمہ تحقیقی اعتبار سے نفعی بخش ہے۔ (۱۱)

آگے متن دیا ہے جس میں دائیں صفحے پر مخطوطے کا ٹکس اور بائیں صفحے پر تصحیح قرأت ہے۔ اس میں انہوں نے ایک بڑی بھول یہ کی ہے کہ قرأت مخطوطے کی عکاس

نہیں، وہ یمن صاحب کے صحیح شدہ متن کو پیش کرتی ہے۔ مثلاً دیوان کے ص ۶ کے آخری شعر میں ”ہارغ نسیاں کا“ ہے جب کہ شعلیق شعل میں ”تھاق نسیاں کا“ دیا ہے۔ قرأت کے بارے میں مزید کچھ تفسیر فراقی اور سلطانہ بخش لکھ چکے ہیں۔ تہذیب کی دوسری اس سے بھی بڑی کمی یہ ہے کہ اس میں اختلاف نسخ نہیں دیے۔ کم سے کم ذرا بحث نئے سے فوراً ماقبل اور مابعد کے خطی و مطبوعہ متون اور اس نئے کے اختلافات دینے ضروری تھے۔ اپنی قرأت میں جہاں جہاں انھوں نے متن مغلطہ سے اختلاف کیا ہے، وہ بھی اختلاف متن میں ظاہر کر دیا جاتا۔ تیسری کمی یہ دکھائی دیتی ہے کہ غزلوں اور دوسری اصناف کی نظموں کو تلاش کرنے کا کوئی طریقہ نہیں اپنایا، خواہ شروع میں مصرعوں کی فہرست دیتے یا آخر میں عرشی صاحب کی طرح مختلف اشارے بناتے۔ فی الوقت کسی غزل یا مخصوص شعر کو نئے میں تلاش کرنا بہت وقت طلب ہے۔

کالی داس گپتا رضا کے کام کے بعد کام کی توقیت کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ صنف وار توقیت دینا، توقیت کے مقصد کے خلاف ہے۔ مثلاً ۱۸۴۷ء اور ۱۸۵۲ء کے ج کے غزلوں کے بعد ۱۸۴۱ء تک کے قصیدے یا ۱۸۱۶ء تک کی رباعیاں درج کی گئیں تو یہ تاریخی ترتیب کہاں دی؟ اس کے بعد توضیحات و تعلیقات کے عنوان کے تحت ص ۳۱۳ سے ۳۲۸ تک جو کچھ دیا ہے یہ دراصل دی سے جیسے تحقیق کی اصطلاح میں حواشی کہا جاتا ہے۔ انھیں حواشی کی طرح ملا کر لکھیں تو اور بہتر ہوتا۔ یہ فصل معلومات کا گنجینہ ہے۔ مجھے اس کے بارے میں چند مشاہدات پیش کرنے ہیں:

- ۱۔ ان حواشی میں بہتوں میں کسی غزل یا شعر کا زمانہ طے کیا ہے لیکن اس دریافت کو توقیت میں نہیں سمجھا گیا۔ دیکھ کر ویسے تو توقیت میں اور جزئیاتی صحت آجاتی۔
- ۲۔ ص ۳۲۱ ”سر غزلبوری (دیباچہ گلزار ابراہیم)۔“ یہ ص ۳۹ کے شعر کے تحت لکھا ہے۔ مرحب کا بڑا سہو ہے۔ ”سر غزلبوری“ کی ایک نثر ابراہیم عادل شاہ جانی کی کتاب ”نورس“ مصنف ۱۰۰۶ھ/۱۵۹۷ء کا دیباچہ تھی۔ تذکرہ ”گلزار ابراہیم“ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء کی تصنیف ہے۔

- ۳۔ ص ۳۲۳ ص ۵۸ پر مصرع لکھا ہے: رب داس پہنچ کر جو خوش آتا ہے ہم بے ہم کو۔ رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ”تہذیب و تحقیق“ میں لکھا ہے کہ ”پتے

ہم" کوئی لفظ نہیں۔ یہ پیہم کی گڑی ہوئی صورت ہے۔ وزن کے رکن فعلاتن پر تسکین اوسط کا زحاف لگا کر فعلوں بنا لیا ہے۔ (دہلی ۱۹۹۹ء، حاشیہ ص ۱۳۶)۔ میں خاں صاحب کے قول سے حقیق ہوں لیکن یہ کہوں گا کہ تسکین اوسط کے زحاف نے مصرع کو کمر شکست، غیر مختم اور بدلتا بنا دیا ہے۔

۴۔ ص ۳۲۹۔ قول "جاں کے لیے، آسان کے لیے" پر حاشیہ دیتے ہیں کہ یہ قول نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ ایسا ہی آزاد نے "آپ حیات" میں لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود کی تحقیق ہے کہ آزاد سے حافظ نے دھوکا دیا۔ یہ مشاعرہ مومن کے ایک اور شاگرد اصغر علی خاں اصغر رام پوری کا ہو گا کیونکہ دیباچہ "دیوان نسیم" مرحومہ سلیم شاگرہ نسیم میں صراحتاً لکھا ہے کہ نسیم ۱۲۳۳ھ میں دہلی سے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ نسیم کا مشاعرہ ۱۲۳۳ھ (۲۹-۱۸۴۸ء) کے بعد نہیں ہو سکتا تھا (اردو میں ادبی تحقیق کے بارے میں۔ پٹنہ ۱۹۹۵ء۔ ص ۲۳)۔ کپتا رضا نے بھی مجھے لکھ کر اپنے مرتبہ دیوان کے ص ۳۸۸ پر بھیج کر دی۔ مبین صاحب نے اس حاشیہ میں قتل حسین خاں کے بارے میں اچھی تحقیق کر کے مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔

۵۔ ص ۳۳۱۔ یہ قصیدہ نسیم حیدر (۱۸۲۱ء) کے متن میں شامل ہے۔ "بھائی میرے! "نسیم حیدر" ۱۸۲۱ء میں نہیں، ۱۹۲۱ء میں آیا۔ اس مطبوعہ ایڈیشن میں محض ۱۸۲۱ء تک کا کلام نہیں، غالب کا تقریباً تمام کلام شامل ہے۔ ۱۸۲۱ء کے قطعی دیوان کو "نسیم حیدر" نہیں کہہ سکتے جس طرح ۱۸۵۲ء کے دیوان کو "نسیم خوجہ" کہنا غلط ہے۔

۶۔ ص ۳۳۲۔ یہاں بھی ص ۱۱۶ کے دو منطقی نثری عنوانات کو شعر کی طرح لکھا ہے۔ حواشی کے بعد فارسی دیباچے اور خاتمے کا اردو ترجمہ ہے جس کی دلاؤ ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر عزیز مسعود جیسے علمائے فارسی دے چکے ہیں۔ اس کے بعد میرے حریف کہنے کی محافل ہی نہیں۔ پروفیسر نذیر احمد تو ڈاکٹر مصین الرحمن کی مہارت فارسی سے اسنے متاثر ہونے کو لکھتے ہیں۔ (۱۲)

آپ نے "دھنڈ" پر کام کیا ہے، اس مناسبت سے اگر آپ "وسا حیر" پر کچھ توجہ

کریں تو بہت ... مناسب ہو گا ... یہاں (بھارت میں) تو مجھے کوئی نظر نہیں آتا جو اس کام کے لیے آمادہ ہو۔“ (تجوید و تحسین۔ ص ۲۹)

دسائیر کی زبان جھلی قاری ہے۔ ڈاکٹر غلام احمد اس پر کام کرنے کی فرمائش کر کے ڈاکٹر مصیبن کے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ ڈال رہے ہیں۔

کتالیات پر مجھے کئی اعتراضات ہیں۔ معلومات کلام غالب میں انھیں ”دیوان غالب“ بخط غالب اور دیوان غالب نسخہ فوہدار از احمد شاہ کے شمول کا کوئی حق نہ تھا، کیونکہ انھوں نے ان معلومات کو نہیں دیکھا۔ آخر الذکر کو معروف ہے ”نسخہ حمید“ کہنا غلط ہے۔ انھوں نے ”دیوان غالب، نسخہ رام پور قدیم“ بھی نہیں دیکھا۔ نمبر ۶ تا ۸ تک کے خطوط کو اگر دیکھا ہو تو ٹھیک ہے، اگر ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا تو اس کا اندراج نہیں کرنا تھا۔ حیرت ہے کہ مطبوعات غالب میں شامل کم از کم ۹ کتابوں کو دوبارہ مخرق مآخذ و مصادر کے تحت شامل کیا ہے۔ اسے پرانے استاد کو کتالیات میں تعداد بڑھانے کا اتنا شوق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اخبارات و رسائل کے تحت نمبر ۱۲ کے مقالہ نگار کا نام ڈاکٹر عبدالودود لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود لکھنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھے، مریض لیے عرصے تک ضرور رہے۔ اسی طرح ”نسخہ خدیجہ، تجوید و تحسین“ میں ص ۸ کے آخر میں ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری لکھا ہے، وہ بھی ڈاکٹر نہیں، لیکن اس اندراج کے ڈے دار مرتبین ہیں۔ زیر بحث نسخے میں کتابیات کے حریہ مآخذ کے تحت امیر کبیر نواب محسن الاسرائیلی وہ چھپنکی کتابیں اور ملا مصیبن الدین واعظ الکاشفی کے خطوط ”معارج العلمت“ کے شمول کو دیکھ کر تبسم کرنا پڑتا ہے جیسا کہ تحسین فراقی نے اپنے کتابچے میں ص ۵۸ پر لکھا ہے۔ ان سے اور ”قسان عجائب“ طبع اول سے کوئی حوالہ اور اقتباس نہیں دیا۔ میں ان میں ”قسان عجائب“ کے قلم اور ایڈیشنوں نیز اپنی کتاب ”سبزی داستانیں“ کو بھی شامل کروں گا، یعنی حریہ مآخذ کے آٹھ اندراجات میں سوائے نمبر سات کے بقیہ سب مشروط ہیں۔

ڈاکٹر مصیبن الرحمن حیات غالب کے اس خطوط کو محفوظ رکھ سکے اور دوسرے معلومات دیوان کی طرح اسے کم نہ ہونے دیا، اردو دنیا پر یہ ان کا بڑا احسان ہے۔ (۱۳) حرف آخر کے طور پر میں یہ کہوں گا کہ میرے بعض مشاہدات اور ڈاکٹر تحسین فراقی کے جملہ اعتراضات کے باوجود میں مصیبن الرحمن کے اس کام کو اچھی تدوین کہوں گا۔ (۱۴) اسے

مولانا مرثی کے نسخہ مرثی کے معیار سے نہ پرکھے۔ (۱۵)

(ہفتہ وار "اعادہ زبان"، نئی دہلی۔ ۲۰۰۱ء)

پس نوشت:

"نسخہ خواہ" پر مضمون ناشر کو بھیجنے کے چند روز بعد مجھے بزرگ ماہر غالبیات سید قدرت نقوی کا ۷۷ صفحوں کا کتابچہ "دیوان غالب" "نسخہ خواہ" یا نسخہ مسروقہ، ایک جائزہ" ملا۔ یہ کراچی سے اگست ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں جلد کتاب "نسخہ خواہ، تجربہ و حسین" نیز حسین فراقی اور خود مصین الرحمن کے کتابچوں کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن اس میں ڈاکٹر مصین الرحمن کے کام پر سخت تکتہ چینی کی ہے۔ موقع نہیں کہ میں نقوی صاحب کے کتابچے کا مفصل جائزہ لوں۔ اس کے اہم مضمولات کا اپنے الفاظ میں خلاصہ کرتا ہوں:

۱۔ شروع میں انھوں نے "ماہ نو" جولائی ۱۹۵۳ء سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا پورا مضمون نقل کر دیا ہے (ص ۱۳۵۵)۔ اس میں مرثی صاحب کا مفصل تحقیقی نقطہ ص ۹۷۷ پر شامل ہے۔

۲۔ ڈاکٹر عبداللہ کے مضمون میں ایک جملہ ہے "حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوان اردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے"۔ اس کے معنی ہیں کہ یہ نسخہ لائبریری میں ۵۳ یا ۵۴ء میں آیا۔ مصین الرحمن نے اپنی تدوین میں اس جملے کے الفاظ "حال ہی میں" حذف کر دیے (ص ۱۳) لائبریری کے داخلہ ۶۸۱۳ سے واسطے کی صحیح تاریخ معلوم ہو سکتی ہے۔

۳۔ ڈاکٹر عبداللہ اور مصین الرحمن کا یہ قیاس درست نہیں کہ یہ نسخہ ۱۸۵۷ء کی غارتگری میں لٹا۔ اگر یہ اس سنگ مائیک کے پاس رہا ہوتا تو اس میں ۱۸۵۶ء تک کا حکام ہوتا، جو نہیں ہے۔ (ص ۱۵)

۴۔ غالب کے اردو دیوان کا دیباچہ "کلیات بحر غالب" ص ۵۶ پر دیباچہ "کل رعنا" کے بعد اور خاتمہ "کل رعنا" کے پہلے، درمیان میں دیا ہے جس کے معنی ہیں کہ یہ دیباچہ، "کل رعنا" کی تدوین کے وقت لکھا گیا۔

۵۔ ڈاکٹر مصححین نے خطوط دیوان میں ۷۸ کا ایک شعر۔ ہو کر شہید مفتاح..... دوش ہے،
تسلطیق کتابت میں حذف کر دیا ہے۔ (ص ۲۰) اس پر نقوی صاحب کا اعتراض
بجا ہے لیکن انھوں نے حداول شعر۔ نے مژدہ وصال..... چشم و گوش ہے، کو
تسلطیق میں شامل کرنے پر کیوں اعتراض کیا ہے، سمجھ میں نہ آیا ہے، کیونکہ یہ
خطوطے میں موجود ہے۔

۶۔ ص ۲۲ سے ص ۳۱ تک مصححین الرحمن کی تعداد اعداد میں حساب کتاب کی غلطیاں
دکھائی ہیں۔

۷۔ اس نسخے پر کھنڈے والوں میں سے کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ
غالب نے اپنا اردو دیوان کس کس کو بھیجا۔ نقوی صاحب نے غلطوں سے مدد یافت
کیا کہ مطبوعہ ایڈیشن آٹھ حضرات کو بھیجا گیا اور قلمی نسخہ صرف دو کو: مہاراجا بے
پور اور نواب یوسف علی خاں دلی رام پور کو۔ یہ دیوان مہاراجا بے پور والا نسخہ
ہے۔ تقسیم ملک کے فساد میں کسی نے اسے چھپا کر جزدان الگ پبلشنگ دیا ہو گا۔
مرصع جلد الگ کر دی۔ غالب نے عا غلطوں میں بے پور کو دیوان بھیجے اور اس
کے صلے کے انتظار میں بے چینی کا بیان کیا ہے۔ آخر ۱۳ جون ۱۸۵۳ء کو بھڑوی
لی (ص ۳۷ تا ۳۸)۔ حنیف نقوی نے سب سے پہلے یہ قیاس کیا تھا۔ اب دیکھا
جاتے کہ خطوطے پر جلد دوبارہ بانٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ نہیں۔ خطوطے کی
تیماری اور صلے کے ملنے کی تاریخ معنی خیز ہے۔

۸۔ نقوی صاحب نے محض اور رتقین لوحوں اور جد دلوں کا ماہرانہ جائزہ لیا۔ غالب
کے دوسرے تمام نسخوں کے شروع میں لوح پر مسلمانوں کے حیرک کلمات ہوتے
ہیں لیکن اس دیوان میں کوئی اسلامی کلمہ نہیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کسی
غیر مسلم کو پیش کیا گیا۔ اسے دو بار چھاپا گیا۔ ایک دفعہ مہاراجا بے پور کے یہاں
سے دوسری بار پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے۔ (ص ۴۳ تا ۴۶)۔

۹۔ خواجہ منظور حسین کے نام دیوان کو منسوب کرنا کافی تھا۔ ان کے نام سے موسوم کرنا
درج بالذم ہے۔ (ص ۴۷)۔

سید قدرت نقوی کا سنا بچہ طبعی اعداد میں لکھا ہوا عالمانہ ہے۔ (مجھے اطلاع ملی ہے

کہ مصیبت الرضیٰ نے غلط طے کے ہر ورق کو Laminato کرا دیا ہے۔ کسی لیور پٹری میں بھیج کر ”فتح دین“ والے مسئلے کا خلاف کھلوایا جائے، جی ہٹائی جائے اور حقیقت برآمد کرائی جائے۔

حواشی و تعلیقات

رفاعت علی شاہ

- ۱۔ سید قدرت نقوی مرحوم کے کتابچے کے کوائف درج ذیل ہیں ”دعوان غالب، نسخہ خوب یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جاتہ۔“ کراچی، مکتبہ تحقیق ادب۔ اگست ۲۰۰۰ء۔
- ۲۔ ڈاکٹر حسین قرانی کے مطابق ڈاکٹر گیان چند جین سے ان کی اکتوبر ۱۹۹ء میں گیان چند صاحب کے اقامت خانے پر یہ مقام حیدرآباد دکن تفصیلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے مقالے ”گزشتہ نصف صدی کی اردو تحقیق“ میں حسین صاحب کی مرچہ کتاب ”گاہیات فرنگ“ کے عالمانہ مقدمے کے لیے کلمات توصیف کہہ چکے ہیں۔ ”دیکھئے نیا دور“ نگینوں کا ”نصف صدی نمبر“۔ ص ۳۴۔
- ۳۔ جنھیں مقالہ نگار ”ذاتیات“ قرار دے رہے ہیں، وہ ناگزیر حقائق تھے جن کا ذکر ”نسخہ لاہور“ کے ضمن میں ضروری تھا۔ ”ذاتیات“ سے مقالہ نگار کی مراد غالباً ڈاکٹر مصیبت الرضیٰ کے ان ادبی گھمبوں کے بیان سے ہے جن کا تعلق زیر بحث ”دعوان غالب، نسخہ لاہور“ سے براہ راست نہیں۔ حلفا رشید احمد صدیقی کے ساتھ جعلی تصویر ملائی، ”جاگیر غالب“ اور ایم اے کی طالبہ کے مقالے کو اپنے نام سے شائع کرانا وغیرہ۔ پھر ری رائے میں ”دعوان غالب، نسخہ لاہور“ کے معاملے میں مصیبت الرضیٰ صاحب کی جعل سازی کی گئی تصویر مذکورہ ”ذاتیات“ کے ذکر کے بغیر صحیح طور پر واضح نہیں ہو سکتی۔ اگر بحث کا دائرہ محض ”دعوان غالب، نسخہ لاہور“ تک محدود رکھا جاتا تو اعلازہ ہے کہ اسے کوئی زیادہ اہمیت نہ دی جاتی۔

لیکن ڈاکٹر حسین الرحمن کی دیگر طبی جدوجہدوں کے ذکر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عادی مجرم ہیں۔ حسین صاحب کے کردار کی یہ اصل تصویر مذکورہ ”ذاتیات“ کے ذکر کے بغیر واضح نہیں ہو سکتی۔

۳۔ حیرت ہے گیان چند جین جیسا بالغ فخر مطلق جان مطلق کو ”ذاتیات“ میں شمار کرے۔ ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کے ص ۲۰ تا ۲۲ میں کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے
ص ۲۰، ۲۱ پر ڈاکٹر حسین فراقی نے اس شب کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر حسین الرحمن نے مسجد ”نسو ٹولہ“ اور نسو حصار ڈاکٹر سید عہد اللہ میں جن اختلافات کی نشاندہی کی ہے، یہ اختلافات جعل سازی سے بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً بعض الفاظ میں نقطے بڑھا کر اور بعض کے کسی حرف کے کسی حصے کو کمرچ کے صپ مطلب ترسیم کر کے دونوں مذکورہ نصوص میں اختلافات پیدا کرنے ممکن ہیں۔ ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کی درج ذیل مہارت پر غور کیا جانا چاہیے۔ گیان صاحب نے اس مہارت میں جان کی کئی تحصیل کو بھی ”ذاتیات“ میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی کی مہارت یہ ہے۔

”بدگمانی تو نہیں کرنی چاہیے مگر چونکہ تحقیقی و تدوینی معاملات میں بدھشتی سے خود حسین صاحب کی شہرت اچھی نہیں۔ اس لیے بعید نہیں کہ یہ ”کار خیر“ انہی کے ہاتھوں اہتمام پایا ہو۔ آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اسے چھپا سکتا ہو (دیکھیے) ”جدید اردو نثر“، ۱۹۸۷ء کا ایک نمونہ)، جو شخص پرتوی چند کی ”کامیاب غالب“ اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے، ”سورج“ کا غالب نمبر۔ ۱۹۹۶ء)، جو شخص اپنی ایم اے کی شاگرد بٹری باسط کے مقالے ”ابو جعفری۔ شخصیت اور شاعری“ (۱۹۹۱ء) کا پشتر حصہ اپنے نام سے ”نقوش“ میں چھپا سکتا ہو (دیکھیے ”نقوش“، شمارہ ۳۹، ص ۶۶۳ تا ۶۶۹) اور اسی قبیل کے دیگر کئی ناموں تک کام (جن کی تفصیل بھی آنکھوں کر سکتا ہو، اس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کمزور لمحے میں اس سے یہ خواہش ہو ”مرزد“ ہو گئی ہوں! ایس، خطامودہ نام وچشم آفریں دارم، والا معاملہ ہے، معاملہ نہیں لڑیہ ہے۔ (ص ۲۰) (۲)

یہ اقتباس واضح کرتا ہے کہ اس سب کا تعلق ”نسو لاہور“ اور اس کے قصبے سے ہے۔ اس اقتباس کے ساتھ حاشیہ نمبر ۳ کو ملا کر پڑھا جائے تو صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین غالب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حسین صاحب کے کتابچے میں جعل ”ذاتیات“ غالب“ کے ”نسو ٹولہ“ اور ”نسو لاہور“ تک بحث کو محدود رکھا جاتا، حسین الرحمن کے دیگر ادبی گہلوں کی نشاندہی اس میں نہ کی جاتی، لیکن غور فرمائیے۔ مذکورہ بالا جان میں حسین

صاحب کے دیگر ادبی کمپلیوں کا ذکر "نسوخ لاہور" کے ضمن ہی میں آیا ہے۔ اقتباس مندرجہ بالا کے پہلے جملے کو بڑھئیے۔ اس جملے میں جس حقیقت کا بیان کیا گیا ہے، بعد کے بیان کردہ ادبی کمپلیوں کی تفصیل اس حقیقت کو تقابلاً اور تقویت دینے کے لیے نہایت ضروری تھی۔ گویا مصنف صاحب کے مذکورہ ادبی کمپلیوں کی تفصیل "نسوخ لاہور" میں عمل سادگی کے قیاس کو یقین میں بدل دیتی ہے، اور ظاہر ہے یقین کی حد تک یہ قیاس مصنف صاحب کے دیگر ادبی کمپلیوں کے بیان کے بغیر نہ کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر حسین لڑائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مصنف صاحب کے طریقہ ہنوس ناک کاموں کی تفصیل بعد میں پیش کی جائے گی۔ گویا وہ اس کتاب میں مصنف صاحب کے طبع متعلق ہنوس ناک کاموں کی تفصیل بیان کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیا ان چند صاحب نے ڈاکٹر حسین لڑائی کے اس بیان کو اہمیت کیوں نہیں دی؟ میں سمجھتے ہوں کہ قاصر ہوں۔

۵۔ یہ امر بایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ مصنف "نسوخ لاہور" اصل میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نام شدہ نسخہ لاہور ہی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی ایک رائے یہ ہے:

"ڈاکٹر مصنف الرحمن حیات غالب کے اس مخطوطے کو مخطوطہ دکن کے اور دوسرے مخطوطات ورجان کی طرح اسے سم نہ ہونے دیا۔ اردو دنیا پر یہ ان کا بڑا احسان ہے۔" (مضمون خزانہ آفری سے پہلا صفحہ)۔

بعض دیگر اہل علم بھی مصنف صاحب کے بارے میں یہی موقف رکھتے ہیں۔ مجھے ایک بار پھر بڑے ہنوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے بزرگ محقق اور ادیب نسخہ لاہور کے قصبے کی گنجی کا یا تو اور اک ہی نہیں کر سکتے، اور اگر انہیں اور اک ہوا بھی تو کسی مجبوری، دباؤ یا تعلقات کی خاطر وہ حقیقت سے آنکھیں چرا کر گلی پٹی لگا کر کہتے اور بچ بولتے اور لکھتے سے کھڑے رہے۔ مدد ہنوس!

اگر معاملہ واقعی اتنا ہوتا کہ "نسخ لاہور" کسی طرح مصنف صاحب کے پاس پہنچ گیا اور انہوں نے اسے حفاظت سے رکھ کر اب شائع کر دیا، تو یقیناً ہم بھی مصنف صاحب کے مضمون ہوتے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہے۔

۱۔ خطے کے م ۲۲ کے پیچے سے Accession No. 6812 کا کھرچا جانا اور خطے کے آخر میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی مذکورہ سر "نسخے دین / فتح دین" کی چھپی لکھا یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سب مال سرودھ کو اپنا بنانے کی غرض سے کیا گیا۔ اگر یہ عمل سادگی مصنف صاحب نے نہیں کی تو یہ فطری اس فرق کہ وہ مخطوطہ حاصل ہونے کے بعد آفری خطے پر "نسخے دین" کی چھپی اتار کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں یہ مخطوطہ ۱۹۸۱ء کے

لگ بھگ حاصل ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں اس کی اشاعت کے وقت اسے سترہ سال کے "لگ بھگ" ہو گئے کہ یہ صحیفہ صاحب کے پاس رہا، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے اس دوران یہ تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی کہ "نئے دین" کی کبھی کی ہے۔

ب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا عرفی اور قاضی عبدالودود کے تحریف پائے چڑھ کر اور "نسب غریبہ" لحاظ کر کے کئی اہل علم اس نتیجے پر، یہ ایک نظر بھی گئے کہ یہ "نسب لاہور" ہی ہے۔ کیا سترہ سالوں میں صحیفہ صاحب کو اس کا اور اک نہ ہو سکا۔ یقیناً ہو گیا، اسی لیے تو انھوں نے ہڈ دھڑ سے اپنے مقدمے میں "نسب غریبہ" کو "نسب لاہور" سے الگ نسب ثابت کرنے میں اپنی چوٹی کا زور لگا دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس مقدمہ کے لیے یہ کہانی بھی کمزری کہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری میں "دیوان غالب" کے ایک سے زائد نسخے تھے ("نسب شیرانی" کو چھوڑ کر)، جو اب غائب ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ خود "اشارہ غالب" (جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۹ء) میں یہ لکھ چکے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری میں "دیوان غالب" کا ایک ہی مخطوط ہے ("نسب شیرانی" کو چھوڑ کر)۔

ج۔ اگر صحیفہ صاحب واقعتاً اس نسخے کے امین تھے تو یہ ثابت ہونے کے بعد کہ یہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری ہی کا کشفہ "نسب لاہور" ہے، انھوں نے نسب یونیورسٹی لاہوری کو واپس کرنے کے بجائے یہ پروپیگنڈا حملہ وڈ سے کیوں کیا کہ یہ "نسب لاہور" نہیں، "نسب غریبہ" ہی ہے۔ انھیں تو فطری طور پر ڈاکٹر حسین فراقی اور دیگر محققین کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ نسخے کی بچان ہو گئی اور بغیر وقت ضائع کیے انھیں اس نسخے کو یونیورسٹی لاہوری کو واپس کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو وہ یہی گہر پہنچے رہے کہ یہ "نسب غریبہ" ہی ہے اور دوسری طرف حالات کو اپنے خلاف ہوتا دیکھ کر یونیورسٹی لاہوری کو نسب اس طرح واپس کیا کہ جیسے وہ یونیورسٹی پر احسان کر رہے ہوں۔

د۔ اگر صحیفہ صاحب کی نسبت صاف تھی تو انھوں نے یونیورسٹی لاہوری کو نسب واپس کرتے وقت لیمینیت (Laminated) کیوں کر لیا؟ صرف اس لیے کہ کوئی "نئے دین" کی کبھی اتار کر حقیقت حال سے واقف نہ ہو جائے، جو ایسے بھی معلوم ہو چکا ہے۔

کیا مذکورہ بالا تمام تفصیل ڈاکٹر صحیفہ الرحمن کی بدلتی کو ثابت نہیں کرتی؟ کیا ایسے آدمی کو یہ فراہم حسین پیش کرنا چاہیے کہ اس نے نسب مذکورہ سنبھال کر رکھا اور اسے شائع کر دیا۔

اسی معاملے کا ایک اور پہلو بھی دیکھتے ہیں۔ اگر یہ نسب یونیورسٹی لاہوری میں موجود ہوتا تو کیا وہاں یہ محفوظ نہ رہتا اور کیا اس کی اشاعت کا بندوبست نہ ہو سکتا؟ جب کہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری ہی کا مٹوا کہ ایک اور نادر نسب "دیوان غالب" ("نسب شیرانی") آج بھی یونیورسٹی لاہوری میں محفوظ ہے اور ۱۹۶۹ء میں انھیں ترقی ٹوب لاہور سے شائع بھی ہو چکا ہے۔

تمام معاملے پر غیر جانب دارانہ نظر ڈالنے اور مذکورہ بالا تفصیل کا جائزہ لینے کے بعد اس امر کے لیے ڈاکٹر حسین الرحمٰن کو کسی طور بھی فراج حسین پیش نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے "نہو لاہور" سنبھال کر رکھا۔ انھوں نے اسے سنبھال کر نہیں رکھا بلکہ اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے ایک عرصے تک چھپائے رکھا۔ یہ قابلِ حسمین اقدام تو کسی طرح نہیں کہلا سکتا، ہاں! حسین صاحب کی بددیانتی، بے ایمانی، خیانت اور باغیاب پونڈرشی جیسے بڑے قوی اور سے کے ساتھ دھوکا دہی کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ گیان صاحب ان الفاظ کو بھی "ذاتیات" میں شمار نہ کر لیں، لیکن حقیقت تو حقیقت ہے، حقیق کا کام حقیقت اور سچ کو سامنے لانا ہے۔ یہ گیان صاحب سے زیادہ کون جان سکے گا۔

۶۔ مقالہ نگار نے ذاتیات میں اچھٹے کے سلسلے میں "مفربقین" کا نام لیا ہے جو درست نہیں۔ مجھے نہیں معلوم ڈاکٹر گیان صاحب کی کیا مجبوری ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے اور ڈاکٹر حسین صاحب کے جوابی کتابچے کو برابر قولا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی کا کتابچہ ملکی تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتا ہے، اس کا اعتراف تو خود گیان صاحب کر چکے ہیں۔ جب کہ حسین صاحب کا کتابچہ کوسٹوں، بددعاؤں اور ذاتی عداوت سے بھرا ہوا ہے۔ اقتباسات پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اس مقصد کے لیے حسین صاحب کا پورا کتابچہ ہی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ ڈاکٹر گیان صاحب کا یہ کہنا بھی درست نہیں کہ "حسین صاحب نے معترض کے اعتراضات کے جو جواب دیے ہیں، وہ کہیں قائل کرتے ہیں۔۔۔۔۔" یہ گول مول بیان کسی امر کو ثابت نہیں کرتا۔ گیان صاحب کو حسین صاحب کے کچھ ایسے مقول جوابات کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا تاکہ بات واضح ہو سکتی۔ دیے ڈاکٹر حسین فراقی کے اعتراضات کے جواب میں حسین صاحب کے جوابات کی حقیقت ملاحظہ کرنے کے لیے ڈاکٹر عارف قاقب کا کتابچہ دیکھا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے حسین صاحب کے اعتراضات اور حسین صاحب کے جوابات کا سوا نہ کر کے ثابت کیا ہے کہ حسین صاحب، حسین صاحب کے کسی اعتراض کا بھی حقیقی بخش جواب نہ دے سکے۔ یہ کتابچہ کتاب فہا میں شامل ہے۔

۸۔ مجھے حیرت ہے کہ گیان صاحب کو ذمہ کیوں کر ہوا؟ بلور حقیق میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا، درست ہوا۔ یہ سب کچھ بہت پہلے ہونا چاہیے تھا تاکہ حسین صاحب جیسے جعلی محققین سادہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول نہ جھونک سکیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت عرصہ پہلے گیان صاحب نے اپنے ایک خطبے میں (جو بعد ازاں غالباً "بہاری زبان" ملی گزرتا اور "قوی زبان" کراچی میں شائع بھی ہوا) ان محققین اور

اساتذہ کو ایسے الفاظ میں یاد نہیں کیا تھا جو مطلب پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کم تر سطح کا تحقیقی کام کرتے ہیں، لیکن اب وہی گمان چند ایک سادگی کی سرقہ بازی کو طشت اداہم کہے جانے پر اُس کے لیے حدودی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یا للعجب!

گمان صاحب سے زیادہ کون جان سکے گا کہ تحقیق کا مقصد اور تحقیق کا فرض پہچان کر سانسے لانا ہے۔ اس میں جذبات کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی گمان صاحب اس پر تو یقین رکھتے ہوں گے کہ ”جیسی کرنی ویسی بھرنی“۔ جیسا مصیبن صاحب نے بویا ویسا ہی کاٹا۔ پھر اس میں انوس کی مجھائش کہاں سے نکلتی ہے؟

۹۔ اس سلسلے میں دیکھیے سیدہ قدرت نقوی مرحوم کا کتابچہ جو اس کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے بجا طور پر اس امر کی نشاندہی کی ہے کہ مصیبن صاحب نے مذہب و مطلق تیل پٹوں اور آرائشی عمریوں کی تفصیل بیان نہیں کی۔ گمان صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ مخطوطات کے بیان میں یہ تفصیلات کتنی اہم ہوتی ہیں۔ محض اسی امر کو پیش نظر رکھا جائے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصیبن صاحب نے مخطوطے کے تعارف میں تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں؟ اس کے علاوہ یہ امر بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ مصیبن صاحب نے مخطوطے سے تحقیق جو معلومات منہا کی ہیں، وہ کاٹا۔۔۔۔۔ یا پیش تر سیدہ عبداللہ، مولانا عرشی اور قاضی عبدالودود سے ہی مستعار ہیں۔

۱۰۔ حیرت ہے گمان صاحب کا خیال اس طرف کیوں نہیں گیا کہ غالب کے قلم کی اصطلاحوں و غیرہ کی تکمیل مصیبن صاحب سے قبل ڈاکٹر سیدہ عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرفی بیان کر چکے تھے۔ مصیبن صاحب نے انہی تحقیق کے بیانات سے خوش چینی کی ہے۔ وہ خود یہ ساری تفصیلات بیان کرنے پر قادر ہیں۔ یہ امر متوجہ قیوت ہے۔

۱۱۔ گمان صاحب نے اپنے مضمون میں جو زیادتیوں کی ہیں، ان کی تفصیل حواشی کے درپے واضح کر دی گئی ہے لیکن ان کا یہ کہنا کہ ”مقدمہ تحقیقی اعتبار سے تحقیقی بحث ہے“ باقی زیادتیوں پر بازی لے گیا ہے۔

خود گمان صاحب بھی مصیبن صاحب کی حدود غامبیوں اور لطیفوں کی نشان دہی فرما چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حسین فراہی اور سیدہ قدرت نقوی کے کتابچوں میں مصیبن صاحب کے مقدمے میں تحقیق کے دھول کا چال بڑی کامیابی کے ساتھ کھولا گیا ہے۔ حیرت ہے گمان صاحب یہ کتابچے دیکھنے کے باوجود یہ لکھتے ہیں کہ ”مقدمہ تحقیقی اعتبار سے تحقیقی بحث ہے۔“ میرا خیال ہے اس بیان کے ابطال میں کچھ ٹکسے کی ضرورت نہیں۔ یہ بیان خود ناقابل یقین ہے، اس کا اعجاز ان قارئین کو پہنچانی ہے جنہوں نے اس سوار سے کے

سلے کے تینوں کتابچے پڑھے ہیں اور ”دعویٰ غالب، نثر خوب“ بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔
۱۲۔ یہاں پھر گیان صاحب نے چانداری سے کام لیا ہے۔ انھیں صاف صاف لکھنا چاہیے تھا کہ قادی دیا ہے کا اُردو ترجمہ معین صاحب کا زائچہ فکر نہیں۔ معین صاحب کی مہارت قادی کی حقیقت تو ڈاکٹر حسین فراقی اپنے کتابچے میں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ اس کے بعد تو کئی لپٹی رکھنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔ معلوم نہیں کس مجبوری نے ڈاکٹر گیان کو یہ بات صاف صاف لکھنے سے روکا۔

۱۳۔ اس سلسلے میں دیکھیے حاشیہ نمبر ۵۔

۱۴۔ حیرت ہے کہ یہ کہہ کر تو گیان صاحب نے حد ہی کر دی کہ ”بھرے بعض مشاہدات اور ڈاکٹر حسین فراقی کے جملہ اعتراضات کے باوجود میں معین الرحمن کے اس کام کو ابھی تدوین کہوں گا۔“

اگر یہ الفاظ واقعتاً معروف محقق ڈاکٹر گیان چند بین ہی کے ہیں تو بطور محقق، مجھے ان کا یہ بیان پڑھ کر لا حد دکھ ہوا ہے کہ انھوں نے ایک سادہ الاقہار ترحیب کی ان الفاظ میں تعریف کی۔

اس ایک نکتے میں گیان چند صاحب نے دو تضاد بیانات دیے ہیں۔ ایک یہ کہ معین صاحب کی تدوین پر گیان صاحب، قدرت نقوی صاحب، اور حسین فراقی صاحب کے اعتراضات، اور دوسرا بیان معین صاحب کے کام کو ابھی تدوین کہنا۔ واضح نہیں کہ گیان صاحب نے دونوں بیانات میں کیا دہل پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے ان کے، ڈاکٹر حسین فراقی کے اور سید قدرت نقوی کے اعتراضات کی روشنی میں معین صاحب کے کام کو کسی طرح بھی ابھی تدوین نہیں کہا جاسکتا، اور اگر معین صاحب کے کام کو ابھی تدوین مان لیں تو مذکورہ تینوں حضرات کے دہائی اعتراضات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ یہ لکھنا زیادتی کی انتہا ہے کہ ”دعویٰ غالب، نثر خوب“ تدوین کا اچھا نمونہ ہے۔ میں یہاں اعادہ کرنا چاہوں گا کہ جیسے گیان صاحب کی کیا مجبوری ہے کہ وہ اس مضمون میں بعض بیانات خلاف حقیقت لکھ سکے ہیں۔ ان جیسے آدمیوں کا اور بزرگ محقق سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی۔

۱۵۔ معلوم نہیں گیان صاحب کے اس بیان کے بارے میں کیا رائے دی جائے کہ ”اسے سولانا عربی کے ”نثر عربی“ کے معیار سے نہ پرکھیے۔“ اچھا ہوتا اگر گیان صاحب وہ معیار بھی بیان کر دیتے جس پر یہ کہہ کر ”نثر خوب“ کو ابھی تدوین کہا جاسکتا۔

مجھے حیرت کے چہ درپے جھٹکے گئے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ مضمون واقعتاً معروف محقق ڈاکٹر گیان چند بین ہی نے لکھا ہے۔ آج سے پہلے نہ انھوں نے اپنی کسی

تحریر میں اور نہ کسی اور محقق نے یہ بیان کیا ہے کہ تحقیق اور تدوین کے بھی مختلف معیار ہوتے ہیں۔ ہم ایسے طالب علم تو ڈاکٹر گیان چند اور دیگر محققین کی تحریروں میں بھی پڑھتے آرہے ہیں کہ تحقیق کے اصولوں پر پوری اتارنے والی تحریر اور متن ہی تحقیق و تدوین کہلا سکتی ہے۔ آج گیان صاحب تدوین کے دو جداگانہ معیاروں کی بات کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اس پر کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔ اور کس پر یقین کیا جائے اور کس پر نہ کیا جائے۔

ادبی دُنیا میں مکروریا اور جعل سازیوں کی حیرت انگیز رُوداد

رفیق احمد نقشب (کراچی)

مرزا غالب کی تحریروں کی اشاعت میں جعل سازی کا آغاز غلو غالب کی ذات کراچی سے ہوتا ہے۔ محمد حسین دکنی کی فارسی لغت ”نہ بان قاطع“ کی نقلیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے جب غالب نے ”قاطع نہ بان“ شائع کی تو اس وقت کی ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ مچا ہو گیا اور غالب کی کتاب کے جواب میں کئی کتابیں سامنے آئیں۔ مذکورہ کتابوں میں سے کچھ میں نازیبا زبان استعمال کی گئی تھی۔ غالب کو یہ بات اپنی حیثیت سے کم تر معلوم ہوئی کہ ان کا جواب اپنے نام سے تحریر کریں تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔ سید سعادت علی کی فارسی تالیف ”محرَق نہ بان قاطع“ کا جواب غالب نے ”سولات عبدالکریم“ کے نام سے اردو میں شائع کیا۔ یہ کتاب عبدالکریم نامی طالب علم کی تصنیف کے طور پر سامنے آئی۔ ماہرین غالیات کی حلقہ رائے ہے کہ یہ کتابچہ غالب کی تحریر ہے۔ ”محرَق قاطع نہ بان“ کے جواب میں غالب نے ”طائفہ فحش“ کے نام سے اردو ہی میں ایک اور کتابچہ تحریر کیا اور اس کتاب پر بطور مصنف اپنے شاگرد میاں داؤد خان سیاح کا نام درج کیا۔ ساتھ ہی سیاح کو ”سبب الحق“ کے خطاب سے نوازا۔ سیاح کو اپنے شخص کی رعایت سے سیر و سیاحت کا بے حد شوق تھا۔ وہ اکثر حاج سفر میں رہتے تھے۔ سیاح کے نام سے غالب کا کتابچہ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو چھپا۔ ظاہر ہے کہ کتابچے کی اشاعت سے سیاح کی شہرت دور و نزدیک پھیل گئی۔ اس جعل سازی کا سیاح کی زندگی پر کیا اثر پڑا؟ عبدالرحمن عروج ”بزم غالب“ (ص ۱۰، ۲۰۹) میں لکھتے ہیں:

”۱۸۷۸ء میں سیاح بمبئی سے حیدرآباد جا رہے تھے۔ انہوں نے

دوسرے درجے کا ٹکٹ خرید کر سو روپے کا نوٹ بٹھایا۔ اس کے فوری بعد ایک اور مسافر نے بھی سو روپے کا نوٹ دے کر ٹکٹ حاصل کیا۔ اس کے اور سیاح کے نوٹ کا نمبر ایک ہی تھا جس پر کارروائی پولیس کے سپرد کی گئی اور سیاح کو حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر جملی کرکسی بنانے اور چلانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ وہ زبردست پھرے میں بھیجی گئے جہاں ان کو چودہ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

”قاطع نربان“ کے ہنگامے میں غالب نے نہ صرف اپنی تحریریں دوسروں کے ناموں سے اپنی حمایت میں شائع کیں بلکہ اپنی فارسی دانی کو پایہ استہدائے جتنے کے لیے ایک ایرانی الاصل استاد بھی تخلیق کر ڈالا۔ غالب کے مطابق اس کا اصلی نام ہرحد تھا۔ پچاس سال تک علمائے عرب سے استفادے کے بعد اس نے زردشتی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا اور اپنا اسلامی نام عبدالصمد رکھا۔ ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں وہ آگرہ پہنچا اور وہ سال تک غالب کا مہمان رہا۔ اس عرصے میں غالب نے اس سے فارسی زبان کی باتیں کیں اور اسرار و رموز سیکھے۔ محقق ہے بدل قاضی عبدالودود کے مطابق: ”غالب کو ایک سہارے کی ضرورت تھی اور اس کے احساس نے انیس عبدالصمد کی تخلیق پر مجبور کیا۔ ملی تحقیقات شاعری غیب کہ غالب یہ دعویٰ کر سکیں کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریح خامہ نوائے سرور ہے

تحقیقات میں غالب کے لیے ”عبدالصمد“ وہی ہے جو ”غیب“ شاعری میں ہے۔“

غالب نے اس خوبی سے اپنے فرضی استاد کے خدوخال اہمارے ہیں کہ حالی سے حال تک کے محققین عبدالصمد کے وجود خارجی کے ہونے نہ ہونے پر اپنے دلائل دیتے رہے ہیں۔

یہاں تک تو ہوئی غالب کی جمل ساری۔ دوسری طرف خود غالب کی زندگی میں ان کی وہ جملی شاگرد پیدا ہو گئے۔ سید محمد فخر الدین حسین خاں خن دہلوی اور شاہ باقر علی باقر بہاری نے غالب سے تلمذ کا دعویٰ کیا بل کہ خن نے تو غالب سے رشتے داری ظاہر کر کے انھیں اپنا نانا قرار دے لیا۔ یہ سارا سلسلہ بھی ”قاطع نربان“ کے ہنگامے کا

شاعر تھا۔ غالب کی کتاب کے جواب میں آغا احمد علی احمد نے ”مؤید برہان“ لکھی۔ یہ صاحب گلشن کے ایک عدد سے میں پڑھاتے تھے۔ غالب نے کتاب دیکھے بغیر صرف اس کا ذکر سن کر انہیں اشعار پر مشتمل ایک قطعہ اس کے جواب میں لکھا۔ اس قطعے کا جواب آغا احمد علی نے لکھا مگر اس پر نام اپنے شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی کا دیا۔ یہاں ہمارے دونوں ہیرو باقر علی باقر اور فخر الدین خن نے اس ڈرامے میں وارد ہوئے اور اسی زمین میں فدا کے قطعے کا جواب لکھ کر شائع کر دیا۔ بعد میں چاروں قطعے ”ہنگامہ دل آشوب“ کے نام سے ۱۸۶۷ء میں یک جا شائع ہوئے۔ اس کتاب میں قطعہ باقر کے ذیل میں ”حمید حضرت غالب مدظلہ العالی“ اور قطعہ خن کے ذیل میں ”حمید و ہیرو“ حضرت جناب نواب اسد اللہ خان غالب مدوح الصدور.....“ لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظیف انجم کا خیال ہے:

”خن..... جانتے تھے کہ چوں کہ وہ غالب کی طرف داری کر رہے ہیں، اس لیے اگر خود کو ”حمید و ہیرو“ غالب“ لکھیں تو غالب ہرگز تردید نہیں کریں گے۔ انھوں نے نہ صرف خود کو بلکہ اپنے دوست باقر کو بھی حمید غالب لکھ دیا۔“

(”حمید“، لاہور۔ غالب نمبر۔ ص ۱۰۰۔ جولائی ۱۹۶۹ء۔ ص ۹۱)

خن کا دیوان، غالب کی وفات (۱۸۶۹ء) کے سترہ سال بعد ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں خن نے غالب کے نام سے ایک تقریباً لکھ کر شامل کر دی۔ اس میں غالب کی طرف سے اپنی رشتہ داری پر یوں مہر تصدیق ثبت کر رکھی ہے:

”میں مغلوب و ہر غالب نام، جو بازار ہستی میں محتاج کا بند ہوں،

بحسب اسطوار فقہاء اس سید راہ قدسی نہاد کا بند فاسد ہوں۔“

غالب اور کلام غالب کے حلقے میں جہل سازی کا سلسلہ حیاتِ غالب سے تاحال جاری ہے۔ عبدالہادی نے ۱۹۳۱ء میں اپنی شرح کلام غالب شائع کی تو بائیس غزلیں خود کہہ کر غالب کے نام سے مذکورہ شرح میں داخل کر دیں، ساتھ ہی اپنے والد بزرگ دار خلیفہ حسام الدین احمد گدانی کو ان الفاظ میں غالب کی قرین بخش دی:

”خود میرے والد مرزا غالب کے دیکھنے والوں میں تھے۔ ان کے کمال سخن کے پورے راز دان تھے۔“

سید محمد اسماعیل رسا بھائی نے غالب کے ایک اصلی عہد کے ساتھ مجلیس مجلی عہد غالب کے نام سے لکھ کر ”نور مملوٹ غالب“ کے عنوان کے تحت شائع کیے۔

جملی سازی میں ملحق انتظام اللہ شہابی کو کمال حاصل تھا۔ انھوں نے بے شمار غلا روایات، پیش تر کسی حوالے کے بغیر اور کم تر روایات حوالوں سے تحریر کیں اور یہ حوالے بھی جملی ہیں۔ ”طائف اشعرا“ میں جن جملے اور شعرا کے غالب کے بارے میں بھی دو ایک حقیقی تو دس میں فرضی حکایات لکھ ماری ہیں۔

بھوپال کے مالل سکول کے ہیڈ ماسٹر مولانا ابراہیم ظلیل نے سکول کے بچے ”گوہر تعلیم“ بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں ”اپریل فول“ کے عنوان کے تحت غالب کی ایک (جملی) نزل چھاپی تھی جس کا مطلع تھا:

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لکھ ہے جو ہلکتی دوراں بھی رام ہو
اس نزل کا مقطع ہے:

بیراتہ سال غالب سے کش کرے کا کیا
بھوپال میں حریہ جو دو دن قیام ہو

شعہ شعہ یہ نزل ”ہمایوں“ (اپریل ۱۹۳۹ء) میں غالب کے نام سے نقل ہوئی اور وہاں سے لے کر مالک رام جیسے ماہر غالبیات نے اپنے مرتبہ ”دیوان غالب“ میں شامل کر دی۔

کلام غالب کے سلسلے میں جملی سازی کا تازہ ترین شاہ کار ”دیوان غالب“ نسخہ ”خوبیہ“ ہے۔ چوٹی کے محققین کے مطابق ”نسخہ خوبیہ“ کے نام سے پیش کیا جانے والا دیوان غالب دراصل ”نسخہ لاہور“ ہے جو جامعہ پنجاب کی ملکیت تھا اور وہاں سے غالب ہو گیا، غالب کر لیا گیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصے پر روشنی ڈالنے سے قبل ایک اور ”نسخہ لاہور“ کی بابت بھی کچھ بات ہو جائے۔ ۱۹۶۹ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر ساری دنیا میں بالخصوص اور پاک و ہند میں بالخصوص غالبیات میں کمال قدر

اضافے ہوئے۔ اس سال کا ایک اہم حق خود نوشت خطوط دیوان غالب تھا۔ یہ خطوط امرودہ کے تاجر کتب توفیق احمد چشتی کو بھوپال سے دست یاب ہوا۔ انہوں نے اس نسخے کو فروخت کے لیے پیش کرتے ہوئے اسے ”نسخہ امرودہ“ سے موسوم کیا۔ اس نسخے کے لیے ”نسخہ امرودہ کے علاوہ“ ”نسخہ بھوپال قدیم“، ”نسخہ بھوپال نئی“، ”نسخہ عرشی زادہ“، ”نسخہ لاہور“ اور ”نسخہ نقوش“ کے نام بھی سامنے آئے۔

”امروہیوں (گذا۔ درست امرودہیوں) کا اصرار یوں ہے کہ پہلے پہل امرودہ کے ایک دکان دار کے ہاتھ یہ نسخہ لگا۔ عرشی زادہ کا اصرار یوں ہے کہ ایک امرودہی نے سودا بازی کر کے اس پر دینا چاہا۔ بھوپالیوں کا اصرار یوں ہے کہ نسخے نے بھوپال سے امرودہ ہجرت کی تھی۔ لاہوریوں کا اصرار یوں ہے کہ انہوں نے اسے چھاپا۔ اگر فیصلہ اس بات پر ہوتا ہے کہ نسخہ کس شہر کا ہے تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ یہ نسخہ نہ امرودہ کا ہے، نہ بھوپال کا، نہ لاہور کا اور نہ رام پور کا! یہ نسخہ دہلی کا ہے کیوں کہ اس کا کاتب دہلی (چاہے اکبر آباد کہہ لیجیے) کا تھا اور سب سے پہلے یہ نسخہ وہیں تھا۔“

(”نقوش“ غالب نمبر (۳) ۱۹۷۱ء۔ ص ۳۷)۔ ”نقوش“ کا شمار نمبر ۱۱۳، اکتوبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ یہ غالب نمبر حصہ دوم تھا۔ اس میں دیوان غالب حفظہ غالب مع تشریح نقل چھاپا گیا۔ اس کے صفحہ ۳ پر محمد نقوش (محمد طفیل) لکھتے ہیں: ”چونکہ یہ عیاض سب سے پہلے لاہور میں چھپی ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ اسے نسخہ لاہور کے نام سے یاد کیا جائے۔“ لیکن ان کا یہ دعویٰ درست نہ تھا کیونکہ نسخہ عرشی زادہ ستمبر ۱۹۶۹ء میں چھپ چکا تھا اور چند اطراونک پہنچ بھی گیا تھا۔ کیا ان چند ہار یک جہی سے جائزہ لے کر ثابت کر دیا کہ ”نقوش“ کے مذکورہ شمارے میں شائع شدہ دیوان غالب کے مرتب کی نظر سے نسخہ عرشی زادہ گزر چکا ہے اور بغیر کسی حوالے یا اعتراف کے اس سے بھرپور استفادہ ہر صفحے سے مترشح ہے۔ یوں اس تنازع نسخے کو جس بنا پر نسخہ لاہور قرار دیا جاتا وہ بتا ہی غالب ہو گئی۔ اس سلسلے کے تفصیلی مطالعے کے لیے ”رموز غالب۔“ (از کیاں چند۔ شائع کردہ ادارہ یادگار غالب، کراچی) کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

”نہ تو“ کراچی کے جولائی ۱۹۵۳ء کے شمارے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے جامعہ پنجاب لاہور میں موجود دیوان غالب کے ایک نسخے کا تعارف کرایا۔ ”دیوان غالب کا

ایک نادر قلمی نسخہ" نامی اس مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے: "حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مرزا غالب کے دیوان اردو کا ایک قلمی نسخہ داخل ہوا ہے جس کی میرے نزدیک کئی وجوہ سے اہمیت ہے۔" اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ نسخہ ۱۹۵۳ء کے اواخر یا ۱۹۵۴ء کے اوائل میں جامدہ پنجاب کے کتب خانے کی زینت بنا ہو گا۔

مشہور محقق اور ماہر غالبیات قاضی عبدالودود جب پاکستان آئے تو انہوں نے نومبر ۱۹۵۷ء میں لاہور میں مذکورہ نسخے کا ردو گراف تیار کرایا اور اسے اپنے ساتھ ہندوستان لے گئے، جہاں یہ ردو گراف امتیاز علی عرفی کو دے دیا گیا۔ قاضی عبدالودود نے دیوان غالب کے اس نسخے سے متعلق اپنی تحریری یادداشتیں "نقوش" کے اکتوبر ۱۹۵۸ء کے شمارے میں "مختصرات" کے ذیل میں "مخطوط دیوان غالب" کے عنوان سے شائع کرائیں۔ قاضی صاحب کے فراہم کردہ ردو گراف سے امتیاز علی عرفی نے بھرپور استفادہ کیا اور ۱۹۵۸ء میں اپنے مرتبہ "دیوان غالب" کی طبع ناول کے مقدمے میں، جہاں انہوں نے اپنے زیر مطالعہ بارہ قلمی نسخوں کی تفصیلات پیش کی ہیں، وہیں دسویں نمبر پر زیر بحث نسخے کو "نسخہ لاہور" قرار دیتے ہوئے وہ اس کی تفصیلات بھی ضمیمہ تحریر میں لائے ہیں۔ دیوان غالب کا یہ نادر نسخہ بعد ازاں کتب خانہ جامدہ پنجاب میں موجود نہیں رہا۔ ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر سید مصحیح الرحمن کا مرتبہ "دیوان غالب" نسخہ خوبہ" بڑی آب و تاب سے سامنے آیا۔ یہ صحنہ طباعت کا شاہ کار تھا۔ اس میں دائیں ہاتھ پر مخطوطے کا ٹکس اور بائیں ہاتھ پر مروج الفا میں اس ٹکس کی شقیں نقل موجود ہے۔ حواشی لکھنے میں محنت نگر آتی ہے۔ مقدمے میں سارا زور اس بات پر ہے کہ ان کا مرتبہ موجودہ نسخہ ایک نئی دریافت ہے۔ نسخے کا اقتساب انگریزی زبان و ادب کے مشہور استاد اور اردو کے معروف ادیب پروفیسر خوبہ محکور حسین مرحوم کے نام کیا گیا ہے۔ نیز اس نسخے کو خوبہ صاحب ہی سے موسوم کر کے اسے "نسخہ خوبہ" قرار دیا ہے۔

اس سال یعنی ۲۰۰۰ء میں "دیوان غالب" نسخہ خوبہ" تجربہ و تحقیق" کے نام سے سو اچھی موصلاط سے زائد کی ایک کتاب سید مصحیح الرحمن کے چچے سید دھار مصحیح کے نام سے منسوب ادارے "الوقار پبلی کیشنز، لاہور" سے چھپی ہے۔ کتاب ہ مرتبین کے طور پر

ڈاکٹر سید معراج نیز اور اصغر علم سید صاحبان کے نام دیے گئے ہیں۔ یہ دونوں حضرات سید مصححین الرحمن کے شاگرد (شاگرد نہیں ماتحت ہیں۔ مدبر! ہیں۔ مرتبین کے مطابق: ”یہ مضامین زیادہ تر خود استاد محترم کے توجہ دلانے پر ضبط تحریر میں آئے۔ ان نگارشات کی جمع و ترتیب کی عزت ہمارا مقوم ٹھہری۔ سعادت مند شاگردوں کی پہچان یہی ہے کہ وہ استاد کے کام آنے کو اپنی عزت سمجھتے ہیں.....“ اس کتاب کی پیش کش سے لے کر اس کے متعدد جات کی ترتیب تک غالب اور ان کے شاگرد مہاں دار خان سیاح کے روابط کی یاد دہانی کرائی نظر آتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ سید مصححین الرحمن نے ”دعویٰ ان غالب، نسو خوبہ“ کی اشاعت کے ساتھ ہی ”..... تجزیہ و تحسین“ کی اشاعت کا منصوبہ بھی پیش نظر رکھ لیا تھا۔ رشید حسین خان کو کتاب نذر کرتے ہوئے جو عبارت لکھی تھی، اسے اپنے پاس الگ سے محفوظ کر لیا۔ ضمیر نیازی سے جو مراسلت ہوئی، اس کے درمیان فون پر کی جانے والی گفت گو سے متعلق ڈائری کا اندراج بھی موجود ہے۔ اہل علم کو ”نسو خوبہ“ کے نئے بھیج بھیج کر ان سے فوری تاثرات لکھ بیجھنے کا تقاضا کیا گیا..... ظاہر ہے کہ فوری طور پر تعریف تو ممکن ہے، اور پیش تر افراد نے حسن طبعیت کی بہا طور پر تعریف کی ہے۔ تحقیقی تقاضا ظاہر کرنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے قلماء محققین نے سید مصححین الرحمن کے خاطر خواہ تعریف سے کام نہیں لیا۔ ”نسو خوبہ پر آپ ہماری تحریر چاہتے ہیں۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار تو میں نے دعویٰ ان دیکھتے ہی کر دیا تھا۔ بہر حال، کچھ لکھ سیکھوں گا۔“ (مختار الدین احمد..... ص ۳۳)

”اس سلسلے میں اتنی رائیں اور ایسے ایسے لوگوں کی رائیں آپ نے ”تحقیق نامہ“ میں اور اس نئے کے آغاز میں شامل کر لی ہیں کہ وہ کافی ہیں۔ ان پر اب اضافے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔“ (رشید حسن خان..... ص ۵۸)

”..... تجزیہ و تحسین“ میں شامل متعدد مضامین پر اختلافی یا دماغی حواشی ”مصححین الرحمن“ کے قلم سے ہیں۔ غالب میں کم از کم اٹا سیلو تو تھا کہ سیاح کے نام سے ”کٹاف لیبی“ شائع کی تو اس میں اپنے نام سے کوئی تحریر نہیں لکھی، لاپہ صورت اقتباس۔ سید مصححین الرحمن کے تحریر کردہ حواشی کے معیار کا اندازہ سلا نمبر ۳۵ پر دیے گئے حاشے سے ہو سکتا ہے جہاں انھوں نے یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے: ”نسو خوبہ“ کسی ”نظر فرب

”برادان“ سے تھی ہے (مبین الرحمن)۔ اس حادثہ میں ایہاد بندہ کے تحت لفظ ”تبی“ کو مخالف سمت میں معنوی وسعت دینے کی کوشش نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر حنیف نقوی نے لکھا ہے: ”کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ مولانا امتیاز علی مرثی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے اپنے طور پر دیوانی غالب کے جس ”نسخہ لاہور“ کا تعارف کرایا ہے، وہ مبین صاحب کے شائع کردہ اس نسخے سے مختلف نہیں۔“ (..... تجزیہ و تبیین ص ۳۸)۔ رشید حسن خاں لکھتے ہیں ”مجھے تو یہ نسخہ بین میں ”نسخہ لاہور“ ہی معلوم ہوتا ہے۔“ (ص ۵۵) ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں: ”میں نے اسے ”نسخہ غولہ“ نہیں لکھا، یوں کہ اس کا جواز مجھے نظر نہیں آیا، میں اسے ”نسخہ لاہور“ ہی کہوں گا۔“ (ص ۵۹)۔

اس سلسلے میں سید مبین الرحمن کا موقف ابہام اور ڈولیدہ بیانی سے مملو ہے: ”نسخہ غولہ، نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا تمام ضرور ہے، لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل، مگر اس سے مختلف ہے۔“ (ص ۵۷)۔ صفحہ نمبر ۶۰ پر سید عبداللہ کے نام سے نقل، ”ڈاکٹر“ کے اضافے سے یہی عبارت اُہرائی ہے:

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

”نسخہ لاہور“ کے حوالے سے سید مبین الرحمن کا تادم ترین موقف ”نئی صدی“ لاہور کے ایڈیٹر عمر زمان کے جائزے پر عنوان ”دیوانی غالب کا لاہور نسخہ اور ڈاکٹر سید مبین الرحمن“ میں چسپا ہے (پندرہ روزہ ”جنگ آء“، جلد ۵، شمارہ ۱) اس کے مطابق: ”..... قاضی (عبدالودود) صاحب کی اطلاع پر امتیاز (علی) مرثی صاحب نے یہ فرض کر لیا کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ نے کیا ہے۔ انھوں نے نسخوں کو ایک ہی سمجھ لیا۔ جن کی زیادہ نظر نہیں، وہ بلا تحقیق ایک ہی نسخے کی بات کر رہے ہیں، حالانکہ ایک سے زیادہ نسخے رہے ہوں گے۔“

واضح رہے کہ ”نسخہ لاہور“ امتیاز علی مرثی نے ۱۹۵۸ء میں قرار دیا تھا اور ۱۹۶۹ء میں جب سید مبین الرحمن نے ”اشاریہ غالب“ شائع کیا تو مرثی صاحب (توسط قاضی عبدالودود) اور سید عبداللہ کے متعارف نسخوں کو الگ الگ نسخے نہیں بلکہ ایک ہی نسخہ مانا ہے۔ ”اشاریہ غالب“ میں ”دیوانی غالب اردو کے اہم خطی اور مطبوعہ نسخوں کا تاریخ وار

ایمانی خاکر" پیش کرتے ہوئے نویں نمبر پر "نسخہ لاہور" ۱۳۶۸ھ ۱۸۵۲ء کو رکھا ہے اور اس سلسلے میں چالیسے میں یہ اطلاع دی ہے کہ: "اس نسخے کے تعارف کے لیے دیکھیے" مضمون! ڈاکٹر سید عبداللہ، "ماہِ نو" کراچی، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۱۵-۱۹۔

"نسخہ لاہور" کو "نسخہ طوبہ" بننے تک کن مراحل سے گزرتا چلا یہ ایک عبرت ناک داستان ہے۔

۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سید مصین الرحمن کی مرتبہ کتاب "دیوان غالب، نسخہ خرمہ" اور ۲۰۰۰ء کے اوائل میں "دیوان غالب، نسخہ خرمہ..... تجزیہ و تحقیق" شائع ہوئی۔ جانی اللہ کہ کتاب میں تجزیہ ہقدر اچھا جلیل ہے تقریباً ساری کتاب حسین پر مبنی ہے جو کتاب کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔ اس صورت حال پر محض شمس ڈاکٹر حسین فراقی نے نمبر شکستہ توڑی اور ۷۲ صفحات پر مبنی ایک تحقیقی مطالعہ پر عنوان "دیوان غالب، نسخہ خرمہ..... اصل حقائق" پیش کیا۔ اس کتابچے میں دلائل و براہین سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ "نسخہ طوبہ" اصل میں "نسخہ لاہور" ہے جس کا تعارف قلم ازیں ڈاکٹر سید عبداللہ قاضی عبدالودود اور امتیاز علی عرفی پیش کر چکے ہیں۔ اس کتابچے کے جواب میں "دیوان غالب، نسخہ خرمہ..... صحیح صورت حال" کے نام سے ڈاکٹر سید مصین الرحمن نے ۶۳ صفحات کا ایک کتابچہ شائع کیا۔ یہ کتابچہ اس سال مئی میں سامنے آیا۔ اگست ۲۰۰۰ء میں مشہور ماہر غالبیات سید قدرت نقوی کے کتابچے "دیوان غالب، نسخہ خرمہ یا نسخہ مسروقہ..... ایک جائزہ" کی اشاعت ہوئی جس میں غالب کے اردو خطوط اور دیوان غالب کے زیر بحث نسخے کے غائر مطالعے سے انھوں نے ثابت کیا کہ غالب نے یہ نسخہ خاص اہتمام سے تیار کر کے مہاراجا جے پور کو بھجوا دیا تھا کہ وہاں سے کچھ یافت ہو۔ اس سلسلے کا چوتھا کتابچہ پہلے دو کتابچوں کے تقابلی جائزے پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر عارف قاضی اپنے اس جائزے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "مصین صاحب فراقی صاحب کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ جنوز، جواب ان پر قرض ہے۔"

اس دوران مختلف اشادات و رسائل میں اس قضیے سے متعلق ایک درجن سے زیادہ تحریریں چھپ چکی ہیں۔ علاوہ ازیں اس سلسلے میں شائع شدہ تین ٹھیس بھی ہماری نظر سے گزری ہیں۔ "مخطوطہ دیوان غالب کی چوری پر" ہاتھ دھڑکنی کی نظم کے آخری

شعری ترکیب مانی سے ۱۳۳۱ھ کی تاریخ برآمد ہوتی ہے:

نصرت مصلوٹہ پنجاب یوندر نلی
نصرت مسروقہ عجیبہ مانوس ہے

اس قصبے کے نتیجے میں ”انجمن تخلص ناموس غالب و رشید احمد صدیقی“ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس انجمن نے ابتدائی طور پر ایک پمفلٹ شائع کیا ہے۔ ”اہل علم و ادب کو مزہ ہو۔“ اس پمفلٹ میں مصین صاحب کی جعل سازیوں کی نکال دہی کرتے ہوئے آخر میں اہل علم کو مزہ سنایا گیا ہے کہ ”اب خاموشی کا پردہ چاک ہو گا اور علم و ادب کے ساتھ جعل سازی کرنے والا ہر جعل ساز بچہ خاک ہو گا“

ہم اس قصبے اور متعلقہ معاملات پر اپنے مشاہدات پیش کرنے کی کوشش کرتے

ہیں:

ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنے کتابچے میں علمی وقار قائم رکھا ہے۔ ڈاکٹر سید مصین الرحمن کا ذکر کرتے ہوئے یا تو ان کا پورا نام لکھا ہے یا ”مصین صاحب“ لکھا ہے۔ ”مصین صاحب“ نے جوابی کتابچے کے ابتدائے ”رہنے چند.....“ میں صورت حال کی ممانعت کا لحاظ روا رکھتے ہوئے ڈاکٹر ڈار احمد فاروقی کی تحریر کا اقتباس دیا ہے ”جس شخص کو دوست سمجھا ہو اس کے خلاف قوانین و حقیر کے الفاظ میرے قلم سے نہیں نکل سکتے۔“ لیکن آگے یہ دیکھ کر غصوں ہوتا ہے کہ اس اقتباس میں دیے گئے اصول کی دہمیاں اڑا کر اخلاقی دعوے پن کا ثبوت دیا گیا ہے۔ مذکورہ جوابی کتابچے میں ”مصین صاحب“ نے پانچ جگہ ”حسین فراقی“ اور کم از کم چھتیس جگہ ”ت۔ف۔“ لکھ کر ڈاکٹر حسین فراقی کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں دوسری طرف سے ہاتھ دھڑلائی اور جعفر بلوچ نے اپنے مضمومات میں ”م۔ذ۔“ اور ”م۔ز“ کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

م ر نے نصرت مسروقہ شائع کر دیا
گویا اب یہ نصرت اس کا فرق سالوں ہے

(ہاتھ دھڑلائی)

”حضرت م۔ز“ کی ہیں توفیقات اس سے بھی فزوں
ہے لکھ لکھا تو کیا؟ کج ہے اگر لکھا تو کیا؟

(جعفر بلوچ)

خود معین الرحمن صاحب نے اپنے نام کی جس طرح تحفیف کی ہے وہ زیادہ بامعنی ہے۔ اپنے مجموعہ مضامین ”تحقیق غالب“ (طبع اول ۱۹۸۱ء) کے صلی نمبر ۱۳۸ کے حاشیہ کے آخر میں انھوں نے اپنے نام کا تحفیف ”م۔ا۔د“ دیا ہے۔ ان حروف کو ملا کر لکھتے سے جو لفظ بنتا ہے اس کے پیش نظر ہمیں ایک غیر متعلق شعر یاد آ گیا جس میں صعب ایہام کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

زلف لٹکا کے وہ جس دم سر بازار چلا

ہر طرف شور اٹھا ' مار چلا ' مار چلا

”نصرت خواجہ“ کے ”نصرت لاہور“ ہونے یا نہ ہونے سے متعلق معین صاحب کے بیانات میں رفتہ رفتہ تبدیلی آتی نظر آتی ہے۔ ”اشارہ غالب“ کے حوالے سے ہم قبل ازیں اشارہ کر چکے ہیں کہ قاضی عبدالودود کے توسط سے جس نسخے کا ردلو گراف حاصل کر کے امتیاز علی مرثی نے اپنے مرتبہ دیوان غالب میں اسے ”نصرت لاہور“ قرار دیا تھا معین صاحب نے اس کے بارے میں حاشیہ لکھا ہے: ”اس نسخے کے قاریف کے لیے دیکھیے مضمون: ڈاکٹر سید عبداللہ، لاہور، کراچی، جولائی ۱۹۵۳ء۔ صلی ۱۵-۱۶“ (”اشارہ۔ غالب“، ص ۳۱۶)

اس سے پتا چلتا ہے کہ معین صاحب کے نزدیک مذکورہ بالا تینوں محققین کے حصارف نسخے دو یا تین نہیں بلکہ ایک ہی نسخہ تھا۔ تاہم جب اس نسخے کو انھوں نے اشاعت کے لیے تیار کیا تو ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون میں موجود دو ایک فروگزاشتوں کی بنا پر انھوں نے اسے محولہ بالا نسخے سے الگ نسخہ قرار دیا۔ جب نسخے کی اشاعت کے بعد معین صاحب نے اہم علمی و ادبی شخصیتوں کو تبصرے کے لیے مجبور کیا تو ڈاکٹر حنیف نقوی اور رشید حسن خان جیسے صاحب نظر محققین نے سابقہ ”تین نسخوں“ اور موجودہ نسخے سے متعلق اپنی الگ الگ رائے میں یہی اظہار کیا کہ:..... اصل میں ”چاروں“ ایک ہیں۔

ڈاکٹر حنیف نقوی کے خط پر تبصرہ کرتے ہوئے معین صاحب نے یہ موقف اختیار کیا کہ ”میں نصرت خواجہ کو ڈاکٹر سید عبداللہ کے حصارف نسخے کا ہم عصر اور مماثل مانتا ہوں، لیکن ان میں فرق اور اختلاف بھی بہت نمایاں ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں مرثی اور قاضی عبدالودود کا حصارف ملکی نسخہ جسے مرثی صاحب نسخہ لاہور کہتے ہیں، نصرت خواجہ سے لہذا زیادہ

مساہلت رکھتا ہے، لیکن انھیں من و من ایک کہنا یا سمجھنا قرین حقیقت نہیں۔

رشید من خاں نے جب انھیں لکھا کہ ”مجھے تو یہ نسخہ عین میں نسخہ لاہور ہی معلوم ہوتا ہے“ تو جہاں معین صاحب محب گول مول موقف اختیار کرتے ہیں۔ ”نسخہ خوبہ، نسخہ لاہور ہی نہیں ہے تو اس کا تو ام تو ضرور ہے، لیکن یہ سید عبداللہ کے نسخے سے مماثل، مگر اس سے مختلف ہے۔“

معین صاحب کا تازہ ترین بیان ”بنگ آف“ (۱۰، ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء) کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔۔۔۔۔ ”جن کی زیادہ نظر نہیں، وہ بلا تحقیق ایک ہی نسخے کی بات کر رہے ہیں، حالانکہ ایک سے زیادہ نسخے رہے ہوں گے۔“

ان تمام باتوں سے قطع نظر، حسین فراقی نے اپنے کتابچے کے آخر میں جو مختلف عکس شائع کیے ہیں، ان کو بہ چشم سرد دیکھ کر، ایک عام آدمی بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ مختلف عکس ایک ہی نسخے کے ہیں۔ کوئی کاتب ایک ہی مسودے کو سامنے رکھ کر اگر دو ایک جیسے نسخے بنانا چاہے تو وہ کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو، اس کے لفظوں کی نشست، نقلوں کی جگہ اور کشش کے انداز میں ہر صفحے میں کہیں نہ کہیں ضرور فرق ہو گا، جبکہ سید عبداللہ کے متعارف نسخے، مرثی صاحب کو فراہم شدہ روڈو گراف اور نسخہ خوبہ کے مختلف صفحوں کے عکس میں سرمو کوئی فرق نہیں اور نسخہ خوبہ میں جہاں فرق پیدا کیا گیا ہے، وہاں سے چوری پکاری جا رہی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، ہر باقاعدہ کتب خانہ داخل کی جانے والی کتابوں کا کوئی ایک سطر ایکسیشن نمبر لکھنے کے لیے مخصوص کر لیتا ہے تاکہ کسی وجہ سے کتاب کے ابتدائی صفحات ضائع ہو جائیں تو بھی مخصوص صفحے پر نمبر دیکھ کر مختلف رجسٹر سے کتاب کے کوائف معلوم کیے جاسکیں۔ چاند پنجاب کے کتب خانے نے ص ۲۲ کو مخصوص کر رکھا ہے۔ نسخہ خوبہ میں غلطی کا جو عکس چسپا ہے، اس میں ص ۲۲ نمبر ۲۲ پر تزکیہ چو کھنے کے نچلے حصے سے کتاب کا ایکسیشن نمبر چسپل کر مٹایا ہوا ہے۔ اگر یہ نسخہ جامعہ پنجاب کا نہیں تو اس کے اسی صفحے پر پھیلے کا نشان کیوں ہے؟

نسخہ خوبہ میں غلطی کے آخری صفحے کے عکس میں صفحے کے ذریں نصف میں ”نسخہ دین“ اور اس کے ٹھیک نیچے ”فتح دین“ لکھا ہوا ہے اور یہ کتاب کے صفحے پر نہیں،

بلکہ ایک الگ کانڈ کے ٹکڑے پر لکھ کر اسے کتاب پر چپکایا گیا ہے۔ معترضین کا کہنا ہے کہ کانڈ کے اس ٹکڑے کے چھپے جامد پنجاب کے کتب خانے کی مدد مہر کو چھپایا گیا ہے۔ سید قدرت نقوی کے بقول، ”خجل ہوئی تھی کا چھڑکا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا۔ جب کہ آج کل ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے والے طلبہ تک لٹافوں سے ٹکٹ آبی عمل یا عمل تجویز کے ذریعے پا آسانی، اچھی حالت میں اتار لیے ہیں تو پھر معین الرحمن جیسے ”زیرک حلق“ کے لیے یہ کون سا دشوار کام تھا؟ انہوں نے صرف اس وجہ سے اس تھی کو الگ نہیں کیا کہ اس کے ہٹ جانے سے وہ پوشیدہ امر ظاہر ہو جاتا ہے وہ راز رکھنا چاہتے تھے۔“

اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں متعلقہ تھی جہانی نہ چن جائے، ”حافظی نقطہ نظر سے“ جامد پنجاب کو پیش کرنے سے پہلے مخطوطے کے صفحات پر تھیں کروایا گیا۔ تاہم اب بھی حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے تہذیب دلائی ہے کہ ”مہمہ جدید کی عملی پیش رفت کے باعث قریب تک تخلیق اور انفرارینا کسرے اور کیبائی تجزیوں بشمول کاربن ٹیٹ و غیرہ سے دستاویزات میں نقطے برابر رد بدل اور تحریف و تعمیر کا بھی ناقابل تردید قیاس ممکن ہے، چنانچہ ان جدید ترین تخلیوں کا اطلاق نسخہ طبع کی چند تحریکات پر بھی بخوبی کیا جا سکتا ہے، تاکہ حقیقت حال مکمل کر سامنے آجائے۔“

معین صاحب بجا طور پر دیوان غالب کے زیر بحث مخطوطے کو ”اچھے ذخیرے کی بڑی قیمتی محتاج“ خیال کرتے رہے۔ انہوں نے ”حافظت کے مستقل انتظام“ کی شرط پر شیخ الجامد پنجاب کو پیش کرنے کی کہ..... میں آپ کی اجازت سے اس بے مثال قیمتی نسخے کو بلا قیمت، عطیہ اعزازی کے طور پر پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کو پیش کرنے کی خوشی پاؤں تو یہ امر میرے لیے طمانیت اور سعادت کا باعث ہو گا۔“

یہ پیش کش ۷ اگست ۱۹۹۹ء کو داکٹر چائلز ڈاکٹر خالد حمید شیخ کو کی گئی تھی جو انہوں نے بوجہ قبول نہیں کی۔ بعد ازاں موجودہ شیخ الجامد یونیورسٹی جنرل (ر) ارشد محمود نے جامد پنجاب کی جانب سے مذکورہ مخطوطہ بوجہ قبول کر لیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معین صاحب کو کیا کوئی ایسی ضمانت فراہم کر دی گئی ہے کہ آئندہ اس نسخے کی حفاظت کا مستقل انتظام ہو گا؟ اگر ہاں، تو معین صاحب نے اپنا

سارا ذخیرہ غالبیات وہاں کیوں نہ "محفوظ" کر دیا کہ اس سے استفادے کا دائرہ وسیع ہو جاتا؟ اگر نہیں، تو اسے قیمتی نسخہ ایسی جگہ کیوں جمع کر دیا جہاں سے قلم اڑیں، دیوان غالب کا نسخہ شیرانی اور بقول سید مصعبین الرحمن، دیوان غالب کے دیگر مخطوطے غالب ہو چکے ہیں؟ دیوان غالب کا نسخہ شیرانی قلمی لائبریری سے ناگوار چوری نہیں ہوا۔ مدیر ا۔ ان سوالات پر غور کرتے ہوئے ایک ہی قوت "دیوان غالب" کا مخطوطہ جاسمہ پنجاب کو واپس کرنے کے پس پشت کا فرما نظر آتی ہے اور اس قوت کو عرف عام میں "ضمیر کی غلطی" کہا جاتا ہے۔ امجد اسلام امجد نے اپنے ایک شعری مجموعے کی ابتدا میں کسی ستم ظریف کا قول نقل کیا ہے کہ ضمیر آپ کو برائیاں سے روک نہیں سکتا، البتہ ان کا مزا ضرور خراب کر دیتا ہے۔

یہاں ہمیں سید مصعبین الرحمن کے نام معروف بے پاک صحافی ضمیر یازدی کے ایک خط کا فقرہ یاد آ گیا۔ ان کے موقف سے کوئی بھی ہاشور شخص اختلاف نہیں کرے گا۔ وہ لکھتے ہیں: "خود اپنی پی آر بہت گھٹیا اور ادب سے گرا ہوا فعل ہے....."

ڈاکٹر سید مصعبین الرحمن پر جمل سازی اور فریب کاری کے سنگین الزامات عام کیے گئے ہیں۔ الزامات میں سے کچھ کو انھوں نے سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، کچھ کے جواب میں الزام لگانے والوں کو بد دعاؤں اور کوسٹوں سے نوازا ہے اور کچھ الزامات کے جواب میں جو موقف اختیار کیا ہے، اس سے "غدر گناہ، بدتر از گناہ" کا عملی نمونہ سامنے آ جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

رشید احمد صدیقی کی دسویں برسی (۱۹۹۷ء) کے موقع پر ان کے مقالے "جدید غزل" کو عابد رضا بیدار کے مقالے "جدید اردو غزل" کے ساتھ ملا کر کافی الذکر نام سے مصعبین صاحب نے شائع کروایا۔ کتاب کے پس ورق پر رشید احمد صدیقی اور سید مصعبین الرحمن کا ایک "گروپ فوٹو" چمپا ہے جو جمل سازی کا شاہ کار ہے۔ تصویر میں دونوں حضرات کسی گنج باغ میں سبزے پر ایک ٹھکی دو کرسیوں پر مستحسن دیکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مصعبین الرحمن کی زندگی بھر رشید صاحب سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھوں نے "بڑی محنت" سے ایک اضافی خالی کرسی کے ساتھ اپنی تصویر کھینچی۔ بعد ازاں رشید صاحب کی ایک تصویر میں سے قطع و برید کے بعد انھیں اپنی تصویر کی خالی کرسی پر

جلوہ افروز کر دیا۔

چھ صفحات پر مشتمل "انتساب"، "انتہاء عقیدت" اور "عرضِ مرجب" کی عبارات میں مصین صاحب نے کہیں یہ وضاحت نہیں کی کہ "میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی چار کی ہے" جیسا کہ بعد میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے انہوں نے لکھا۔ قبل ازیں یہی تصویر "آپ بقی رشید احمد صدیقی" (مرتبہ سید مصین الرحمن) میں بھی شامل کی گئی تھی۔

مصین صاحب کا پیش تر کام "قطع و پیوستہ" CUT AND PASTE کا ہے۔ ان کی آرٹسٹک عبادتیں تک دوسرے ادیبوں کی تحریروں سے اڑائی گئی ہیں اور جہاں انہوں نے ان عبارات کو پیوستہ کرنے کے لیے اپنی کارگزاری دکھائی ہے، وہاں نکل میں ناٹ کا بیوند صاف نظر آ جاتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریر کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے۔..... غزل فن ہی نہیں، فنون بھی ہے۔....." (جدید اردو غزل، ص ۷۱)۔

مصین صاحب نے اس کتاب کو رشید احمد صدیقی کی یاد سے منسوب کیا ہے۔ انتساب کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"غزل فن ہی نہیں، فنون بھی ہے، رشید صاحب بھی کچھ ایسے ہی تھے! غزل کا ذکر آتے ہی مجھے قلابہ گنگے گنگے لگتا ہے اور میرا ذہن رشید صاحب کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔..... جیسے دونوں کو سمت و رفتار، رنگ و آہنگ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہوا"

اس انتساب میں "....." "قالب گنگے" کا کل استعمال، بھل نظر ہے۔ "قالب گنگے" کے معنی ہیں: "شب پڑا۔ قرآن شریف کہیں سے کہیں پڑھنے لگ جانا۔ بھول میں پڑا۔ یاد آنا۔" صاحب "جامع الفات" نے صراحت کی ہے کہ "یہ علامہ صرف قرآن شریف کے متعلق ہے۔"

رشید احمد صدیقی، مصین صاحب کی خاص دلچسپی کا موضوع رہے ہیں۔ ان کے حوالے سے مصین صاحب نے چار کتابیں مرجب کی ہیں اور مزید (کم از کم) دو کتابوں کی

ترتیب کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ رشید صاحب سے اظہار عقیدت میں غلو کی حد کو پہنچ گئے ہیں۔ ”اگر میں ان سے خون کا رشتہ بھی محسوس کرنے لگا ہوں تو کیا جپ! وہ میرے لیے عزیزوں سے زیادہ عزیز تھے، بزرگوں سے زیادہ بزرگ اور دوستوں سے زیادہ دوست!“

”زیادہ عزیز بزرگ دوست“ کی تحریروں سے مصین صاحب کی بے خبری جانے جرت و محسوس ہے۔ ”علی گڑھ میگزین“ (۳۹-۱۹۴۸ء) میں رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ غالب سے متعلق اس مضمون کا عنوان تھا، ”کوئی بتاؤ کہ ہم ہلاک کیے گئے۔“ اس مضمون میں رشید صاحب نے وہ مشہور جملہ لکھا تھا جسے غالب پر تھرے کے ذیل میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ تک رشید صاحب کے حوالے سے انتہائی کایوں میں لکھتے آئے ہیں: ”مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مظہر سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل“

مصین صاحب نے ”قوی زبان“ کراچی میں شائع شدہ بقلم خود انٹرویو میں اپنے ”عزیز بزرگ دوست“ کے اس مشہور قول کو عبدالرحمن بجنوری سے منسوب کر دیا۔

خامد انگشت ہنداں ہے اسے کیا لکھیے!

”بذریعہ نظیر“ (اشاعت: نومبر ۱۹۹۸ء) میں مصین صاحب کے مضمون ”نظیر صدیقی، بے مثل و بے نظیر“ کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے، ”مجھے لاہور، علی گڑھ، الہ آباد، کھنڈ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا.....“

مصین صاحب نے انٹرمیڈیٹ تک تعلیم بہاول نگر سے حاصل کی، بی اے اردو کالج کراچی سے، پکھل ایل ایل بی اردو کالج کراچی سے اور ایم اے (اردو) جامعہ کراچی سے کیا۔ بی ایچ ڈی کی ڈگری سے جامعہ سندھ نے نوازہ احسان نائیک اور دودھ گوتی کو کام میں لاتے ہوئے مصین صاحب نے اپنی ماہرانہ طبیعت کے ذکر سے اجتناب برتا اور تاج جامعات لاہور، علی گڑھ، الہ آباد اور کھنڈ سے اپنا تعلق جڑنے کی سعی کی۔

”نقوش“ کے شمارہ نمبر ۱۳۹ میں ”ادا جعفری، ایک تفصیلی مطالعہ“ کے عنوان سے ایک گوشہ محقق کیا گیا ہے جس میں محترمہ ادا جعفری کے انتخاب کلام کے ساتھ ساتھ

”اداء جعفری، سوانحی و مزاحی خاکہ“ اور ”اداء جعفری کا شعری سرمایہ تحقیق اور تلاش کی روشنی میں“ کے عنوانات کے تحت ڈاکٹر سید مصین الرحمن کے نام سے دو تحریریں شامل اشاعت ہیں۔ یہی دونوں تحریریں ”اداء جعفری..... شخصیت اور شاعری“ نامی مقالے میں ”شعاش“ (ص ۱۳ تا ۵۹) اور ”تحقیق اور تلاش“ (ص ۱۶۲ تا ۳۶۷) کے نام سے دو ابواب کے طور پر موجود ہیں۔ یہ مقالہ اہم۔ اے۔ اردو کی تکمیل کے لیے بشری باسط نامی طالبہ نے گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو میں داخل کرایا تھا۔ اس مقالے کے نگران ڈاکٹر سلیم اختر تھے۔ ڈاکٹر صاحب مقالے کے معیار سے مطمئن نہ تھے، بنا بریں مقالے کی ”تھمرانی“ مصین صاحب نے سنبھال لی۔

اپنی شاگرد کی تحریریں کو سرق کرنے کے الزام کا جواب دیتے ہوئے مصین صاحب نے ایک جرم کا اعتراف کیا ہے کہ دراصل مذکورہ طالبہ کے مقالے کے لیے یہ تحریریں انھوں نے خود لکھ کر دی تھیں تاکہ طالبہ جلد از جلد امریکا جا کر اپنی پیار والدہ سے مل سکے۔ طالبہ نے بھی اپنے مقالے کے پیش لفظ میں اس جانب اشارہ کیا ہے کہ مقالے کے آغاز اور اختتام کے اجزا میرے لیے بھولہ ”ارمغان اور عطیہ دہان“ ہیں۔

واضح رہے کہ اہم۔ اے۔ کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے..... اور ملکی قوانین کے تحت امتحانات میں امیدوار کی اعانت کا مل دست اندازی پالیس، جرم ہے۔ مصین صاحب لکھتے ہیں: ”اگر کسی نہ کسی طور ان کا تھیس مکمل نہ ہو پاتا تو وہ اہم۔ اے۔ کے دوسرے سالانہ امتحان میں شرکت کے لیے پاکستان نہ آ پاتیں اور گورنمنٹ کالج لاہور کے ہاسٹل میں، والدہ سے دور، تین برس کی طویل مدت گزارنے کے بعد اور باوجود صرف بی اے کی بی اے رہ جاتیں۔“

گویا اگر کوئی طالب علم کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو انسانی ہمدردی کے تحت اس کی جگہ امتحان دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ متعلقہ ڈگری کے حصول میں کامیاب ہو جائے۔ انہوں! کہ ہمارے ملکی قوانین، انسانی ہمدردی کے اس عظیم فعل کو نظر امتحان سے نہیں دیکھتے۔ قانون کی اس حکم کھلا خلاف ورزی اور شائع شدہ تحریری وثائق کے باوجود مصین صاحب اس وقت تقریباً حکم تعلیم حکومت پنجاب میں بی بی ایس ۲۱ کی محکماہ اور سرامات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

محترمہ ادا جعفری پر ان کی تحریروں کے تنازع ہونے کا ایک ثبوت ۱۹۹۸ء میں شائع ہونے والی کتاب "ادا جعفری، شخصیت اور فن" ہے جس کے مرتبین ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور امراؤ طارق ہیں۔ اس کتاب میں قاضی عبدالغفار کی تحریر سے لے کر "جنگ فورم" کے تحت شاعرہ کی خود نوشت پر اظہارِ خیال کے لیے منعقدہ مذاکرے کی کارروائی تک ۳۹ تحریریں شامل کی گئی ہیں، تاہم پوری کتاب میں ڈاکٹر سید معین الرحمن کا نام وحوطے سے بھی نظر نہیں آتا۔

پرتوی چندر کی سالہا سال کی تحقیق اور ان کے بیٹے نامور فوٹو گرافر وید پرکاش کی فوٹو گرافی کے اظہاروں سے مزین "چاکیر غالب" کو معین صاحب نے "ترتیب نو" تعارف اور مقدمہ کے نام پر اپنے نام سے چھاپا اور اس دوق پر اپنی ہی تحریر کے اقتباس کے ساتھ اپنی رنگین تصویر شائع کی۔

لاری سے اچھی واقفیت نہ ہونے کے باوجود رشید حسن خان کے کچے ہوئے غالب کی کتاب "دھنڈو" کے اردو ترجمے کی بنیاد پر "غالب اور انقلاب ستان" نامی کتاب اپنے نام سے شائع کی۔ ہم غرضی یہ کہ ہندوستان میں اس کتاب کی طباعت کی عمرانی رشید حسن خان صاحب کے سپرد کر دی اور ان کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے کتاب کی طبع سوم (دہلی، ۱۹۸۸ء) میں غالب کے ایک مصرع کا حلیہ لگا کر رکھ دیا:

کیوں کر شکر ادا کیجیے اس لطیف خاص کا

معین صاحب نے یہ "مصرع" اسی صورت میں "چاکیر غالب" کے مقدمے کے اختتام پر کتاب کے ناشر عبداللطیف چودھری کی خدمت میں پیش کیا ہے (ص ۳۱)۔

غالب کا شعر ہے:

کس حد سے شکر کیجیے اس لطیف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمہاں نہیں

ایک ایسا شخص جو غالب کے ایک مشہور مصرعے کو ایک سے زائد جگہوں پر ہے وزن اور بے ربط کر کے لکھتا ہو، ماہرِ غالبیات ہونے کا دعوے دار ہے، بلکہ اصغر ندیم سید

کے نام سے چھپنے والی تحریر میں اسے "غالب شکافی نہیں سب سے معجز شخصیت اور غالب کے سب سے بڑے محقق و نگار" کے گرام قدر الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

تقو برتو، اے چرخ گرداں تقو!

(ماہنامہ "سورج" لاہور۔ فروری ۲۰۰۱ء۔ ص ۱۳ تا ۲۰)

دیوان غالب، نسخہ خواجہ اصل حقائق

نگہت جہاں

حال ہی میں منظر عام پر آنے والی کتاب ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق“ میں ڈاکٹر حسین فراقی صاحب نے جناب ڈاکٹر مصین الرحمن کی ادنیٰ بہ دینی اور سرتے کا پردہ بھی چاک کیا ہے اور ان کی تحقیق کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے باقاعدہ ثبوت و شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر مصین الرحمن صاحب کا حصارف ”دیوان غالب“ جسے وہ ”نسخہ خواجہ“ کہتے ہیں، اصل میں ڈاکٹر سید مہدائے کا وہی حصارف نسخہ ہے جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے گم ہو چکا ہے۔

یہ بات حسین فراقی صاحب نے قیاساً نہیں کی بلکہ واضح دلائل کے ساتھ اصل حقائق پر کتاب کیے ہیں کہ ڈاکٹر سید مہدائے کا حصارف نسخہ جسے امتیاز علی عرشی نے ”نسخہ لاہور“ کا نام دیا تھا، اور ڈاکٹر مصین الرحمن کا حصارف نسخہ جسے مصین صاحب نے ”نسخہ خواجہ“ کا نام دیا ہے، دراصل دونوں ایک ہیں، مگر مصین صاحب نے اس قلمی نسخے کو ”نسخہ لاہور“ سے الگ ثابت کرنے کے لیے جگہ جگہ تسمیہ قات سے کام لیا ہے۔

ڈاکٹر سید مہدائے نے ”نسخہ لاہور“ کے جو کوائف بتائے تھے اور قاضی مہدالودا نے ”مترکات“ کے زیر عنوان مخطوط ”دیوان غالب“ کے سرتے کے تحت پنجاب یونیورسٹی کے اسی نسخے پر مختصر تصدیقی حذرہ لکھا تھا، اس کے نکات اور امتیاز علی عرشی نے (نسخہ عرشی) میں جو خصوصیات بیان کی تھیں، تقریباً وہی خصوصیات ”نسخہ خواجہ“ میں موجود ہیں جن کا اقرار خود مصین صاحب نے بھی کیا ہے۔

سید مصین الرحمن صاحب نے جن خود ساختہ اختلافات کی بنیاد پر اپنے نسخے کو

”نسۃ لاہور“ سے الگ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان تمام اختلافات کا حسین فراقی صاحب نے خصوصاً دلائل کے ساتھ رد کیا ہے۔ اس ضمن میں پاکستان کے معروف مخطوط شہساز غلیل الرحمن دادوی کے مطابق معین الرحمن صاحب کا حعارف ”دیوان غالب“ کا نسۃ دی ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے جولائی ۱۹۵۴ء کے ”ماہ نو“ کے شمارے میں حعارف کرایا تھا، جو اب پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری ہو چکا ہے۔

رشید حسن خان بھی ”نسۃ لاہور“ اور ”نسۃ خولجہ“ کو الگ الگ قرار نہیں دیتے۔

بقول ان کے :-

”ملکیت بدل جانے سے نسۃ نہیں بدل جاتا“

ڈاکٹر حسین فراقی صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ معین صاحب کو یہ نسۃ کہاں سے ملا؟ فراقی صاحب کہتے ہیں کہ معین صاحب کا کہنا ہے کہ یہ نسۃ ۱۹۸۱ء کے آس پاس، پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے مع ایک قلمی نسخے اور تین نادر مطلوبہ کتب کے ہاتھ لگا، مگر معین صاحب نے یہ وضاحت نہیں کی کہ پرانی کتابوں کا یہ کاروباری کون ہے؟ قیاس کیا جا رہا ہے کہ یہ نسۃ معین صاحب کو ایس۔ ایم۔ اکرام کی لائبریری سے ملا ہے کیونکہ ڈاکٹر سید عبداللہ کی امتیاز علی عرشی کے علاوہ ایس۔ ایم۔ اکرام سے بھی اس تالاب نسخے کے بارے میں خط و کتابت رہی تھی اور سید عبداللہ صاحب نے چھپتے یہ نسۃ ایس۔ ایم۔ اکرام کو روک لیا ہو گا اور کسی وجہ سے یہ واپس نہ آسکا۔ ان کی وفات کے بعد معین صاحب نے ان کی غنی لائبریری کی فہرست سازی کی اور یہ تالاب نسۃ اپنی تحویل میں لے لیا ہو گا۔ واضح رہے کہ قیام پاکستان کے بعد چند سالوں تک بعض خاص افراد کو ایک غلام بھر دینے کے بعد قلمی نسخے چھپی کر دیے جاتے تھے۔ اس طرح میں ممکن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے ذریعے یہ نسۃ ایس۔ ایم۔ اکرام تک پہنچا ہو۔

اردو میں ترجمہ و تحقیق مقنن کے آغاز کو ایک صدی بیت ہوئی ہے۔ قلمی نسخوں کے مرتبین نے نہایت توجہ اور محنت سے بہت عمدہ قلمی نسخے مرتب کیے۔ اس حوالے سے حافظہ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، رشید حسن خان، ڈاکٹر عجم احمد طلوی اور ڈاکٹر خلیق انجم کے نام لیے جاسکتے ہیں، مگر معین صاحب جسے اپنا اصلی تہذیبی کارنامہ قرار دے رہے ہیں، فراقی صاحب کے نزدیک وہ تہذیب کا کامل فخر کارنامہ نہیں

ہے۔ مصین صاحب نے "نئز غولبد" کو چودہ سترہ برس کی ریاضت کا حاصل قرار دیا ہے۔ کیا یہ نئز حقیق و تدوین کے معیار پر چودہ اترتا ہے؟ کیا اسے قتی حقیق و تدوین کا کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ فروقی صاحب نے اس نئے میں ایک سو سے زائد اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ بقول فروقی صاحب، مرتب نے قلمی نئے کی تدوین کے سلسلے میں جا بجا غور کریں کھائی ہیں۔

حقیق کے اصولوں کے مطابق دوادین کی ترتیب کے کام کے سلسلے میں مدون کو زبان قواعد زبان قواعد بیان قواعد شاعری اور اوزان سے واقفیت نہایت ضروری ہے جبکہ مصین صاحب تو مصرع تک وزن میں نہیں پڑھ سکتے اور تدوین متن شعر کے لیے موزوں طبع ہونا شرط اول ہے۔ اور تو اور، فروقی صاحب نے ان کی اس بے خبری کی بھی نشاندہی کی ہے کہ وہ نثر اور شعر کی منگی عبارات کو معلوم عبارات سمجھ بیٹھے ہیں۔ حقیق کے اصولوں کے مطابق تو ایسے شخص کو ترتیب دیوان کے پیکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ (ص ۲۷، ۲۸، ۲۹)

مصین صاحب کے تدوین کردہ نئے میں اغلاط کی اتنی بھرمار ہے کہ اسے کسی بھی طرح مجدد حقیق و تدوین کا ورد نہیں دیا جاسکتا اور اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض اور قابل مذمت بات یہ ہے کہ یہ نئز ہی مسروقہ ہے۔ اس مسروقہ نئے کو اپنا حقیقی کارنامہ قرار دے کر شائع کرانا باعث ندامت ہے اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ مصین صاحب کے سرنے کی یہ داستان، داستان اول نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی اولی چودیاں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل ادب ان سے باخبر ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ پرتوی چندر کی "حاکیر غالب" مصین صاحب اپنے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر چھپوانے کا معاملہ بھی سب پر عیاں ہے۔ اپنی ہی شاگرد بشری باسلا کے مقالے "ادب معرفی" شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ بھی رسالہ "نقوش" میں اپنے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ "ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک نادر غلط" جسے ناصر دقار نے سہ ماہی "ارتکاز" اکتوبر ۱۹۹۵ء میں حصارف کر لیا تھا "ای غلط کو ۱۹۹۵ء کے ہی ماہ نومبر میں رسالہ "طامست" میں مصین صاحب نے اپنے نام سے حصارف کر دیا۔ یہ سب اولی کھیلے نہیں ہیں تو کیا ہیں؟

فراقی صاحب کی کتاب، جس میں انھوں نے مصمین صاحب کے سرفقے کے دائرہ فاضل کیے ہیں، کے جواب میں مصمین صاحب نے جو وضاحت نامہ لکھا ہے، وہ وضاحت نامہ نہیں بلکہ دشنام نامہ محسوس ہوتا ہے۔ تحقیقی اور علمی امور اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ انھیں علمی چھڑائے میں جان کیا جائے اور اختلافی امور کو سچتے سے جان کیا جائے مگر یہ بات قابل افسوس ہے کہ مصمین صاحب نے جو زبان استعمال کی ہے، انھیں اس قسم کی عامیانہ اور بازاری زبان سے اجتناب کرنا چاہیے تھا۔ حسین فراقی صاحب عرصہ بچپن برس سے پیشہ تدریس سے وابستہ ہیں اور سب ہی ان کی شرافت خاصہ اور دیانتداری کے قائل ہیں۔ ماہنامہ ”تحقیق“ کے مدیر اعظم جاوید نے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں فراقی صاحب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

”حسین فراقی کے بارے میں سب کی یہی رائے ہے، وہ کسی ادبی دھڑے بندی یا یونیورسٹی اساتذہ کی کسی حلقی سیاست میں شریک نہیں رہے۔ وہ ایسے شاعر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مرنج، وضع دار اور شریف انٹلس انسان ہیں۔“

اعظم جاوید آگے چل کر لکھتے ہیں:

”چند دن پہلے ایک قوی اخبار میں لطیف الزماں کا انٹرویو چھپا۔ ایک زمانہ نہ صرف ان کی تحقیق و جستجو کا قائل ہے بلکہ انھیں غالب پر سند کا درجہ دیا جاتا ہے۔ لطیف الزماں نے بھی حسین فراقی کی حمایت کی ہے اور مصمین الزماں کی وہ چار اور چھریاں بھی گنوا دی ہیں۔“

مصمین صاحب کو کسی شریف انٹلس انسان کے بارے میں بات کرتے ہوئے اخلاق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ فراقی صاحب کی ادبی دنیا میں ایک اچھی پہچان ہے، نیک شہرت ہے۔ ان کی بہت سی علمی تنقیدی تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ وہ ایک صاف گو اور دیانت دار محقق کی حیثیت سے معروف ہیں اور کئی نئی اور نیاں اتقویٰ کالفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ وہ ذاتی تاثرات و تہمتوں سے بالا ہو کر فن پاروں اور ادبی کارناموں کا جائزہ مرحب کرتے ہیں۔ چنانچہ زیر نظر کتاب میں بھی انھوں نے سمرقانی اور خاص علمی انداز میں حقائق کو جان کیا ہے۔

ڈاکٹر مصیٰب الرحمن صاحب ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ایک استاد کے لیے اس قسم کے معاملات میں ٹوٹ ہونا نہ صرف بذات خود شرمندگی کا باعث ہے بلکہ تعلیم جرم بھی ہے۔ یہ اس ادارے کی بدنامی ہے جس سے مصیٰب صاحب وابستہ ہیں۔ تدریس ایک نہایت مقدس اور بے غیرانہ منصب ہے۔ مصیٰب صاحب نے اس قسم کے کام کر کے نہ صرف اپنے پیشے کے ساتھ ناانصافی کی ہے بلکہ تحقیق کے تقاضے بھی مجروح کیے ہیں۔

(مجلہ ”ادب“۔ شمارہ نمبر ۲۰۰۰ء۔ ص ۳۳ تا ۳۶)

جاگیر غالب سے دیوانِ غالب تک

اختر حیات

قوموں کے عروج و زوال کے قلعے پر غور کیا جائے تو، اور اسباب کے علاوہ ایک بڑا سبب اُس قوم کی تصور زندگی قرار پاتا ہے۔ رومہ قوم میں حرکت اور حرارت کو اپنی زندگی کا اصل اصول قرار دیتی ہیں اور خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگی رہتی ہیں۔ نئے نئے علمی انکشافات اور تازہ کاری ان کے ضمیر کا حصہ ہوتی ہے۔ وہ ہر لمحہ اپنے عمل کا حساب کرتی رہتی ہیں اور ہر لمحہ صداقت اور سچائی کی تحریک انھیں بے چین رکھتی ہے۔ مغربی قوموں کے عروج اور نکلنے کا بڑا سبب ان کی یہی علمی لگن ہے جس کے سبب وہ کائنات کی تفسیر میں لگن ہیں اور دنیا کے متعدد منطقوں پر اپنی لطافتی برتری کا جھنڈا گاڑے ہوئے ہیں۔

پاکستان کو معرض وجود میں آنے پر پہلا برس ہو چکا مگر بد قسمتی سے یہ ملک ابھی تک کوئی بڑی علمی اور تحقیقی روایت پیدا نہیں کر سکا۔ پاکستان کے وہ تعلیمی ادارے جو تقسیم سے پہلے اپنی بے پناہ علمی لگن اور تحقیقی کارناموں کے باعث دنیا میں ایک نام تھے، تخلیق پاکستان کے بعد اپنا علمی معیار قائم نہ رکھ سکے۔ موجد شیوں کی علمی مسندوں پر رونق رنق ایسے لوگ قابض ہوتے چلے گئے جن کی حیثیت سیاسی طالع آزمائوں سے مختلف نہ تھی۔ حکام ری، عہدہ جلی اور بلند مناصب ان کی زندگی کا واحد مقصد قرار پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ داخل کا ہیں اور ممتاز علمی ادارے انھی کا روپاری ذہنیت رکھنے والے لوگوں کی ہیئت چڑھ گئے۔ ان لوگوں کی چونکہ خود کوئی ممتاز علمی حیثیت نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنے اسلاف میں بھرتی کرنے کے لیے بھی اپنی ہی قبیل کے لوگوں کا چناؤ شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ کہ طالع آزمائوں اور علم کو کاروبار بنانے والوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ اب ان تعلیمی اداروں کی حالت یہ ہے کہ علم اور تحقیقی کے نام پر جھوٹ اور جھل کا کاروبار پروان چڑھ رہا ہے۔ تعلیمی اداروں کے ساتھ بڑا علمی و تحقیقی کام کرنے کی بجائے طلبہ کے لیے نوٹس لکھ رہے ہیں

اور جیسا ہمارے ہیں۔ ہادی آسانکٹوں کے حصول کے لیے ایک موٹے دوڑ لگی ہوئی ہے۔ علم کی مسند میں جہالت کی آماج گاہیں بن گئی ہیں۔

عرصہ ہوا مشہور صحافی ممتاز لیاقت نے ایک بڑی ہنگامہ خیز کتاب ”بکف چراغ وارڈ“ مرتب کر کے شائع کی تھی، جس میں انھوں نے بعض نامور ادبا کی علمی ڈاکہ زنی کو طشت ازہام کیا تھا۔ یہ کتاب بچپن میں برس پہلے لکھی گئی تھی۔ تب سے اب تک علمی ڈاکہ زنی کی یہ روایت مزید پھیلی پھولی، اور اب حالت یہ ہے کہ ہر لوگ دھڑلے سے دوسروں کے علمی کاموں کو اپنے ناموں سے چھپانے لگے، اور بد قسمتی سے کوئی ان کا محاسبہ کرنے کو تیار نہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں، جہاں ایک زمانے میں محمد حسین آزاد، ڈاکٹر لائٹر، علامہ اقبال، ڈاکٹر عبدالسلام اور خواجہ منظور حسین جیسے بڑے اساتذہ پڑھاتے تھے، وہاں بعض ایسے اساتذہ بھی پڑھا رہے ہیں جو شاہیں بچوں کو خاک ہازی کا درس دے رہے ہیں۔ اب اردو کے ذہین اور صدر شعبہ سید مصین الرحمن علی کو لکھیے۔ انیسویں گریڈ کے ان پروفیسر صاحب نے کچھ عرصہ پہلے دیوانی غالب کا ایک قلمی نسخہ ”نسخہ خواجہ“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ ان کے بقول انھیں ”پرائی کنٹریوں کے ایک کاروباری“ سے ملا تھا۔

یہ قلمی نسخہ غالب کے ۱۸۵۲ء تک کے کلام کا حامل ہے۔ یہ نسخہ اپنی خوبصورت مٹلا لوح اور عمدہ کتابت کی وجہ سے کسی شاہزادے کے خزانے کی محتاج لگتا ہے، جو ۱۸۵۷ء کے سانحے میں لٹ کر، کئی ہاتھوں سے گزر کر بالآخر ۱۹۵۲ء میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کی زینت بنا۔ وہاں سے یہ نسخہ چوری ہو کر یا کسی اور واسطے سے سید مصین الرحمن کے ہاتھ لگا اور انھوں نے اسے ۱۹۹۸ء کے آخر میں ”دیوانی غالب، نسخہ خواجہ“ کے نام سے شائع کر دیا۔ پھر اس نسخے پر پاک و ہند کے ممتاز و غیر ممتاز اہل قلم سے فرمائشی مضامین لکھوا کر اپنے شیخ کے مانتوں کے نام سے اپنے ہی اشاعتی ادارے سے شائع کر دیے۔ مصین الرحمن صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ ان کا شائع کردہ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ نہیں، جبکہ بعض اہل علم کی رائے میں یہ بین بین پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نہایت قیمتی نسخہ ہے اور مصین صاحب نے اسی مال مسروقہ کو اپنی محتاج بنا کر شائع کیا ہے۔

اس ضمن میں کچھ عرصہ پہلے ایک کتابچہ "دیوان غالب، نسخہ خوب۔ اصل حقائق" کے زیر عنوان شائع ہوا، جس میں قوی دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیوان غالب کا یہ قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا وہی قلمی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی ۱۹۵۴ء میں ممتاز استاد، دانشور ڈاکٹر سید عبداللہ نے "ماہ نو" میں کرایا تھا۔ اس کتابچے کے مصنف ممتاز محقق اور نگار ڈاکٹر تحسین فراقی ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے اس مقالے میں جن دلیلوں کے ساتھ اسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ قرار دیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سید مصین الرحمن کے حواضہ نسخے کے صفحات ایک سو اٹھائیس ہیں۔ سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی مرثی نے بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے دیوان غالب کے جس قلمی نسخے کا تعارف کرایا تھا، اس کے صفحات ایک سو اٹھائیس ہیں۔

۲۔ مصین الرحمن کے حواضہ نسخے کی طرح باقی حضرات کے حواضہ نسخوں میں بھی مسطر کی سطروں کی تعداد پندرہ ہے۔

۳۔ مصین الرحمن صاحب کے حواضہ نسخے کی لوح سطحا اور مذہب ہے اور چھ رنگ کی ہے۔ باقی حضرات کا حواضہ نسخہ بھی بالکل ایسی خصوصیات رکھتا ہے۔

۴۔ مصین الرحمن صاحب کے دیوان غالب کے یکسی متن اور عرشی و سید عبداللہ کے یکسی متن میں نقطہ اور شوشے تک کا فرق نہیں۔

۵۔ نسخہ خیرہ اور نسخہ لاہور کے ایک ہونے کی ایک ناقابل تردید دلیل یہ بھی ہے کہ اس پر لکھنے والے چاروں حضرات نے نیردشتاں کی تقریب کے اختتامی چرے کے جو الفاظ نقل کیے ہیں، ان میں غزل، قصیدہ، قطعہ اور رباعی کے اشعار کی مجموعی تعداد "ایک ہزار پانچ سو پچاس سے کچھ اوپر" بتائی گئی ہے۔

۶۔ نسخہ خوب کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نسخے کا بھی وہی سائز ہے، مسطر کی سطریں، کاتب کے قلم کے حجم کا موازنہ اور صفحات کی تعداد سب ایک ہیں۔ ان میں ایک حرف تو کہا، ایک نقطہ اور شوشے کا فرق نہیں۔ نسخہ خوب کی ہر سطر جس لفظ سے شروع ہو کر جس لفظ پر ختم ہوتی ہے، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے کے محفوظ نسخوں کی

بھی ہر سطر اسی لفظ سے شروع ہو کر اسی لفظ پر ختم ہوتی ہے۔ یہی حال متن کے اشعار کا ہے، یعنی پنجاب یونیورسٹی کے نسخے اور نسخہ خولید میں صفحہ پہ صفحہ بالکل ایک ہی پیٹرن پر اشعار کا اندراج ملتا ہے۔ جس جس صفحے پر "تذک" ہے، وہاں نسخہ خولید اور نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں ذرا برابر فرق نظر نہیں آتا۔

۷۔ ہندوستان کے ممتاز محقق رشید حسن خاں، معین الرحمن صاحب کے متعارف نسخے اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے کو الگ الگ قرار نہیں دیتے۔ ان کا یہ جملہ لاہور اور کراچی کے اہل علم میں گردش کر رہا ہے کہ "حکایت بدل جانے سے نسخے نہیں بدل جاتا۔"

۸۔ ہندوستان کے ایک اور ممتاز مصنف ڈاکٹر حنیف نقوی بھی اس بات کے قائل ہیں کہ معین الرحمن صاحب کا نسخہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا نسخہ ہے، اس سے الگ نہیں۔

۹۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے قلمی نسخے اور معین الرحمن صاحب کے قلمی نسخے میں جو چند اختلاف نظر آتے ہیں، وہ خود معین الرحمن صاحب کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں تحقیقی اور تدوینی معاملات میں پہلے بھی معین الرحمن صاحب کی شہرت اچھی نہیں تھی کیونکہ انھوں نے ایک عرصہ پہلے رشید احمد مدنی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر کی بیڑہ کاری کر کے یہ تاثر دینا چاہا تھا کہ دونوں میں ملاقات رہی ہے، حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پھر معین صاحب نے اپنی شاگرد بشری ہاسٹ کے مقالے "ادرا جعفری، شخصیت اور شاعری" کا بڑا حصہ "نقوش" کے شمارہ ۱۳۹ میں اپنے نام سے شائع کرایا۔ انھوں نے آنجنابی پر تقویٰ چندر کی کتاب "جہانگیر غالب" بھی کچھ عرصہ پہلے اپنے نام سے شائع کر لی تھی اور ان کے اس کارنامے کی تقلید "سورج" کے غالب نمبر ۱۹۹۶ء میں سکھائی گئی تھی۔ اسی طرح کے کسی اور انصاف کارنامے ان کے ہاتھوں پہلے بھی انجام پائے ہیں۔ اس لیے کچھ عہدہ نہیں کہ انھوں نے اپنے قلمی نسخے کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے سے الگ ثابت کرنے کے لیے اس میں ترامیم کر لی ہوں۔

۱۰۔ دیا ان غالب کے نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے آخری صفحے پر عدد ہر صاف نظر آتی

ہے۔ مصنف صاحب کے نسخے میں اس دور مہر کے اوپر کسی "فنے دین" کی چھٹی لکادی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے سوال اٹھایا ہے کہ کیا "فنے دین" اور "بناب مصنف" اصل میں دونوں ایک ہیں۔

۱۱۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے اس قیاس کا بھی اکتہار کیا ہے کہ مصنف صاحب کو دیوان غالب کا یہ نامہ نسخہ مشہور غالب شناس ایس۔ ایم۔ اکرام کی لائبریری سے ہاتھ لگا ہے جس کی کتب کی فہرست سازی انھوں نے اکرام کی وفات کے بعد کی تھی۔ یہ نسخہ ایس۔ ایم۔ اکرام تک سید عبداللہ کے توسط سے پہنچا ہوگا کیونکہ سید عبداللہ اور ایس۔ ایم۔ اکرام کے مابین اس نسخے کے سوا اور بعض دیگر تحقیقی امور کے قصین کے ضمن میں خط و کتابت رہی تھی۔

۱۲۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے دیوان غالب متعارف معین الرضیٰ کے ضمن میں متعدد اہل علم سے بھی تبادلہ خیالات کیا۔ ان سب کی مختلف رائے یہ ہے کہ نسخہ خواجہ متعارف معین الرضیٰ، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ہی کے گم شدہ یا مسروق نسخے کا ظہور ثانی ہے۔

۱۳۔ پاکستان کے ممتاز ترین خطوط شناس اور صاحب نظر محقق خلیل الرضیٰ داؤدی کا خیال ہے کہ ان کا پچاس برس کا خطوط شناسی کا تجربہ بتاتا ہے اور ان کی سوچی سمجھی رائے ہے کہ مصنف الرضیٰ صاحب کا متعارف نسخہ مین مین اور ہو بہو وہی نسخہ ہے جس کا تعارف جولائی ۱۹۵۳ء کے "ماہ نو" میں سید عبداللہ نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ایک نامہ نسخے کے طور پر کر لیا تھا اور جو اب پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو چکا ہے۔

۱۴۔ ڈاکٹر حسین فراقی کے پیش نظر کتابچے میں جو دلیل سب سے اہم نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی تحقیق کی رو سے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ضابطے کے مطابق اس لائبریری کا حصيدار نمبر ۳۴ ہے، جہاں ایکسٹینشن نمبر لگایا جاتا ہے ۴ کہ اگر کتاب چوری ہو جائے تو اس نمبر ۳۴ پر لگے نمبر کی مدد سے اس کی پہچان اور بازیافت ممکن ہو۔ اس تناظر میں اگر مصنف الرضیٰ صاحب کے نسخہ خواجہ کے ص ۳۲ کی ٹکسی نقل دیکھی جائے تو جدول کا زیریں حصہ صاف کمرہا گیا نظر آتا ہے۔

اس حصے پر اس نادر قلمی نسخے کا ایکسپٹن نمبر درج تھا اور یونیورسٹی کی مہر ثبت تھی۔
ڈاکٹر حسین فراقی نے متعدد بالا دلائل کی روشنی میں سوال اٹھایا ہے کہ آخر اس
مطلوک یا مسروق نسخے کی خریداری ”پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے“ کس اصول
کے تحت کی گئی اور کیا اندریں حالات، اس کا موجودہ مالک قانون کی گرفت سے بچ سکتا
ہے؟

ڈاکٹر حسین فراقی نے جن دلائل کو دیتا ہے ان کی روشنی میں یہ یقین کرنے میں
کوئی شبہ نہیں رہتا کہ مصین الرحمن صاحب کا دیوان غالب کا متعلقہ نسخہ یقینی طور پر پنجاب
یونیورسٹی لائبریری ہی کا نادر قلمی نسخہ ہے۔

”دیوان غالب، نسخہ خوبہ۔ اصل حقائق“ نامی اس مقالے میں مصنف نے جہاں
یہ ثابت کیا ہے کہ دیوان غالب کا یہ نسخہ دراصل، پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گم شدہ یا
مسروق نسخہ ہے، وہاں نہایت تفصیل کے ساتھ اور مثالیں پیش کر کے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ
نسخہ خوبہ کے مرتب سید مصین الرحمن مصرع سوزوں نہیں پڑھ سکتے اور ان کا یہ تدوینی کام،
جس میں بقول مصین صاحب، انھیں سولہ سترہ برس کی محنت اور ریاضت کرنی پڑی، تدوین کا
نہایت ناقص اور نامیوس کن نمونہ ہے۔

ڈاکٹر حسین فراقی کا خیال ہے کہ ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ“ کے مدونہ متن اور دیگر
اسور پر تحقیقی نگاہ ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصین الرحمن صاحب بڑی جھگٹ میں تھے۔
انھوں نے نکسی متن کے باقاعدہ ہر صفحے کے اشعار کو جدید کتابت میں بھی شائع کیا ہے
تاکہ جو لوگ قدیم خط سے واقف نہیں، وہ بھی دیوان کو سہولت سے چھ نکس، مگر اسوں پر
ہے کہ مرتب موصوفہ نادر قلمی نسخے کا متن زیادہ توجہ سے دیکھ پائے اور نہ اس کی اطمینان
بخش باز نوشت TRANSCRIPTION کر سکے۔ چنانچہ انھوں نے جا بجا ٹھوکریں کھائی
ہیں۔

دیوان غالب کے نسخہ لاہور کی قلمی تحقیقی و باز نوشت میں ان کا بالال مرثی کا مرتبہ
دیوان غالب رہا ہے چنانچہ اس کی اندھا دھند تقلید سے (خصوصاً رموز اوقاف کے ضمن
میں) تدوین کے تقاضے غور و خوض ہوئے ہیں اور بعض جگہ معلوم قلم ہو گیا ہے۔ معاملہ صرف
شعری متن تک محدود نہیں، مصین الرحمن کے پیش کردہ نثری متن میں بھی غلطیاں ہیں اور

کلام غالب کی توقیت کے ضمن میں پیش کردہ مصرعوں، توضیحات اور تعلیقات میں بھی۔ انھوں نے غالب کے فارسی دیباچے اور نیر درخشان کی تقریباََ کے جوڑے ”تکلیل دیے“۔ ان میں بھی انھوں نے کئی مقامات پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ جہاں کہیں فلاطین کا اہتمام ضروری تھا، وہاں سرے سے ایسا کوئی اہتمام نظر نہیں آتا۔ حد تو یہ ہے کہ اس مختصر سے دیوان غالب کے شعری متن کے مشمولات کی فہرست تک غیر حاضر ہے۔

تدوین شاعری کے لیے املا کا یکساں ہونا ضروری ہے مگر مصنف الرحمن صاحب، مقالہ نگار کے بقول، اس ضمن میں بھی اشتکاء ذہنی کا شکار نظر آتے ہیں جس کے باعث املا دو جگہ کا ٹوٹ بن گئی ہے۔

مصنف صاحب نامزدوں طبع بھی ہیں۔ اس لیے انھوں نے قطعات کے منقحی عنوانات پر کو محکوم عنوانات قرار دے کر قارئین کے لیے تفصیل طبع کا دافع سامان پیدا کیا ہے۔ علاوہ انہیں مقالہ نگار کی داسے ہے کہ مصنف صاحب فارسی زبان سے قطعی ناواقف ہیں۔ اسی لیے ان سے غالب اور نیر کی فارسی عباروں کو نقل کرتے وقت کئی مقامات پر لغزشیں ہوئی ہیں۔ انھوں نے اضافاتوں کا سہہ جا استعمال کر کے فارسی متن کے مفہوم کو خراب کر دیا ہے۔ مقالہ نگار لکھتے ہیں:

”حیرت اس بات کی ہے کہ نسخہ خولہ کے مرتب کی کاوش سے ایک سو چھتیس برس قبل مطبع کھای کے شائع کردہ دیوان غالب (۱۸۶۲ء) میں غالب کا فارسی دیباچہ کامل صحت کے ساتھ شائع ہو چکا تھا۔ نیر مصنف سے مدتوں پہلے مرثی اپنے نسخے میں فارسی دیباچہ و تقریباََ بہت حد تک اطمینان بخش طریقے سے شائع کر چکے تھے۔ مگر انھوں نے نسخہ خولہ مرتب کرتے وقت وہ ان کاوشوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ خود وہ فارسی جانتے نہیں کہ ان مشکل مہارت کو صحت کے ساتھ ضبط کر سکتے۔“

قصید فراقی صاحب کی یہ کاوش اس باب میں بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے اپنے اس مقالے میں واضح کر دیا ہے کہ دیوان غالب کے فارسی دیباچے (از غالب) کے کم از کم تین تراجم مصنف صاحب کے ترانے سے قبل شائع ہو چکے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے اعظم علوی، ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور پروفیسر جاوید علی سید کے تراجم کا ذکر اور تقابل کیا

ہے اور لکھا ہے کہ یہ تراجم چند کونانیوں کے ہاں موجود اپنی اپنی خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور مصنف صاحب نے ان میں سے بعض تراجم کو سامنے رکھ کر میں اپنا ترجمہ تشکیل دیا۔ یعنی ان کا پیش کردہ ترجمہ خود ان کی اپنی کاوش نہیں۔

زیر نظر مقالے کے آخر میں ڈاکٹر حسین فراقی نے ان جدید عینکوں کا ذکر کیا ہے جس کی مدد سے کسی بھی علمی نسخے میں کی جانے والی ایک نقطے کی تحریف کی نشاندہی بھی ممکن ہے۔ اگر مصنف صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا دیوان غالب کا نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نسخے سے الگ کوئی نسخہ ہے تو کیا وہ اس کے اس عینکی معائنے پر تیار ہیں؟

پیش نظر کتاب ”دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ، اصل تھاکن“ کا ثمر مقدم کرنا چاہیے۔ اس قسم کی علمی و تحقیقی کاوشیں اس اعتبار سے مفید ہوتی ہیں کہ ان سے نہ صرف تحریف اور جعل کا درست بند ہو جاتا ہے بلکہ اعلیٰ علمی تحقیق کے لیے نئے رستوں کے امکانات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ فاضل مصنف حافظ محمود شیرانی کی علمی روایت کے امین ہونے کے ناطے مہارکھاد کے مستحق ہیں۔

(ماہنامہ ”سورج“ لاہور۔ اپریل ۲۰۰۱ء۔ ص ۲۹ تا ۳۱)

”دیوانِ غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق“

رفاعت علی شاہد

ڈاکٹر سید مصحیح الرحمن نے ۱۹۹۸ء میں ”دیوانِ غالب (اردو)“ کے ایک نادر مخطوطے کا کس شائع کیا اور حقیقت کی بنا پر اسے معروف تعلیمی شخصیت خواجہ منظور حسین کے نام سے معنون کرتے ہوئے اسے ”نسخہ خواجہ“ کا نام دیا۔ انھوں نے اپنے مقدمے میں بتایا کہ انھیں ”دیوانِ غالب“ کا یہ نادر مخطوطہ پرانی کتابیں بیچنے والے ایک کتاب فروش سے دستیاب ہوا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بڑے جذبات سے لکھا کہ اس مخطوطے کی ترتیب میں ان کی عمر عزیز کے کئی قیمتی سال صرف ہوئے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مصحیح الرحمن صاحب کے ان دعووں کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ فاضل مصنف ڈاکٹر حسین فراقی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصہ اول میں مصحیح الرحمن صاحب کے اس دعوے کے بارے میں تحقیقی و واقعاتی شواہد پیش کیے گئے ہیں کہ دیوانِ غالب کا مخطوطہ انھیں کسی کتاب فروش سے ملا تھا۔ حسین فراقی صاحب نے ناقابل تردید ثبوت پیش کر دیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ”دیوانِ غالب“ کا مذکورہ مخطوطہ اصل میں پنجاب یونیورسٹی کا وہی گمشدہ مخطوطہ ہے جس کا تعارف قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی مرثی اور ڈاکٹر سید عبداللہ کراچکی ہیں۔ فاضل مصنف نے مصحیح الرحمن صاحب کے دعووں کا تحقیقی و واقعاتی جائزہ لے کر اصل صورت حال کی وضاحت پر صراحت کر دی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں ”دیوانِ غالب (نسخہ خواجہ)“ کے عملی پہلوؤں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصحیح الرحمن صاحب نے دیوانِ غالب کے قاری دنیاسے کا اردو ترجمہ بھی کتاب میں شائع کیا ہے۔ فاضل مصنف نے یہ دلائل واضح کیا ہے کہ یہ ترجمہ مصحیح صاحب کا زانیہ فکر نہیں بلکہ مصحیح صاحب قاری سے اس حد تک واقف ہی نہیں کہ

قاری سے اردو ترجمہ کر گئیں۔ مصنف کتاب نے دیباچہ دیوان غالب کے اردو ترجموں کی تفصیلات مہیا کر کے یہ واضح کیا ہے کہ مصنفین صاحب نے مختلف ترجمے سامنے رکھ کر اپنا ترجمہ ”وضع“ کیا ہے۔

”دیوان غالب (نثر خوبہ)“ کی تدوین سے متعلق بھی فاضل مصنف نے تحقیق کر کے جیسوں متقی غلیبوں کی نشاندہی کی ہے۔ ان غلیبوں پر نظر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ”نثر خوبہ“ کی عنوان کی اور ترمیم میں کوئی خاص کاوش نہیں کی گئی اور مصنفین صاحب کا یہ دعوائل نظر ہے کہ اس کام میں ان کی عمر مزید کے پورے سترہ سال صرف ہو گئے۔ کتاب کے آخر میں ”نثر خوبہ“، ”دیوان غالب“ (نثر جامو پنجاب) حصارف سید عبداللہ اور ”دیوان غالب“ حصارف مولانا امتیاز علی عرشی کے چند صفحات کے عکس برائے مواد شامل کیے گئے ہیں۔ ان کا تعلق کتاب کے پہلے حصے سے ہے، یعنی ”نثر خوبہ“ کوئی الگ نثر نہیں بلکہ جامو پنجاب کا گمشدہ نثر ہی ہے۔ پیش کیے گئے عکسوں سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ تینوں حضرات کے حصارف نثروں کے متعلقہ اوراق کے عکس سے صاف نظر آ رہا ہے کہ تینوں میں سر مو فرق نہیں۔ اس کے علاوہ صفحہ ۲۲ سے سب خانہ جامو پنجاب کے انکسپشن نمبر کا پچھلا جانا اور ”نوٹے کے آخر میں سب خانے کی سر پر چھپی لگا کر اوپر ”نئے دین، فتح دین“ لکھنا اس امر کو تقویت پہنچا کر پاپے ثروت تک پہنچا دیتے ہیں کہ ”نثر خوبہ“ اصل میں جامو پنجاب کا گمشدہ نثر ہی ہے۔ انکسپشن نمبر کا پچھلانا اور سر پر چھپی لگانا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ سب کچھ جعل سازی سے مال مسروق کو اپنانے کے نقطہ نظر سے کیا گیا۔

فاضل مصنف (ڈاکٹر حسین فراقی) نے اس چھوٹی سی کتاب میں بڑا صحر کر کیا ہے۔ ادب میں ہوں تو جعل سازی کا چرچا بول سے رہا ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ اتنی وضاحتی کے ساتھ کسی نے جعل سازی نہیں کی ہوگی جیسی مصنفین صاحب نے کی ہے۔ فاضل مصنف کا انداز تحریر سادہ اور موثر ہے۔ انھوں نے بڑی چابک دستی سے اپنے اعتراضات تحریر کیے ہیں کہ پوری کتاب میں کہیں ایک جملے میں بھی ذاتی عناد کا رنگ نظر نہیں آتا، جبکہ میرا موقف یہ ہے کہ اس طرح کے ”لوہی دردوں“ کے خلاف سخت لہجے اور انداز میں بات کرنا غیر مناسب نہیں۔ اس نقطہ نظر سے فاضل مصنف نے اپنا ہاتھ بہت

ہلکا رکھا ہے۔

”ادب کی کساد بازاری“ کی اصطلاح ہمارے ہاں آج کل بہت مستعمل ہے۔ اس کی ایک وجہ اس طرح کے اوجھے جھکنڈے استعمال کرنے والے نام نہاد ادیب اور محقق بھی ہیں، جس کی ایک مثال فاضل مصطفیٰ نے اپنی کتاب میں تفصیل سے بیان کر دی ہے۔ حقیقت میں ڈاکٹر فراقی نے ادبی جہاد کہا ہے اور ایک ایسے جمل ساز اور سادق کے خلاف آواز اٹھائی ہے جس کی بھولی قریب میں بڑے بڑے ادیب رطب اللسان تھے۔

یہ کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ارد گرد صرف انسان ہی نہیں ادبی ڈاکو بھی موجود ہیں۔ جو قریب نظر سے دوسروں کا اعتماد حاصل کر کے دغا بخاتے پھر رہے ہیں۔ ان کے خلاف کلہ جی کہتا اس وقت سب سے بڑا جہاد ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی کی اس کتاب کو پہلا پتھر بھینسا چاہیے جو پر سکون پانی کی سطح پر ارتعاش پیدا دیتا ہے۔ امید کی جاتی چاہیے کہ ادب کی بھڑی اور قلعہ کے لیے ایسے جہاد کرنے والے ہاں باز منظر عام پر آئیں گے اور اپنی تحریروں سے جعلی ادیبوں کی ننگائی کر کے ادب کی خدمت بجالائے رہیں گے۔

(روزنامہ ”دن“ لاہور، ۱۸ جولائی ۲۰۰۰ء)

حصہ سوم : کالم

ظفر اقبال	دیوان غالب۔ نسخہ خوبہ یا نسخہ لاہور
اشرف بخاری	دیوان غالب، نسخہ خوبہ۔ اصل حقائق
ڈاکٹر شرف احمد	دیوان غالب، نسخہ خوبہ کا تنازع
ڈاکٹر اجمل نیازی	مرزا غالب مفلوب اور جنرل ارشد محمود
ڈاکٹر اجمل نیازی	وی سی صاحب کو اختتام
ڈاکٹر اجمل نیازی	جھوٹی ایف آئی آر اور چور پرویڈر
ڈاکٹر اجمل نیازی	چانسلر صاحب! وائس چانسلر صاحب کی مدد کریں
ڈاکٹر اجمل نیازی	چانسلر کے گھر وائس چانسلر کا ”تحقیقی سچ“
ڈاکٹر عارف نقیب	ادریک کا بیو پار کرنے والے بوز نے
حفیظ الرحمن خاں	عالم ارواح سے مرزا اسد اللہ خاں غالب کا خط
اشفاق احمد ورک	چوری اور سینہ زوری

دیوان غالب — نسخہ خواجہ یا نسخہ لاہور؟

ظفر اقبال

میز القدر اختر شہر نے اپنے چند روزہ ”جنگ آء“ کے تازہ شمارے میں ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ کی مقبولیت“ کے عنوان سے جو خبر چھائی ہے، اس میں لکھا ہے کہ ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ“ کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر سید مصین الرحمن نے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ“ کو ایک ثایاب نسخے کے طور پر شائع کیا، اور بعد ازاں انھیں اس پر داد و تحسین سے نوازا گیا اور یہ تاثرات و مضامین کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر حسین فراقی نے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ اصل حقائق“ کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں انھوں نے ڈاکٹر سید مصین الرحمن کو غلط ثابت کرتے ہوئے کہا کہ ”نسخہ خواجہ“ غالب کا کوئی نیا نسخہ نہیں ہے بلکہ یہ ”نسخہ لاہور“ ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر مصین الرحمن پر دیگر کئی الزامات لگائے اور ان کی تفسیلات درج کیں جس کے جواب میں ڈاکٹر مصین الرحمن نے اپنے کتابچے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ۔ صحیح صورت حال“ میں ڈاکٹر حسین فراقی کے تمام الزامات کو رد کر دیا، اور تفصیل سے اپنی صفائی فرام کی۔ یہ سلسلہ حال قلم نہیں ہوا۔ ڈاکٹر حسین فراقی، ڈاکٹر مصین الرحمن کے جواب میں بحر جواب لکھ رہے ہیں جو ان کے کتابچہ میں شائع ہو رہا ہے۔ دیکھیے! وہ کیا موقف اختیار کرتے ہیں۔ ادنیٰ حلقوں میں نسخہ خواجہ بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ کئی طبقے اس قصہ پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں، تاہم اس سے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ“ کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، اور، لوگ ”نسخہ خواجہ“ خرید کر دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔

۱۔ یہ لکھا درست نہیں کہ ڈاکٹر مصین الرحمن نے ڈاکٹر حسین فراقی کے تمام الزامات کو رد کر دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب پڑا میں شامل ڈاکٹر حریف جالب کا کتابچہ جس میں بخالی سوائے کے دار ہے واضح کر دیا گیا ہے کہ جین صاحب، حسین صاحب کے کسی اعتراض کا بھی عقلی حل جواب نہیں دے سکتے۔ (دریغ قی)

اس شمارے کے اسی سلسلے پر ممتاز خاں، اور ماہر تعلیم ڈاکٹر خولید محمد زکریا نے ایک بیان میں کہا ہے کہ نسط خولید کے حوالے سے فساد برپا نہ کیا جائے۔ جوابی تحریروں کا سلسلہ بند ہونا چاہیے۔ ورنہ ”برہان قاطع“ والی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر حسین قزاقی صاحب کے قلم سے مجھے میں بعض صحیح نقطے لکھ سکے تھے۔ معین الرحمن صاحب کے جواب میں بھی صحیح نقطے موجود ہیں۔ نسط خولید کی اصل کہانی کیا ہے؟ اس پر غیر جذباتی انداز میں اظہار رائے کیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ اس شخص کو معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا، تاہم میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ نسط اتنا اہم نہیں ہے کہ اس پر فساد برپا کیا جائے۔ معین صاحب اسے اپنے ذخیرۂ غائبیات کا سب سے قیمتی موتی قرار دیں تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ محقق کو اتنا تو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے مال کی قدر و قیمت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرے لیکن ”نسط خولید“ سے غالب فحی میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ اگر بالفرض دس بارہ مقامات پر غالب نے اس پر قلم لگا ہی دیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس سے کوئی حقیقی حق تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ میری معین صاحب اور حسین صاحب دونوں سے گزارش ہے کہ وہ اب جوابی تحریروں کا سلسلہ ترک کر دیں کہ کہیں ”برہان قاطع“ والی صورت حال نہ پیدا ہو جائے۔ ظاہر ہے، اس سے کسی کو کچھ حاصل نہ ہو گا۔ البتہ ادیب، اور وابستگانِ ادب بدنام ہوتے ہیں جن کے بارے میں تصور پہلے ہی زیادہ خوش گوار نہیں ہے۔

ماشاء اللہ! یہ چوتھے خولید ہیں جو اس سلسلے سے متعلق ہوئے ہیں۔ ایک تو خولید منظور حسین مرحوم، جن کے نام نای سے یہ نسخہ موسوم ہوا، دوسرے خولید معین الرحمن، تیسرے ہمارے محبوب طنز اور محقق مشفق خولید، اور اب چوتھے ڈاکٹر خولید محمد زکریا۔ مؤرخانِ کرام موقف خاصا مصالحتیہ، تین اور مشتقات ہے۔ اس سے پہلے، جیسا کہ انھوں نے ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ بھی اس موضوع پر کافی کردہ انسانی جان بچی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں، کہ ڈاکٹر اہمل نیازی نے ڈاکٹر معین الرحمن کے بارے میں کہا، مشفق خولید نے لطیف الزماں کے متعلق کیا خیرہ پست کیا، اور لطیف الزماں نے مشفق خولید اور ڈاکٹر وحید قریشی کے بارے میں کیا ارشاد فرمایا کہ یہ سب کچھ ناصر زیدی نے اپنے کالم

”ہاد شمال“ میں تحصیل کے ساتھ درج کر دیا ہے (بحوالہ روزنامہ ”پاکستان“ مورخہ ۱۵ جولائی سنہ دو ہزار) (۲) اس لیے بات جب تک کسی منطقی نتیجے تک نہ پہنچے، جسے دونوں فریق پہنچانے کی سرگزشت کو پیش کر رہے ہیں، اس وقت تک ”سینر فائر“ کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ اس کا صاف مطلب ہو گا کہ ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنی بارمان لی ہے، اور ان کا موقف اور حقیقت دونوں غلط تھے۔

ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی ایک بات بطور خاص قابل غور ہے، یعنی انھوں نے جو کہا ہے کہ میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا کہ اس شخص کو معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا۔۔۔ اور جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ خواجہ زکریا صاحب کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ معین صاحب نے یہ نسخہ کہاں سے حاصل کیا، لیکن وہ کسی وجہ سے، یا کسی مصلحت کی بنا پر اس کا اکتہار کر نہیں رہے، ورنہ وہ صاف کہہ سکتے تھے کہ انھیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ یہ نسخہ معین صاحب نے کہاں سے حاصل کیا ہے۔ علاوہ ازیں، اس مصلحت یا پردہ پوشی کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس بارے خواجہ زکریا صاحب کا علم معین صاحب کے خلاف جاتا ہے، ورنہ وہ اس کا برملا اکتہار کر دیتے کیونکہ یہی تو اصل بنائے فساد ہے کہ معین صاحب نے یہ نسخہ حاصل کہاں سے کیا ہے۔ معین صاحب کہتے ہیں کہ انھیں یہ ایک فٹ پاتھیے کھانڈی سے حاصل ہوا ہے جبکہ ڈاکٹر حسین فراقی کا موقف ہے کہ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت ہے جو وہاں سے چرایا گیا، یا خلاف ضابطہ کسی صاحب (ان کا نام بھی فراقی صاحب نے بتایا ہے) نے اپنے نام سے جاری کروایا اور پھر لائبریری کو واپس نہیں کیا، جہاں سے یہ معین صاحب کے ہاتھ لگ گیا، جبکہ معین صاحب نے اس کھانڈیے کا نام پتا ابھی تک انھما میں رکھا ہوا ہے جو کہ معین صاحب کا سب سے معتبر گواہ صفائی ہو سکتا تھا، لیکن معین صاحب نے ابھی تک اسے اپنی حمایت میں پیش نہیں کیا۔

خواجہ زکریا صاحب نے یہ کہہ کر اگرچہ اس شخص کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی

۱۔ لطیف اربان خاں کے حوالے سے جس خط کو ناصر لیدی نے اپنے کالم میں حوالہ دیا، وہ کلام خط تھا جسے ایک ساداش کے تحت خاں صاحب کے خلاف استعمال کیا گیا۔ خاں صاحب نے ناصر لیدی صاحب کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے پر مقدمہ دائر کر دکھا ہے۔ (مرحب)

ہے کہ اس پر غالب نے اگر دس بارہ بار قلم لگا بھی لیا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس کے باوجود اس نسخے کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ خاص طور پر اس تناظر میں کہ اس کے مال مسروق ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اس (نسخہ خوبہ) کی تحقیر میں ایک مضمون لکھ کر کہیں شائع کرایا تو پروفیسر لطیف الزماں نے انھیں فون کر کے پوچھا کہ کیا انھیں علم نہیں تھا کہ یہ نسخہ مال مسروق ہے اور یہ کہ معین صاحب کا دعویٰ اس بارے میں سراسر غلط ہے، تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم تھا؟ اس پر پروفیسر لطیف الزماں نے ان سے پوچھا پھر اس کے باوجود آپ نے اس پر تحریری مضمون کیوں لکھا؟ جس پر سیدہ طور پر ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے یہ کہا، وہ آکر بیٹھ ہی گیا تھا، تو میں کیا کرتا؟ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر تحسین فراقی نے اپنے موقف کی تائید میں جو سب سے ورنی دلیل دی ہے، وہ یہ ہے کہ لاہیریوں کے ضابطے کے مطابق لاہیری کی ہر کتاب کا ایک خفیہ صفحہ بھی ہوتا ہے جو کہ ایک مخصوص صفحہ اور مہر شدہ ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہیری کی کا بھی ایک مخصوص صفحہ ہے جو کہ لاہیری کی ہر کتاب کے لیے مشروط اور مخصوص ہے۔ چنانچہ احتیاطی طور پر اس خاص صفحے، جس کا نمبر ۳۴ ہے، سے وہ مہر کھرج لی گئی ہے تاکہ یہ لاہیری کی کتاب ثابت نہ ہو سکے۔ اس بات کا معین صاحب نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا، اور اس حساب سے سارا غلطہ اس وقت تک اٹھی کے خلاف جاتا ہے جب تک کہ مذکورہ کہانیاں اس کی فروخت کی تصدیق نہ کرے، حالانکہ ایسے قایم نسخے کا کسی کہاڑے تک پہنچنا بھائے خود ایک بہت بڑا سوال ہے جس کا جواب بھی طور معین صاحب ہی پر واجب ہے۔

چنانچہ اس مسئلے کا کئی کتنا نکالنے کا سہل ترین طریقہ یہ ہے کہ اس نسخے کی پنجاب یونیورسٹی لاہیری سے چوری ہو جانے کا پتہ درج کرا دیا جائے اور الزام بے شک کسی پر نہ لگایا جائے، البتہ اس شبہ کا اٹھار ضرور کر دیا جائے کہ یہ نسخہ وہی ہو سکتا ہے جو ڈاکٹر معین الزماں کے پاس موجود ہے۔ اگر لاہیری مذکورہ کا کوئی اسر مصلحتاً یہ پتہ درج کرانے میں متامل بھی ہو تو فوجداری پر چہ کسی کی بھی طرف سے درج ہو سکتا ہے، جسے اس وقت کے کاغذوں سا بھی علم ہو۔ اس طرح دوران تحقیق دونوں فریقوں کو اپنا اپنا موقف

ثابت کرانے کا وافر موقع حاصل ہو سکتا ہے اور ایک اہم مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو سکے گا۔ ویسے عزیزی تا سر زیدی کی یہ بات یقیناً قابل غور ہے کہ ”اگر ذرا سی دیر کو فرض کر لیا جائے کہ ان کا دریافت کردہ ”نسختہ خولہ“ وہی مملوط ہے جو کبھی پنجاب یونیورسٹی میں محفوظ تھا، اور وہاں سے غائب ہو گیا، پھر بھی ڈاکٹر معین الرحمن نے اسے انتہائی خوبصورت انداز میں لاکھوں روپے صرف کر کے اپنے حقیقی حواشی کے ساتھ چھاپ کر غالب دوستوں پر احسان کیا ہے۔“ اگر ڈاکٹر معین الرحمن خود بھی اپنے طرفدار کے اس موقف کی طرف آجائیں تو یہ جھگڑا پھر بھی ختم ہو سکتا ہے۔

(ظفر اقبال ”مآثر“۔ ملت روزہ ”زندگی“، لاہور۔ ۲۷ اگست ۲۰۰۰ء۔ ص ۵۵-۵۶)

دیوان غالب نسخہ خواجہ، اصل حقائق

اشرف بخاری

ڈاکٹر حسین طراقی نے محقق اور نقاد کی حیثیت سے ایک بہت ہی مختصر مدت میں شہرت کی منزلیں بہت سرعت سے طے کی ہیں۔ انھیں اللہ نے علمی اور تحقیقی مزاج عطا کر رکھا ہے۔ اپنے عام معاصر اساتذہ کی طرح یک طے، یک رے نہیں بلکہ ان کے علم و ذوق کی دلچسپیوں کا سلسلہ کافی پھیلا ہوا ہے۔ اس وسعت علمی نے ان کی تحقیق و تنقید کو گہرائی اور اسلوب کی طرح واری بھی بخشی ہے اور توازن، سنجیدگی اور نکلتے آفرینی جیسی صفات بھی۔ ان کے جتنے بھی علمی کام اب تک منظر عام پر آئے ہیں، ان کے اسی رے ہوئے ذائق کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اب کے انھوں نے علمی دنیا کو تحقیق و تہذیب کا ایک اور نئے ستارے کی صورت میں پیش کیا ہے جسے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ، اصل حقائق“ کا نام دیا گیا ہے۔ ان کی زیر نظر تالیف ہوں تو تحقیق کے کڑے سے کڑے معیار پر جاری اترتی ہے اور ہم سب کی داد کی مستحق ہے لیکن ایک خاصا ہنگامہ آرا ہیں منظر بھی دیکھتی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ہوایوں کہ ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کو دیوان غالب کا ایک علمی نسخہ، جہل ان کے، ۱۹۸۱ء میں پرانی کتابوں کے کسی کاروباری سے ہاتھ لگا جس کی ترغیب و تہذیب پر انھوں نے عمر عزیز کے سترہ سال صرف کر دیے اور روز و شب کی ”بکر کاوی، دیدہ ویزی اور صحت شائق“ کے بعد اسے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ“ کے نام سے ۱۹۹۸ء کے اواخر میں لاہور سے شائع کر دیا۔ ”نسخہ خواجہ“ اسے اس لیے کہا گیا کہ اسے گورنمنٹ کالج لاہور کے ادبیات انگریزی کے استاد اور مشہور علمی شخصیت مرحوم خواجہ منظور حسین کے نام معنون کیا گیا ہے۔ (ہمارے مرحوم دوست مظفر علی سید گورنمنٹ کالج لاہور میں خواجہ صاحب کے چہیتے شاکر رہے تھے۔ ہم نے انھیں ہمیشہ اپنے اس باکمال استاد کی تعریف میں مدب اللسان پایا) اس نسخے کا چھپنا تھا کہ لاہور کی علمی فضاؤں میں ایک زور کا دھماکہ ہوا۔ پہلے پیکل تو اہل علم ڈاکٹر معین الرحمن کے اس دعوے کی صحت کے بارے میں قدرے تذبذب میں

رہے اور ملک و شیعہ کی مدد مدد آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن آہستہ آہستہ وہ منزل آگئی کہ ٹھٹھک و شبہات کی یہ لے جیتر ہوئی چلی گئی۔ آج تک دہشتناک فن کی اکثریت نے فتویٰ دے ڈالا کہ ”نصرت خلیفہ“ ڈاکٹر مصیبن الرحمن کی دریافت قطعاً نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی کا کم شدہ یا چرایا ہوا مال ہے جس کا تعارف پہلے مکمل ڈاکٹر سید عبداللہ نے ”ماہ نو“ کراچی کے جولائی ۱۹۵۴ء کے شمارے میں کرایا اور پھر مولانا امتیاز علی خان مرثی نے اپنے ”دیوان غالب، نصرت مرثی“ میں اسے ”نصرت لاہور“ کے نام سے یاد کیا اور لوگوں کی طرح ڈاکٹر حسین فراقی کو بھی مصیبن الرحمن صاحب کا دھمکی پائل نظر آیا۔ انھوں نے خان لی کہ اس نوع کی ادنیٰ سرقہ بازی کا پل کھولنا ضروری ہے۔ فی الواقع علمی سرتے کی اس قدر تسلیم کھلا واردات شدید بددیانتی ہی نہیں، علم اور اہل علم کی توہین اور نیکی بھی ہے۔ اگر اس قماش کی کارستانوں پر گرفت نہ کی جائے تو دنیائے علم و ادب، فکری افلاس اور انارکی کا شکار ہونے لگے۔ ہم چاہتے ہیں قارئین پہلے نصرت خلیفہ کے بارے میں حسین فراقی صاحب کے تحقیدی کلمات پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ معاملہ کی نوعیت کیا ہے۔

”۱۹۹۸ء کے اواخر میں ڈاکٹر سید مصیبن الرحمن نے دیوان غالب کا ایک قلمی نصرت مرحب و مدون کر کے اسے ”دیوان غالب، نصرت خلیفہ“ کے عنوان سے شائع کیا۔ اس نسخے کو انھوں نے اپنے ذخیرہ غالبیات کی پیش قیمت متاع قرار دیا ہے۔ یہ قلمی نصرت مع ایک اور قلمی نسخے اور چند مطبوعہ نادر کتابوں کے، انھیں پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے ملا۔ بڑے مثالی اہتمام اور کاوش کے ساتھ تیار ہونے والا یہ قلمی نصرت، جنرل سید مصیبن الرحمن، غالب ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خان یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گوہر گم گشت ہو۔ دلچسپ بات ہے کہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے قلمی نسخے کا تعارف کراتے ہوئے چرائیس برس پہلے ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی اسے ضیاء الدین احمد خان یا کسی شہزادے کے لئے ہونے فرمانے کا درجہ بہا قرار دیا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ مصیبن الرحمن صاحب کا پیش کردہ یہ گوہر گم گشت اور سید عبداللہ کا نشان کردہ یہ درجہ بہا کوئی الگ الگ دو سو قی نہیں بلکہ ۱۸۵۲ء کے نصف اول کے کام غالب کا حامل دی ”درعظیم“ ہے جسے آخری حادثہ دہلی کی راج دہانی کے بجائے لاہور کے صوبائی دارالحکومت میں پیش آیا اور یوں یہ لٹ چٹ کر

موجودہ تدوین کار تک پہنچا۔ اس ضمن میں شواہد کی تفصیل ذرا آگے چل کر پیش کی جاتی ہے۔

ہم مقدمت خواہ ہیں کہ اقتباس قدرے طویل ہو گیا لیکن اس کے بغیر معاملہ سمجھ میں نہ آتا۔ چنانچہ اب ڈاکٹر صاحب کے قلم سے جو ان شواہد کی تفصیل نکلی ہے تو کتاب کے چارے ساتھ صفات پر تکلیفی چلی گئی۔ معین الرحمن کی تردید میں انھوں نے عقلی و نقلی دلائل کا اجماع لگا دیا۔ کوئی دھوکا ایسا نہیں کیا جس کا ثبوت پیش نہ کیا ہو۔ ان کے دلائل فی الواقع براہین قاطع کا حکم رکھتے ہیں جنہیں کوئی منصف حراج نقص مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بات صرف یہیں تک محدود نہیں کہ حسین فراقی صاحب نے معین صاحب کے دعوائے باطل کے تار و پود تکسیر کر دکھ دیے ہیں بلکہ اس "ابطال باطل" کے ساتھ ساتھ ان کے علم و فضل کا بھرا ہوا بھی سچ چرچا ہے میں پھونڈ دیا ہے، جس کی تفصیل کتاب ہی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس سارے قصے میں ہمیں حسین فراقی صاحب سے ایک ٹکڑا پیدا ہوا جس کا تعلق کتاب کے صفحہ ۲۱ پر مندرج عبارت سے ہے۔ پچارے معین الرحمن صاحب سے کہہ سرتوں کا ارتکاب ہو گیا۔ فراقی صاحب نے اس خیال پر ردایوں بھایا: "آخر جو شخص رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر اسے چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "ہدیہ اردو نزل" ۱۹۸۷ء کا ایک ناکل)، جو شخص پر قصوری چند کی "جاکیر غالب" اپنے نام سے شائع کر سکتا ہو (دیکھیے "سورج" کا غالب نمبر ۱۹۹۶ء)، جو شخص اپنی اہم اے اردو کی شاگرد بشری ہاسٹ کے مقالے "امرا حفصہ کی شخصیت اور شاعری" (۱۹۹۱ء) کا بیشتر حصہ اپنے نام سے "نقوش" میں چھپوا سکتا ہو (دیکھیے "نقوش" شمارہ ۱۳۹، ستمبر ۱۹۹۳ء) اور اسی قبیل کے دیگر کئی افسوسناک کام کر سکتا ہو۔ اس سے بعید نہیں کہ زندگی کے کسی کزور لمحے میں اس سے یہ فرامیں بھی سرزد ہو گئی ہوں۔ بس خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم ولا معاملہ ہے، معاملہ نہیں الیہ ہے۔"

عامی گزارش یہ ہے کہ پچارے ڈاکٹر معین الرحمن صاحب سے پہلے جب نیاز فتح پوری، مولانا اسلم جبرا، تنویری، کرشن چندر، غلام جیلانی برق، پروفسر وقار عظیم، غلام احمد پرویز وغیرہم جیسے اکابر بھی دن و رات سے سرق بازی میں ملوث رہ چکے ہوں تو ایسے ایسے اساتذین کے مقابلے میں اس "کیاہ ضعیف" کو تو بخش ہی دینا چاہیے تاکہ وہ پلٹ کر یہ تو نہ کہہ سکے کہ "ابن گناہست کہ در شہر شایع کشف"

حسین فراتی صاحب نے اپنی اس تحقیقی کاوش میں کتاب کی جن غلطیوں اور مرتب کی جن کوتاہیوں کا جائزہ لیا ہے، ناشر نے ان کا خلاصہ کتاب کے بیک ناٹل پر چھاپ دیا ہے، ان میں سے کچھ نکات مذکور ہیں:

☆ ”دیوان غالب کا نسخہ خوب دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری ہی کا گم شدہ، مسروق نسخہ ہے۔“

☆ ”نسخہ خوب کے مرتب ڈاکٹر معین الرحمن قریشی اور دوسروں کے علمی کام اپنے عام سے چھپوانے میں غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔“

☆ ”ڈاکٹر صاحب سے پیچیدگیوں کو دیوان غالب کے اس نسخہ میں انھوں نے چند معمولی ترمیمیں کر کے اسے الگ نسخہ ثابت کرنا چاہا۔“

☆ ”دیوان کے اس نسخہ میں تدوین اور ترتیب کی غلطیاں ایک سو سے زائد ہیں۔“

تحقیق نثر بالعموم سادگی کی حدود چھوٹی نظر آتی ہے لیکن مسرت ہوئی کہ حسین فراتی صاحب نے گفتگو نثر لکھی ہے اور اس میں ”ان اساتذہ کی نگاہ بندی کے باوجود کہیں کہیں ”دردِ حیا“ کی سیل آنکھ اپنے بے سیل وجود کے ساتھ قاری کی پریشانی خاطر کا موجب بھی بنتی ہے۔“ جیسے صریح اور سچے سچے جملے بھی ملتے ہیں اور بڑی بات تو یہ ہے کہ بحث و جدل اور الزامات و طعنیات کے دُور کے باوصف کتاب پایہ ثقافت سے نہیں گرنے پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفتہ غالب یہاں بھی ڈاکٹر حسین فراتی کے پیش نظر رہا:

بیانہ برآں ردِ حرام است کہ غالب
در بے خودی اندازہ گفتار عام

(اشرف بخاری، ”لہو و لک“، روزنامہ ”مشرق“، پشاور، ۱۸ فروری ۲۰۰۰ء)

دیوان غالب -- نسخہ خولجہ کا تنازع

ڈاکٹر مشرف احمد

دیوان غالب کا ایک نامور قلمی نسخہ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمن نے برسوں پہلے لاہور کے فٹ پاتھ سے پرانی کتابیں فروخت کرنے والے سے خریدا تھا۔ بقول خود انہوں نے زندگی اور صحت کو آنی جانی چیز سمجھتے ہوئے پندرہ برسوں تک شب و روز اس دیوان کی تدوین میں صرف کیے اور ایک جانب اصل کا عکس اور دوسری جانب جدیدہ الاما میں متن دے کر نہایت خوب صورت انداز میں اسے شائع کیا۔ اس نسخے کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ انگریزی کے استاد پروفیسر خولجہ منظور حسین سے منسوب کرتے ہوئے اسے "نسخہ خولجہ" کا نام دیا۔

ایک سو بائیس برس پرانے اس نسخے کی دریافت اور اس کی اشاعت، جو مرزا غالب کی نظر سے گزر چکا تھا اور جس پر کہیں کہیں ان کے ہاتھ کی تصحیح ہے، ایسا عظیم الشان کارنامہ تھا جس پر ڈاکٹر معین الرحمن کو داد و شاباش ملی اور برصغیر کے ممتاز محققوں، ادب دوستوں اور غالب شناسوں نے اس کا خیر مقدم کیا، لیکن اس کی اشاعت کے کچھ مدت بعد اس قلمی نسخے کے بارے میں اور مختل کالج لاہور کے شعبہ اردو کے استاد پروفیسر ڈاکٹر حسین فراقی نے جو اعتراضات کیے اور اپنے کتابچے میں تحقیر کا قائل قرار دیا تھا کئی پر سے پردہ اٹھایا، وہ ان دنوں غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں میں مہسوخ بحث بنا ہوا ہے۔

ڈاکٹر حسین فراقی اسے اپنے ممتاز معاصر کی دریافت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ان کے بقول یہ وہی نسخہ ہے جو کبھی پنجاب یونیورسٹی کی ملکیت تھا اور اب کم ہو چکا ہے۔ اس قلمی نسخے کے بارے میں ایک مضمون ڈاکٹر سید عہد اللہ نے لکھا تھا جو جولائی ۱۹۵۴ء کے ماہنامہ "ماہ نو" میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں ڈاکٹر عہد اللہ نے دو صفحات

کا نکس بھی شائع کیا تھا۔ بعد ازاں اسے مشہور غالب شماس مولانا امتیاز علی مرثی نے مرتب کیا۔ معروف محقق کاظمی عبدالودود ۱۹۵۷ء میں جب پاکستان تشریف لائے تھے تو اس فلمی دیوان غالب کا ایک ریڈیو گراف لے گئے تھے، جو اب رضا لاہوری ری رام پور میں موجود ہے۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے "نسخہ خوبہ" اور "دیوان غالب" کے اس نسخے کے دوسرے نکس پیش کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ڈاکٹر مصیمین الرحمن اور باقی دوسرے حضرات کے نسخے ایک ہی ہیں اور ان میں سرمو فرق نہیں ہے۔

اس کالم میں ان تمام علمی و ادبی مباحث کو اٹھانے کا موقع مل نہیں ہے۔ اپنے دعوے کی تائید میں ڈاکٹر فراقی نے مشہور مخطوط شماس خلیل الرحمن داؤدی کی رائے پیش کی ہے جو "نسخہ خوبہ" کو پنجاب یونیورسٹی کا گم شدہ مخطوط بتاتے ہیں۔ ان تمام اعتراضات کے جوابات محترم ڈاکٹر مصیمین الرحمن نے اپنے کتابچے "دیوان غالب۔ صحیح صورت حال" میں دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے اس کارنامے کو اپنی زندگی کے علمی و ادبی کاموں کا حاصل سمجھتے ہیں اور اس پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ خدا کرے وہ اپنے اس کارنامے پر حشر کے دن مرزا غالب کے سامنے بھی سرخرو ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دفاع میں لکھے ہوئے کتابچے میں برصغیر کے ممتاز اسکالروں، محققوں اور غالب شناسوں کے خطوط کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ وہ ان حضرات کے خطوط مکمل صورت میں شائع کرتے۔ مثلاً انھوں نے ممتاز محقق رشید حسن خان کے خط کا اقتباس شائع کیا ہے لیکن ڈاکٹر حسین فراقی نے رشید حسن خان کا یہ فقرہ اپنے کتابچے میں پیش کیا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ "ملکیت بدل جانے سے نسخہ نہیں بدل جاتا۔"

ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنے کتابچے میں اس دیوان کو خوبہ منظور مصیمین سے منسوب کرنے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے خوبہ صاحب کی روح کو تکلیف ہوئی ہوگی۔ اس کا جذباتی جواب ڈاکٹر مصیمین الرحمن نے یہ دیا ہے کہ کاش معترض ایسا تکلیف دہ جواب اپنی اولاد سے سنیں۔ اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ کیا کہا جاسکتا ہے۔ یہ تو مراد بدست زندہ دلا معاملہ ہے۔

ڈاکٹر حسین فراقی کا ایک علمی اعتراض یہ ہے کہ جو شخص شعر موزوں نہ پڑھ سکتا ہو، اسے کسی دیوان کو مرتب کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر مصیمین الرحمن

نہ شعر موزوں پڑھ سکتے ہیں نہ درست انداز میں اسے نقل کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کے خلت گیر معترض بے جا اعتراض کر رہے ہیں۔ بہت سے شعرا اپنا کہا ہوا شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے جب کہ ڈاکٹر صاحب تو صرف نثر نگار ہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں ڈاکٹر مصین الرحمن نے اپنے ادبی حیر و مرشد اور اردو ادب کے عہد طراز رشید احمد صدیقی کا ایک اقتباس نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ رشید صاحب بھی شعر موزوں نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی معیار نہیں ہے۔ رشید صاحب کے حزابہ مضامین یا علمی، ہر جگہ آپ کو موزوں اشعار ملیں گے۔ رشید صاحب کے خطوط شاگردوں کو ہم جانتے ہیں، کسی نے آج تک ان میں یہ محسوس نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے رشید صاحب نے یہ بات بطور تعجب کے کہی ہو، جسے ناموزوں طبع افراد نے گمراہی میں باندھ لیا ہو۔ کراچی میں علی گڑھ کے ایک ان پڑھ شاعر استاد عمر فاروقی رہا کرتے تھے۔ انھوں نے مشہور داستان ”کلیڈ دومن“ کا نام سنا اور ایک دن رشید صاحب سے جا کر پوچھا کہ ”کلیڈ دومن“ کا کیا ہوتا ہے؟ رشید صاحب نے کہا کہ حاضرین محفل آجائیں تو اس کے معنی بتاؤں گا۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر اس داستان کو ”کلیڈ دومن“ کا ہی کہا کرتے تھے۔ اب اگر ان کا کوئی شاگرد یہ کہے کہ اس کا درست نام وہی ہے جو رشید صاحب بتایا کرتے تھے تو اس سے شاگرد کی عقیدت مندی تو ظاہر ہو گی مگر نام غلط ہی رہے گا۔ غولہ منکور حسین نے کلاسیکی روی افسانوں کے اردو میں تراجم کیے تھے۔ اس کے غلط نقطہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ یہ تراجم انھوں نے اردو زبان میں اپنی مشق اور استعداد بڑھانے کی غرض سے کیے ہیں۔ کیا آج کوئی کچھ فہم شخص ان کے انکسار کو یہ معنی پہتا سکتا ہے کہ انھیں اردو نہیں آتی تھی؟

ڈاکٹر مصین الرحمن نے چالفتوں اور معترضوں کو معاف کرنے اور اعلیٰ ظرفی اختیار کرنے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے اقتباسات نقل کیے ہیں مگر خود ان کا یہ حال ہے کہ ایک خاص علمی بحث میں وہ آپ سے باہر ہو گئے ہیں اور اپنے معترض کا پورا نام لینا بھی انھیں ناگوار ہے اور اگر یہ امر مجبوری نام لکھتے بھی ہیں تو اس کے ساتھ ہر جگہ ت۔ ف بھی لکھتے ہیں۔

”نثر غولہ“ کے مرتب کی ایک تصویر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ساتھ بھیجی ہوئی

ہے۔ ان کے معترض کا کہنا ہے کہ رشید صاحب بھی پاکستان نہیں آئے اور ڈاکٹر صاحب بھی ہندوستان نہیں گئے، بلکہ یہ تصویر کس طرح کھینچی۔ ان کا جواب ڈاکٹر صاحب نے یہ دیا ہے کہ رشید صاحب سے بغیر معمولی عقیدت و محبت کو دیکھتے ہوئے ان کے ایک عزیز نے وہوں کی تصویریں ساتھ رکھ کر ایک نئی تصویر بنا دی۔ رشید صاحب اپنے خطوط کے بارے میں ہمیشہ بڑے فکر مند رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ بہترین خطوط وہ ہیں جنہیں ضائع کر دیا جائے۔ اگر انہیں اپنی تصویر کے حوالے سے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو شاید وہ بھی اپنی کوئی تصویر نہ کھینچاتے۔

نصرت خدیجہ کی عبادتوں اور فارسی سے کیے جانے والے اردو ترجمے کے حوالے سے ڈاکٹر حسین فراقی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مرتب کو فارسی نہیں آتی۔ اس کا جواب ڈاکٹر مصین الرحمن نے یہ دیا ہے کہ ”ہماری یونیورسٹی میں ایم۔ اے۔ اردو میں فارسی کا ایک پڑچھا۔“ انہوں نے اس سلسلے میں کراچی یونیورسٹی کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں فارسی زبان کے پڑچھے میں حافظہ و سعدی کی دس دس غزلیں اور گلستان سعدی کی کچھ حکایتیں شامل تھیں جنہیں طالب علم اردو زبان کے ذریعے پڑھتا تھا، اور فارسی کے بنیادی قواعد بھی اس پڑچھے میں پڑھائے جاتے تھے لیکن اس سے طالب علم میں فارسی زبان کا ذوق پیدا نہیں ہوتا تھا اور بغیر فارسی جاننے والی اکثر طلبہ اس پڑچھے میں اچھے نمبر لے آتے تھے۔ اس کو اکثر طلبہ بھرتی کا پڑچھا کرتے تھے۔

”دیوان غالب، نصرت خدیجہ“ کو پنجاب یونیورسٹی کا کم شدہ نسخہ ثابت کرنے کے لیے ایک دلیل ڈاکٹر حسین فراقی نے یہ دی ہے کہ دنیا کا ہر اہم کتب خانہ اپنی کتابوں پر ایک مخصوص کوڈ نمبر ڈالتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی اپنی کتابوں اور قلمی نسخوں کے صفحہ ۲۲ پر کوڈ نمبر تحریر کرتی ہے ”نصرت خدیجہ“ کے اس صفحے پر کھرچنے کا نشان عکس میں واضح ہے جب کہ اس کی پشت کا صفحہ عکس میں محفوظ ہے۔

اس ادبی تنازعے سے پہلے ڈاکٹر مصین الرحمن کے مخالفوں نے، جو شاید ان کی تاک میں بیٹھے رہتے ہیں، یہ اعتراض کیا تھا کہ انہوں نے ایم۔ اے۔ اردو کی اپنی ایک طالبہ کے مقالے کو، جو اس نے ادا جعفری پر لکھا تھا اپنے نام سے ”نقوش“ میں چھپوا لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے زیر تذکرہ کتابچے میں اس صورت حال پر سے پردہ اٹھایا ہے۔

انسانی ہمدردی اور طالبہ کی والدہ کے موت و زیست کی کش مکش کی وجہ سے ان کے بقول انہوں نے ادا جعفری پر اپنے غیر مطلوبہ مقالے سے استغاثہ کی طالبہ کو اجازت دے دی تھی۔ اخلاقی اور قانونی نقطہ نظر سے یہ بات کتنی ہی قابل اعتراض ہو لیکن اس انسانی ہمدردی پر وہ لائق تعظیم ہیں۔ خیرات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دوسرے ہاتھ کو اس کی خیر نہ ہو۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کی یہ خیرات دے دی تھی تو اس کے اعہار اور اسے واپس اپنی جیب میں ڈالنے کا کیا جواز ہے؟ اس طرح تو انہوں نے اپنی طالبہ کے یہ حیثیت مصنفہ مستقل کو تاریک اور مشکوک بنا دیا ہے۔

(ڈاکٹر شرف احمد۔ ”ماہنامہ“ ”روزنامہ“ ”ایکپریس“ کراچی۔ ۸ جون ۲۰۰۰ء)

☆

۱۔ مولانا مرثی نے اس خط کو مرحب نہیں کیا بلکہ اس کا تعارف اپنے مدونہ ”دیوان غالب، نون مرثی“ میں ’نمونہ ۱۱۰۰‘ کے نام سے کرایا ہے۔ (ج، ب)

مرزا غالب مغلوب اور جنرل ارشد محمود

ڈاکٹر اجمل نیازی

بہارِ یوسفی لاہوری سے مرزا غالب کے حوالے سے ایک خطوط چوری ہو گیا۔ اس وقت کے وائس چانسلر نے کچھ نہ کیا۔ اب وہی خطوط تحقیق کو نکالی کا دہہ دینے والے ایک حد دہہ پانچ پروفیسر ڈاکٹر معین الرحمن نے ایک اور نام سے اپنی ریسرچ کا سرکہ بنا کے شائع کرا دیا ہے۔ ”نکس لاہور“ اب ”نکس خوبہ“ ہے۔ اس حوالے سے خوبہ زکریا بہت خوش ہیں اور معین الرحمن کا معاون بن کر بی رہے ہیں۔ اس پر بہادر اور سچے محقق استاد ڈاکٹر حسین فراقی نے ایک تحقیقی کتابچہ لکھا ہے جو اہل علم کے لیے ایک نصیب سے کم نہیں۔ مکان سے محترم لطیف الزمان خان نے داد دیا کیا۔ وہ اس سے پہلے بھی غالب کے حوالے سے اس طرح کی چوریوں کے عادی بھروسوں کا چچا کرتے رہتے ہیں۔ شاعری کی چوری کا تو سنا تھا۔ اب تو پورا شاعر چرایا گیا ہے۔ اتنا ناجائز قاعدہ جعلی ماہرین اقبال نے نہ اٹھایا ہو گا جو اس نعلی ماہر غالب نے اٹھایا ہے۔

خان صاحب کے پاس غالبیات کی تحقیقات اور ادبیات پر جتنی سب سے بڑی لاہوری ہے۔ وہ مرزا غالب کے بڑے عاشق ہیں اور اس میدان کے رقیبوں کے دشمن ہیں۔ وہ ڈاکٹر معین الرحمن کو غالب کا سب سے بڑا دوست نما دشمن قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر خالد آفتاب ساری صورت حال سے آگاہ ہیں۔ ان کے ذمے اس عظیم ادارے کی روایات اور مقام کی حفاظت ہے۔ انہیں خبر ہے کہ گورنمنٹ کالج کو بہادر کرنے اور بدنام کرنے میں معین الرحمن کا غالب حصہ ہے۔ یہاں غالب کے کئی معنی مراد ہیں۔

پچھلے دنوں لطیف الزمان خان لاہور آئے اور اردو ادبیات کے قابل فخر جواں بہت پروفیسر ڈاکٹر عارف آفتاب کے ہاں مہمان رہے۔ عارف آفتاب گورنمنٹ کالج کے

شعبہ اردو میں تھے۔ ڈائریکٹ ایجوکیشنل پروفیسر سلیکٹ ہو کر مرے کالج سیالکوٹ میں صدر شعبہ ہیں۔ وہ بہت لائق اور مخلص انسان ہیں۔ اس لیے معین الرحمن نے انھیں گورنمنٹ کالج میں ٹیچر نے نہیں دیا۔ اس سے پہلے بھی بہت قائل اور محترم پروفیسر ایک ایک شعبہ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اب وہاں اب رہتے ہیں۔ ایک بھی قائل ذکر مخلص وہاں نہیں۔ پچھلے سال ایم اے اردو میں کل پانچ چھ طالبات نے داخلہ لینا پسند کیا۔ پسند کی اور مجبوری ایک چیز بن گئی۔ کچھ خواہش مند لڑکوں کو معین نے داخلہ نہیں دیا۔ اب یہ شعبہ صرف گراؤ کے لیے مخصوص ہو جائے گا۔ اردو تحقیق کے علاوہ معین نے اردو تدریس کو بھی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ گورنمنٹ کالج کی ایک طالبہ بشری باسط کا ایم اے کا مقالہ معین الرحمن نے اپنے نام سے چھپوا دیا ہے جبکہ وہ ریکارڈ پر موجود ہے اور اس پر ڈگری ایوارڈ ہو چکی ہے۔ یہ ایک بھیا تک فراڈ ہے جس پر ڈاکٹر خالد آفتاب اور جنرل ارشد محمود کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔ جنرل ارشد محمود جانتے ہیں کہ میں ان کا مداح ہوں اور میں نے ان کے لیے بچ لکھا، جب میں ان سے ملا بھی نہ تھا۔ میں خوش ہوں کہ انھوں نے میرے بچ کی لایہ رکھی ہے۔

محترم لطیف الزمان خان، پروفیسر عارف ثاقب اور میں جناب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی سے ملے۔ انھوں نے کمال صبر پائی سے سارے معاملات کو سمجھا اور انوکھائی کا حکم دیا۔ جنرل صاحب روشن چہرے، اچھے دل کے ماہر تعلیم ہیں۔ انھوں نے یونیورسٹی کا خاصا گند صاف کر دیا ہے۔ ابھی ادلوں اور آرزوؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ یونیورسٹی کے حوالے سے باتیں کر رہے تھے اور ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ خان صاحب اور عارف ثاقب نے غالب پر ہونے والے ظلم کی دہائی دی۔ جنرل صاحب متاثر ہوئے۔ اب امید کی جاسکتی ہے کہ پنجاب یونیورسٹی میں کیے گئے اس عظیم فراڈ کے لیے خاطر خواہ کارروائی ہو گی۔ لاہوری اور شعبہ امتحانات کے لیے جنرل صاحب نے قائل قدر اصلاحات کی ہیں۔ اب یہ اقدام بھی ان کی قائل ذکر معرکہ آرائی ہو گی۔ اس ضمن میں لطیف الزمان خان، ڈاکٹر حسین فراقی اور ڈاکٹر عارف ثاقب سے رابطہ سفید ہو گا۔

غالب ایک انگریز کرل سے ملا تو کہا کہ میں آدھا مسلمان ہوں۔ وہ پاکستانی

جنرل سے ملتا تو کہتا کہ میں ایک چڑیا ہوا شاعر ہوں۔ انگریز کرنل غالب سے مل کر خوش
ہوا تھا۔ غالب پاکستانی جنرل سے مل کر خوش ہوتا۔

(اکثر اہمیل نیازی ہے نیازیوں۔ روزنامہ ”دن“ لاہور۔ ۲۹ جون ۲۰۰۰ء)

دی سی صاحب کو انتہاء

ڈاکٹر اجمل نیازی

باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر مصین الرحمن نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چرایا ہوا نادر مخطوطہ ("دیوان غالب، نسخہ لاہور") واپس چانسٹر جنرل ارشد کو بڑی دھوم دھام سے واپس کر دیا ہے۔ اس سے پہلے اس حوالے سے انکوائری رپورٹ واپس چانسٹر تک پہنچ چکی ہے، جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یہ مخطوطہ یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ اس کا لاہوری نمبر ۶۸۱۳ ہے۔ اس کی واپسی کے لیے دی سی صاحب نے مناسب کارروائی کے لیے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ خود مصین الرحمن زیادہ بے قرار تھا۔

یونیورسٹی کی اپنی چیز کوئی واپس کرتا ہے، جبکہ وہ خود اس میں ایک منسلک کردار ہے، تو اس میں اتنی شان و شوکت کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کوئی کسی اغوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دھن دھن بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ وہ بچے بھی ہوں۔

مصین نے مخطوطے کو سناٹا کے دی سی کو پیش کیا، جسے انہوں نے یقیناً شکرے کے ساتھ وصول کیا ہو گا۔ تصویر بھی اتریں ہوگی۔ میں دی سی صاحب سے نامور غالب شمس لطیف الزمان خان اور پروفیسر ڈاکٹر عارف قاقب کے ساتھ مل چکا ہوں۔ انہیں بڑے درد سے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ انہیں مصین الرحمن کی چوریوں اور سینہ زوریوں کے بارے میں کھل کر بتایا۔ انہوں نے ساری بات بہت بہت اور توجہ سے سنی، انکوائری کا حکم دیا۔ انکوائری رپورٹ ہماری گزارشات کے مطابق ہے۔

یہ بھی جنرل صاحب کو بتایا گیا تھا اور انکوائری رپورٹ میں اس کی وضاحت بھی موجود ہے، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایک طالبہ بشری باسٹ نے ایم اے اردو کے لیے "ادوا جعفری، شخصیت اور شاعری" کے عنوان سے مقالہ لکھا، جس پر ڈگری عطا کی گئی ہے۔ یہ

مقالہ بھی پرنسورٹنی کی ملکیت تھا۔ اسے ڈاکٹر مصمین نے اپنے نام سے پورے کا پورا رسالہ "انفوش" کے ستمبر ۱۹۹۱ء کے شمارے میں چھپوا دیا، حتیٰ کہ اس میں وہ لخطیاں بھی موجود ہیں جو مقالے میں ہیں۔

ڈاکٹر مصمین نے ڈاکٹر حسین فراقی کے جرأت مندانہ تحقیقی پمفلٹ کے رد عمل پر جو پمفلٹ لکھا، اس میں اعتراف کیا کہ لڑکی کی ماں چار تھی، اور اس کا مقالہ میں نے خود لکھا ہے، جبکہ یہ ایک جرم ہے، تو پھر احتمالات میں ایک امیدوار کی صرف امداد کرنے پر گرفتاری کیوں ہو جاتی ہے؟

حیرت ہے کہ اس کھلے اعتراف جرم کے بعد الپ آئی آر درجن نہیں ہوئی اور کارروائی بھی نہیں ہوئی۔ یعنی جو اپنے جرم کا اعتراف کرے، اسے معاف کر دیا جائے۔ ایک چوری کے بعد کئی دوسری چوریاں بھی سامنے آتی ہیں۔ میں پہلے بھی ڈاکٹر مصمین الرحمن کی وارداتوں کا ذکر کر چکا ہوں۔ یہ شخص تحقیق و تدریس کا دشمن ہے۔

یہ شخص پبلک سروس کمیشن سے نیگٹوار سلیکٹ نہ ہو سکا تھا، مگر پروفیسر سلیکٹ ہو گیا۔ یہ بھی سازش کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اب یہ دہلیاب ایجوکیشن میں نمبر ۱۱ ہے۔ ویسے بھی یہ "نمبر دو" آدمی ہے۔ "نمبر دو" کام کرنے کا ماہر بلکہ ماہر تعلیم ہے۔ اس نے تھا تعلیمی شعبے کو بھٹا نقصان پہنچایا ہے، ایسے سکڑوں آدمیوں نے نہیں پہنچایا ہوگا۔

عظیم تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور کو برباد کرنے اور بدنام کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ میرا خیال ہے کہ پرنسپل کالج ڈاکٹر خالد آفتاب گورنمنٹ کالج کے نئے دنوں میں ایک ٹپک نامی ڈالنے کے خواہاں ہیں مگر اس شخص نے انھیں مسلسل دھوکے میں رکھا۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج کو چاہیے کہ وہ اس کی تعلیم جن سرگرمیوں کا نوش لیں۔ طالب بشری باسط کے مقالے کے حوالے سے تحقیر بدعنوانی کے معاملے میں گورنمنٹ کالج بھی بدنام ہوا ہے۔ انکوائری رپورٹ میں واضح طور پر اسے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ جنرل ارشد بھی اولڈ راولپن ہیں۔

پبلک سروس کمیشن نے ایکسپٹ کے طور پر اسے نااہل رکھا ہوا ہے، جبکہ پرنسورٹنی اور پرنسپل کالج میں وہ اس طرح کی ذمہ داریاں انجام دے کر رہا ہے۔ شعبہ احتمالات کے ماہرین اور ماہرین غالب سے ملاقات کے بعد جنرل ارشد موثر کارروائی کریں۔ ان کے

لئے ہمارا خیال اچھا ہے۔ انہوں نے یونیورسٹی میں اصلاحات کا ایک نیا زمانہ شروع کیا ہے۔ ایک زمانہ ان کا معترف ہو رہا ہے۔

تازہ ترین دو سینڈل ان کی پوری توجہ چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ علمی شخصیتیں گمروں سے باہر نکل کے کسی مہم کا حصہ بنیں، جنرل صاحب اپنے حصے کا کام کر دیں۔ یہ کارنامہ ہو گا اور نیک نامی ہو گی۔

(ڈاکٹر افضل بخاری۔ ”بے نیازی“۔ مہنامہ ”دن“ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۳ء ص ۲۰۰۰)

جھوٹی ایف آئی آر اور چور پروفیسر

پاکستان میں آج تک کسی تھانے میں ایک بھی جی ایف آئی آر درج نہیں ہوئی۔ یہ بات وزیر قانون و انصاف ڈاکٹر خالد رانجھا نے بتائی۔ وہ ایک بڑے وکیل، دانشور اور ماہر قانون ہیں۔ حکومت پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایسا وزیر ملا۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے ایف آئی آر بنیادی دستاویز ہے جسے کبھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ موافقہ کے گواہان کا اندراج بھی اس میں ہوتا ہے۔ وہ کی جھوٹے ہوتے ہیں جو عدالت میں ”جج“ بولتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو وعدہ معاف گواہ بھی بچے نہیں ہوتے۔ ان میں سمندر پیورو کریٹ اور سیاستدان بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسا جھوٹا گواہ سابق پیکر نری تعلیم پنجاب احمد صادق ہے۔ اس کے نام ایک جھوٹے پروفیسر ڈاکٹر صمیمین الرحمن نے اپنی ایک کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ میں اسے کاڈب لکھتا مگر احمد کے ساتھ یہ لفظ لکھنا محبت کی توجہ میں ہے۔

ڈاکٹر صمیمین نے پنجاب یونیورسٹی لاہور جی سے دیوان غالب کا ”نسخ لاہور“ چوری کیا، اسے چھاپا، کمائیاں کیں اور پھر وی سی جزل ارشد کو بڑے فخر کے ساتھ واپس کر دیا۔ ایم اے کی طالبہ بشری باسرا کا مقالہ اپنے نام سے رسالہ ”نقوش“ میں نیچہ دیا۔ اس چوری اور سینہ زوری کیلکاف بہت قابل الجھ کیشت پروفیسر ڈاکٹر عارف عاقب کی وی سی کو درخواست ایک جی ایف آئی آر سے بڑھ کر ہے۔ ڈاکٹر صمیمین فراقی اور قدرت نقوی کے دو کتابچے اور میرے دو کالم بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ تھان کے ماہر غالبیات لطیف الزمان خان کی گفتگو تو جیسے بدلتی جرج ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کوئی ٹیک نامی دینے والے جرنیل نے بھی کلمہ نہیں کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خالد رانجھا کلمہ کریں۔ وہ علوم کا قہم اپنے دل و دماغ میں رکھتے ہیں اور بولتے

راویں ہیں۔ ایک جان راویں استاد ڈاکٹر مصیبن نے ہمارے گورنمنٹ کالج لاہور کو برہادی اور بدنامی کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ اب ہمارے اور کالج میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس ہمارے کا محرر ڈاکٹر مصیبن الرحمن ہے جو واقعی ڈائریکٹ حوالدار ہے۔ وہ پنجاب پبلک سروس کمیشن کے لیے جسم اور مسلسل رسوائی کا باعث ہے۔ اس کا ایک ساتھی پنجاب پبلک لائبریری کا ڈائریکٹر عبدالجبار شاکر ہے۔ اس نے پنجاب پبلک لائبریری کے ساتھ وہی کیا ہے جو یونیورسٹی لائبریری کے ساتھ مصیبن نے کیا ہے۔ پنجاب پبلک لائبریری میں قرآن کے محفوظے مصیبن کے کسی کام کے نہ تھے، ان سے عبدالجبار شاکر نے جو کام لیا وہ تو پیش در مولوی بھی نہیں لے سکے۔

راجھا صاحب نے ٹھیک کہا کہ ہمارا معاشرہ جھوٹوں کا ڈایہ ہے۔ میں نے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کی مثال دی کہ وہاں ہمارے، عدالت اور کہیں بھی جھوٹ کا گزر نہیں۔ اداروں اور تعلیمی اداروں میں توجہ اور محبت ہی رائج ہوتے ہیں۔ میں کئی دفعہ ماروے گیا ہوں۔ وہاں معلوم تاریخ کی روشنی میں بظاہر کوئی تغیر نہیں سمجھا گیا، کوئی آسانی بدایت نہیں آتی۔ وہ سمجھتی چوروں کا ملک تھا۔ اب محبت کرتوالوں کا مہذب ملک ہے۔

راجھا صاحب نے کہا کہ تعلیمی فروغ اور فطری عادات نے انہیں اچھا شہری بنایا۔ میں نے سوچا کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں "ڈاکٹر مصیبن" کی کی نہیں تو تعلیمی فروغ سے کیا ہو گا۔ ہمارے تمام تمام تعلیم یافتہ لوگ زیادہ مجرم اور کرپٹ ہیں۔ اس ملک کو ان چڑھ اور غریب لوگوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، تو کیا کالہوں اور ہالٹھوس گورنمنٹ کالج لاہور کوئی اہمال بند کر دیا جائے، جب تک ڈاکٹر مصیبن الرحمن ریجنل منسٹر کی عمر کو نہیں پہنچ جاتا۔

لاہور ہائی کورٹ کے ایک جج نے کہا کہ ہمارے بند کر دیے جائیں تو لوگ جرائم کرتا بند کر دیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ جج صاحبان کسی قانوندار کا جو حشر عدالت میں کرتے ہیں، ڈاکٹر مصیبن اس سے کہیں بڑھ کر بڑے سلوک کا مستحق ہے۔ بچے اولڈ راویں، ڈاکٹر خالد راجھا اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج لاہور کو ایک علم دشمن اور چور استاد سے بچائیں۔ جرنیل وائس چانسلر اور راویں پرنسپل اس کا ہیکہ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس کے بڑے

بڑے لوگوں سے (راہٹے) ہیں، جس طرح پیشہ ور محرموں کو وڈیوں، لئیروں کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر ایشل پلازی۔ ”بے نیاز ہیں“۔ روزنامہ ”دن“ لاہور۔ ۳۰ ستمبر ۲۰۰۰ء)

چانسلر صاحب وائس چانسلر کی مدد کریں

ڈاکٹر اجمل نیازی

ڈاکٹر معین الرحمن نے کہا اردو تحقیق کے ساتھ وہی کیا ہے جو خواب زادہ نصر اللہ نے پاکستانی سیاست کے ساتھ کیا ہے، مگر ہم معین کو اردو تحقیق کا نصر اللہ یا نصر اللہ کو پاکستانی سیاست کا معین نہیں کہہ سکتے۔ اس طرح دونوں کی توجہ ہوئی۔ ڈاکٹر معین نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے دیوان غالب کا مخطوط ”ملفوظ لاہور“ چلایا۔ پھر اسے شائع کرایا اور لاکھوں روپے کمائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حسین فراقی نے کتابچہ لکھا۔ جس کی اردو دنیا میں پذیرائی ہوئی۔ سب نے ڈاکٹر معین کی حقیقی چوری کی خدمت کی۔ ڈاکٹر عارف قاقب نے بھی بہت دلیری سے حقیقی مقابلہ کیا۔ میں نے بھی دونوں ادبی مجاہدوں کے ساتھ مل کر آواز بلند کی۔ میں نے کالم لکھے۔ کالم نگاری سالم نگاری ہے۔ میں نے ہر طرح کے علم کے خلاف قلم کو حکم بنایا ہے۔ میرے لفظ نعرے بازی بھی کرنے لگتے ہیں۔ میں کالم نگاری کو کالم آرائی سمجھتا ہوں۔ اور کالم آرائی معرکہ آرائی سے کم نہیں۔

میں نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ارشد کی مدد آرائی کی۔ یہ ”خدمت گردی“ سے مختلف نہیں ہوتی۔ اللہ کے فضل سے میرے نزدیک مدد اور خدمت برابر ہیں۔ میں ڈاکٹر عارف قاقب کے ساتھ وہی سی صاحب سے ملے۔ ہمارے ساتھ حقیقی استقامت والے غالب مرحوم کے عاشق صادق، دانشور، نامور ماہر قابلیت، دلیر و دانا اور دیدہ ورجہ جناب لطیف الزمان خان بھی تھے۔ وہ مکان سے خاص طور پر آئے تھے۔ ماہر تعلیم جرنیل وائس چانسلر ہماری باتوں سے حقیق اور متاثر ہوئے۔ معاملے کی چھان بین کے لیے کمیٹیاں بن گئیں۔ ساری رپورٹیں ہماری گزارشات کے مطابق ڈاکٹر معین کے خلاف ہیں۔

اس دوران ڈاکٹر عارف قاقب نے ڈاکٹر حسین فراقی اور ڈاکٹر معین الرحمن کے

سنا بچوں کے سوا نے پر مشتمل ایک زبردست ادبی رجسٹر مرحب کی، جس کی دھوم دور دور تک ہوئی، مگر نہ جانے کیا ہوا کہ ڈاکٹر صمیم الرحمن نے یونیورسٹی لائبریری سے چرایا ہوا محفوظ واکس چائلٹر کو پیش کیا۔ اس واقعے کی تصویریں بنائی گئیں اور چھپوائی گئیں۔ لگتا ہے جیسے وی سی صاحب ڈاکٹر صمیم سے کوئی انعام وصول کر رہے ہیں۔ یہ ہر لحاظ سے تو جین آمیز ہے۔ جنرل ارشد تو بہت دل والے روشن دماغ آدمی ہیں۔ انہیں کیا ہوا کہ انہوں نے اس حوالے سے آنکھیں بند کر لیں۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کو سنے سطر دیے ہیں جنہیں ہزاروں آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ ان کے آنے پر لوگوں نے واویلایا کیا۔ میں نے وی سی کے لیے خیر مقدمی کالم لکھا۔ انہوں نے میرے گفتگوں کی لاج رکھی۔ وہ پرانی درس گاہ کو نئے صبح و شام دے رہے ہیں۔ وہ قبضہ گروپ یعنی ”طلبہ گروپ“ کے خلاف ڈٹ گئے تو وہ غالب مظلوم کو بھی پیانیں۔ انہوں نے جو کام آغاز کیے ہیں، ان کے لیے تعریف ہی تعریف ہے۔ اللہ کرے انجام بخیر ہو۔

ان سے ایک عظیم شاعر کی تو جین کے لیے احتجاج کیا۔ اس ضمن میں ان سے انصاف اور امداد کی توقع کی۔ میں ذاتی کام تو اپنے خدا سے کہتے ہوئے بھی گھبراتا ہوں۔ خدا وی سی صاحب کو چھڑیں اور پھرے دیکھنے کی توفیق دے، جیسا کہ اصل میں وہ ہیں۔ دوست مایوس اور مجبور ہو کے عدالت میں جانے والے ہیں۔ میں نے انہیں روک رکھا ہے۔ ابھی ہم وی سی صاحب سے پوری طرح ناامید نہیں ہوئے۔ معاملہ عدالت تک گیا تو جنرل صاحب کو بھی خواری کا سامنا ہو گا، اور ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ اس ریادتی میں ہم غالب کے طرف دار ہیں اور واکس چائلٹر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ کیا ہم چائلٹر صاحب کی طرف دیکھیں۔ وہ واکس چائلٹر رہ چکے ہیں۔ گورنر پنجاب جنرل مسعود سلیم و تحقیق کے فروغ کے لیے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ واکس چائلٹر نے ڈاکٹر صمیم الرحمن کے معاملے میں چپ سادہ لی ہے اور اجارہ ادا وہ ہے کہ طبعی و ادبی اور تحقیقی و تعلیمی کرپشن کے حوالے سے ڈاکٹر صمیم کا کیس احتساب کے لیے نیب کے حوالے کیا جائے۔

آخری عمر میں جب مرزا غالب کو لوگ نکالیں سے بھرے ہوئے خطوط لکھتے تھے تو اس نے برا نہیں منایا تھا۔ اسے یہ برا لگا تھا کہ لوگوں کو کالی دینا بھی نہیں آتا۔ بڑے سے

آدی کو ماں کی گالی نہیں دیتے۔ ڈاکٹر مصحیح نے وہ کچھ کیا ہے جیسے مرنے کے بعد غالب کو ماں کی گالی دی ہے۔

ڈاکٹر مصحیح نے ایک ڈاکر اور مارا ہے۔ ایک کتاب ہے ”بریکٹیل غالب“۔ یہ کتاب بھی چوری اور سیڑھ زوری کا شاہکار ہے۔ ڈاکٹر مصحیح ”بریکٹیل غالب“ اور بریکٹیل تذکرہ میں فرق نہیں جانتا۔ جیسے آج کے ماہر اقوالیات اور ماہر خالہیات میں فرق نہیں۔ تو غالب اور مطلوب بھی ایک صنف میں کھڑے ہیں۔

(ڈاکٹر اہمل ہاشمی۔ ”سبے چارہاں“۔ روزنامہ ”دن“ لاہور۔ ۳ دسمبر ۲۰۰۰ء)

چانسلر کے گھر پر وائس چانسلر کا ”تحقیقی سچ“

ڈاکٹر اجمل نیازی

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل ارشد محمود نے کہا کہ ڈاکٹر معین نے مجھے دھوکہ دیا ہے، میرے سامنے جھوٹ بولا ہے۔ یہ دونوں کام تو ڈاکٹر معین کا معمول ہے اور اس کے لیے معمولی بات ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جنرل صاحب اصل بات تک ضرور پہنچیں گے۔ میرا خیال جنرل صاحب کے لیے اچھا ہے۔ میں انہیں طا بھی نہ تھا جبکہ ان کے خلاف یونیورسٹی استادوں کا ایک وفد مجھے طا تھا۔ میں نے جب بھی جنرل صاحب کا اپنے طور پر خیر مقدم کیا تھا۔ میں نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ یہ شخص پنجاب یونیورسٹی کے بگڑے ہوئے حالات کو سنبھال لے گا اور ایک نیا زمانہ مار پلی کو طے گا۔ مگر یہ ہوا کہ ان کے مخالف اساتذہ بھی حیران ہوئے۔ میں اپنے سامنے سرزد ہوا۔ خدا نے مجھے بھی اپنے نگھے ہوئے لفظوں کے سامنے شرمندہ نہیں کیا۔ جنرل صاحب نے مجھے فون کیا تو میں نے کہا یہ ضروری نہیں کہ کوئی مجھے کہے تو میں نکسوں۔ میں آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ میں نے جو آپ کے لیے محسوس کیا تھا، آپ وہی ہیں۔ آپ نے میری یونیورسٹی کو ایک اعلیٰ درس گاہ بنانے کے لیے کئی جدوجہد کا آغاز کیا ہے۔ یہ تارے لیے اعزاز اور خوشی کا مقام ہے۔ مجھے امید ہے کہ ماضی کا سیاسی اور تعلیمی اکھاڑہ ایک ملی گفتگو میں تبدیل ہو گا۔ یہاں سیاستدان اساتذہ اور لیڈر طلبہ کا دلگل اب نہیں ہو گا، بلکہ جنگل میں منگل ہو گا اور یہ جنرل ارشد کے زمانے میں ہو گا۔ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جنرل اکرم ہیں اور وہاں ذمہ تعلیم میرے بھتیجے احمد بن اکبر نیازی نے بتایا کہ میں نے جنرل صاحب سے پہلے کا زمانہ بھی دیکھا ہے، مگر اب تو کوئی نیا زمانہ ہے۔ تو کیا ساری یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر جرنیل ہوں، مگر وہ ایسے ہی جرنیل ہوں۔

گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر خالد آفتاب اپنے ادارے کے ایک ثابت شدہ

مجرم استاد ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن سے گورنمنٹ کالج کو نجات نہیں دلا سکے۔ میں ایک سچا راولین ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ گورنمنٹ کالج کو جس طرح کا جتنا نقصان ڈاکٹر مصیبن نے پہنچایا ہے، گورنمنٹ کالج کے سارے طالبوں نے مل کر بھی نہیں پہنچایا ہو گا۔ اب بھی وقت ہے ڈاکٹر خالد کے پاس کہ وہ یہ کارنامہ کر دیں۔ مصیبن الرحمٰن کو ایسی سزا دیں کہ گورنمنٹ کالج اس کی پھیلائی ہوئی گندگیوں اور بندگیوں سے پاک ہو سکے۔ جس طرح اصل صورتحال کا اور اک جنرل ارشد کو ہوا ہے، کاش ڈاکٹر خالد آفتاب کو بھی ہوتا۔

جنرل صاحب کو میں برادرم ڈاکٹر عارف ثاقب اور محترم لطیف الزمان خان کے ہمراہ ملا تھا اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے معروف مخطوطہ ”دعوان غالب“ کے نسخہ ”لاہور“ کی چوری اور اسے ڈاکٹر مصیبن کی طرف سے نسخہ خرید بنا کے شائع کرنے اور کمائیاں کرنے کے واسطے سے آگاہ کیا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر حسین فرائی اور ڈاکٹر عارف ثاقب کی جرأت مندانہ تحقیق پر مٹی سنا پچے بھی انھیں پیش کیے تھے۔ اس حوالے سے بہادر ماہر غالبیات لطیف الزمان خان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ وی سی صاحب نے فوری طور پر پرنسپل اور منسٹر کالج اکرم چوہدری کو رپورٹ پیش کرنے کو کہا تھا۔ چوہدری صاحب اور یونیورسٹی کے دوسرے کئی اہم حضرات کی طرف سے ساری تحقیق نے ہماری باتوں کی تصدیق کر دی ہے۔

اس دوران ڈاکٹر مصیبن نے اپنے خوشامدانہ طریق کار سے وی سی صاحب کو مذکورہ مخطوطہ پیش کر دیا اور تصویریں بھی ہوا لیں۔ یونیورسٹی سے خود چوری کیے ہوئے مخطوطے کو اپنی دریافت کہا۔ اس کے خلاف چوہدری اور فرائی کا پچہ یونیورسٹی کی طرف سے درج ہونا چاہیے۔ اٹھارہ بیان کے مطابق جنرل ارشد نے اس مجرمانہ حرکت کو ادنیٰ تارخ کا بڑا فراڈ قرار دیا ہے۔ اسے تحقیق و تدریس کے ساتھ بے وفائی کا نام دیا ہے۔ یہ باہمی انھوں نے چانسلر کے گریجویٹ گورنر ہاؤس میں ایک عشاے کے موقع پر کہیں۔ گورنر پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر ہیں۔ انھیں کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ انھوں نے بھی اس تحقیقی چوری کا ٹوٹ لیا ہے۔ وہ پنجاب اور پنجاب یونیورسٹی میں کسی طرح کے فراڈ کرنے والے کو فرار نہیں ہونے دینا چاہتے۔ اس دوران ڈاکٹر مصیبن نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس نے اپنی ایک شاگردہ کو ایم اے اردو کا

مقالہ تحریر کر کے دیا تھا، اس لیے اسے اپنے نام سے "نفقوش" میں شائع کروایا ہے، جبکہ اس مقالے پر بھرتی واسطہ کو ایم اے کی ڈگری ملی ہے۔ ایسے کام اپنی تدریسی زندگی میں ڈاکٹر مصین الرحمن نے بہت کیے ہیں۔ وہ پبلک سروس کمیشن میں پیکرار سلیکٹ نہ ہو سکا تھا مگر پروفیسر وقار عظیم کو اپنی "فرزندگی" دینے کا چہرہ دکھ کر پروفیسر سلیکٹ ہو گیا، پھر ان کی بیٹی سے شادی بھی نہ کی۔

(ڈاکٹر اجمل نیازی۔ "بے نیازیاں۔" روزنامہ "دین" لاہور۔ ۱۹ جنوری ۲۰۰۱ء)

ادراک کا بیوپار کرنے والے بوڑھے

ڈاکٹر عارف ثاقب

سید قدرت نقوی صاحب کے انتقال کی خبر غالب دوستوں کے حلقے میں بڑے دکھ سے سنی گئی۔ غالب شہابی کا ایک باب ختم ہوا۔ ہمارے ہاں بچے محققین کی تعداد ہی کتنی ہے۔ ایسے میں ایک سچا غالب شہابی دنیا سے اٹھ جائے تو اس سے بڑا الیہ کیا ہو گا۔ میں سید قدرت نقوی صاحب سے اُن کی تحریروں کے ذریعے متعارف ہوا تھا اور میرے دل میں اُن کا بڑا احترام ہے۔ انہوں نے میں اُن سے مل نہ سکا، انہیں دیکھ نہ سکا۔ قدرت نقوی صاحب گزشتہ ایک دو ماہ سے سخت بیماری کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اسی بیماری کی حالت میں انہوں نے غالب شہابی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک کتابچہ تحریر کیا تھا۔ ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ۔“ میرا اندازہ ہے کہ یہی ان کی زندگی کی آخری تحریر بھی تھی۔ غالب کے ساتھ محبت کرنے والے قدرت نقوی نے دیوان غالب کے اُس قصبے میں بھی اپنا حصہ ڈالا جو آج کل ادبی حلقوں میں ایک طیر معمولی موضوع بنا ہوا ہے۔ قدرت نقوی صاحب نے اپنے اس کتابچے میں جس معیت نگاہی اور وسیع مطالعہ کا ثبوت دیا ہے، یہی ہمارے بچے محققین کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ مگر انہوں نے اس بات کا ہے کہ یہ لوگ کچھ کتابی میں رہے۔ بھونی شہرت حاصل کرنے کے ہنر وہ بھی جانتے تھے مگر انہیں بروئے کار لانا، وہ علمی دیانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ بس اپنے گیان اور وسیان میں جیتور کی منازل طے کرتے رہے۔ یہی اُن کا کام تھا اور اسی میں اُن کا نام ہے۔ لاہور میں ایک ایسے ہی محقق ظلیل الرحمن دادوی ہیں جنہوں نے اپنی ایک عمر تحقیق کے خازنوں میں گزاری ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور کے ایماء پر جو کتب انہوں نے مرتب کیں اور جن کے بیسوط مقدمے انہوں نے تحریر کیے، وہ اردو محققین کی آمد ہیں، مگر کس قدر مقام انہوں ہے کہ ایسے صاحب نظر ادبی دنیا والوں کو دکھائی نہیں دیتے اور جو

ہا زے اورک کا کارہ بار کر رہے ہیں، وہ صاحب فضیلت ہیں۔ ہماری ادنیٰ دنیا میں کیا گل و گلزار ہونے کے لیے مٹی میں ملنا ضروری ہے؟ ہمارے ہاں کیا زندگی سے اچھے مقدر مزاروں کے ہیں؟ کیا عزت و شہرت کے لیے کسی ادنیٰ گروہ اور میڈیا سے وابستہ ہونا ضروری ہے؟ صاحب احباب کو خوش کرتا اور خوش رکھنا ضروری ہے؟ کیا ہمیں ان سوالوں پر غور کرتے ہوئے اپنا محاسبہ نہیں کرنا چاہیے؟

سید قدرت نقوی صاحب کا کتابچہ ”دیوان غالب، نسخہ طبعہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ“ ڈاکٹر معین الرحمن کے مرتب کردہ دیوان غالب ”نسخہ طبعہ“ (اصلًا نسخہ لاہور) کے رد کے طور پر لکھا گیا تھا، جس میں انھوں نے مختلف شواہد اور خود غالب کی تقریروں سے یہ ثابت کیا کہ دیوان غالب کا نسخہ طبعہ اور ”نسخہ لاہور“ ایک ہی نسخہ ہے۔ انھوں نے اس نسخے کو ”نسخہ بے چوڑ“ کے نام سے بھی متعارف کر دیا۔ آج قدرت نقوی صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ ان کی تحریر کو تہہ میل کر کے پیش کرنے والے محققین بھی موجود ہیں۔ میں یہاں صرف یہ دو اقتباسات درج کر رہا ہوں۔ پہلا اقتباس قدرت نقوی صاحب کے مذکورہ کتابچے کے صفحہ ۴۷ سے لیا گیا ہے۔ اسی اقتباس کو ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنی تازہ کتاب ”برسٹل غالب“ میں صفحہ ۱۸۹ اور ۴۱۷ پر کس طرح درج کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

سید قدرت نقوی صاحب لکھتے ہیں:

”اس نسخہ پر کئی اقتادیں پڑیں۔ پہلی اقتاد اس کی پیش کش کے سلسلہ میں واقع ہوئی جس کا تفصیلی تذکرہ ”طلوع غالب“ (فارسی و اردو) میں موجود ہے۔ دوسری اقتاد سچے پور میں تقسیم ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ ریاست سچے پور سے کوئی اڑا لایا اور صاحب یونیورسٹی کو بیچ دیا۔ تیسری اقتاد: لاہوری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ معین الرحمن کے ہاتھ آ گیا۔ یہ مسروقہ نسخہ مقبول معین الرحمن ہے، جسے انھوں نے ”نسخہ طبعہ“ کے نام سے چھاپ کر اس کی بازیافت کی۔ شہادت اور دلکشاں ابھی ہے۔“

(”دیوان غالب نسخہ طبعہ یا نسخہ مسروقہ۔ ایک جائزہ“ از سید قدرت نقوی۔ مکتبہ تحفہ ادب، کراچی۔ اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۴۷)

قدرت نقوی صاحب کے درج بالا اقتباس کو ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنی کتاب

”برسبیل غالب“ کے صفحہ ۱۸۹ اور ۲۱۷ پر خود ساختہ تہذیبی کے ساتھ ہوں درج کیا:
 ”یو این غالب کے اس نسخے پر کئی اقتادیں پڑیں۔ پہلی اقتاد ہے پور میں تقسیم
 ہند ۱۹۴۷ء میں پڑی کہ اُسے ریاست ہے پور سے کوئی اڑا لایا اور پنجاب یونیورسٹی کو بیچ
 دیا۔ پھر یونیورسٹی لاہوری سے کسی نے کسی طرح اڑا لیا جو شدہ شدہ مصحفی الرحمن کے
 ہاتھ آیا، جسے انھوں نے ”نسخہ خوب“ کے نام سے چھاپ کر اُس کی بازیافت کی۔ طباعت
 اور پیش کش ابھی ہے۔“

(”برسبیل غالب“ ڈاکٹر مصحفی الرحمن۔ اوراقِ دہلی کیشنر، لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۸۹، ۲۱۷)
 آپ نے درج بالا دونوں اقتباسات ملاحظہ فرمائے، اصل بھی اور حوالے کے طور
 پر درج شدہ بھی۔ مصحفی الرحمن صاحب نے اسے حوالے کے طور پر درج کرتے ہوئے پھر
 داہن کا استعمال نہیں کیا۔ اللہ بیچے قدرت نقوی صاحب کا نام لکھا ہے۔ کتابچے کا حوالہ
 بھی نہیں دیا، جبکہ ان کے دیگر اقتباسات میں پورے حوالے موجود ہیں۔ یہاں کیوں اس
 سے انحراف کیا گیا؟ کیا دنیا کا کوئی حقیقی اصول ایسا ہے جو اس تحریف کو جائز قرار دے؟
 کیا ڈاکٹر مصحفی الرحمن اصل ہر اگراف کو درج کرتے ہوئے اُسے اپنے حق میں تہذیب کر
 دینے کا حق رکھتے ہیں؟ کیا یہ ان لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف نہیں
 جو اصل اقتباس سے لاطم ہیں؟ اور کیا یہ حقیقی بد اخلاقی نہیں؟ قدرت نقوی صاحب تو
 اب صدائے احتجاج بھی بلند نہیں کر سکتے۔ وہ تو اپنے نگھے ہوئے کتابچے کے جواب کے
 منتظر رہے۔ ”برسبیل غالب“ کے مصنف نے قدرت نقوی صاحب کے کتابچے کے جواب
 میں تو ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ ان کے کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا۔ جس اُن کا ایک
 اقتباس دو دفعہ درج کیا اور وہ بھی تحریف کر کے۔ یوں تو یہ ساری کتاب سیاق و سباق
 سے کاٹ کر جملوں اور اقتباسات کی ”تھکیل“ پر مبنی ہے جس پر گفتگو کسی اور وقت کے
 لیے افکار رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے نظیر صدیقی صاحب کی چند سطور یاد آ رہی ہیں جو انھوں
 نے اپنے ایک تازہ خط میں مجھے لکھیں۔ نظیر صدیقی صاحب لکھتے ہیں:
 ”موجودہ کتابچے میں تم نے ڈاکٹر مصحفی کی سخت گرفت کی ہے۔ وہ میرے
 دوستوں میں ہیں۔ انہوں نے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو سمجھانے پر بھی نہیں سمجھتے اور مہلک
 تلبلیوں کا RISK لیتے رہتے ہیں۔“

ناصر زیدی صاحب معین الرحمن صاحب کا جرم تحقیق پا پختے ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ بھی ان کا جرم تحقیق ہے! بس بھی وہ مقام ہے جہاں قتل کر میں سوچنا ہوں کہ ہم نے ان سچے محققین سے کیوں چشم پوشی کر رکھی ہے جو شہرت، نام وری اور مقام و مرتبے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ ”برسٹیل غالب“ میں نام لے کر اور نام لیے بغیر جو ذاتی نوعیت کے حملے کیے گئے ہیں، ان کا جواب ابھی اسی سٹیج پر آ کے نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک علمی معاملہ ہے لہذا انداز بھی علمی ہی رہے تو بہتر ہے، لیکن اگر من گھڑت کہانیاں بنا کر حقائق کو بھپانے کی کوشش ہوگی اور ”برسٹیل غالب“ کی طرح ذاتیات کو اچھا ل جائے گا تو پھر کچھ لوگ اسی سٹیج پر اتر کر جواب دینے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ ناصر زیدی صاحب اطمینان رکھیں۔ ہم وہ ہرگز نہیں کریں گے جو اہل تشدد نے پگاند کے ساتھ کیا۔ البتہ ہم ان دستاویزات کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کرتے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں گی۔

باقر صاحب کا ایک شعر ہے:

ذائقوں کے قتل کے یوں سلسلے جاری ہوئے

یوڑنے اس عہد میں اور ک کے پیواری ہوئے

خدا جانے ہمارے ہاں لڑنے، اور ک کا کاروبار کب تک کرتے رہیں گے؟ اور

کب تک ذائقوں کے قتل کا سلسلہ جاری رہے گا!!

عالم ارواح سے مرزا اسد اللہ خان غالب کا خط

حفظ الرحمن خان

ایک صاحب عالم آپ دگل سے عالم بے کیف و کم میں، کہ جس کو عرف عام میں برزخ کہتے ہیں، تازہ وارد ہوئے ہیں۔ بتا رہے تھے کہ تم خانوادہ لوہارو کے چشم و چراغ ہو۔ جمیل الدین احمد خان نام پایا ہے، مختصص پ عالی ہو اور سلطنت خدا داد موسومہ پاکستان کے شہر کراچی میں تمہارا قیام ہے۔ علاء الدین احمد خان علوی کا پڑپوتا جمیل الدین احمد خان عالی، وہ کیا خوب مناسبت ہے۔ یہاں مادی دنیا کے مد و سال کے پچانے مستعمل نہیں، خدا جانے مردِ الیام کے حساب سے کتنا زمانہ بیت چکا ہے۔

یاد آتا ہے کہ جہان اسباب میں تمہارے خانوادے سے گہری نسبت تھی۔ تم بھی اسی نہال کے شر ہو جس کا میں ہوا خواہ اور سایہ نہیں رہا۔ کیونکر مجھ کو مزید نہ ہو گے۔ رہی دیدار، اس کی دو صورتیں ہیں۔ میں مثل پہلے جنم کے دوسرا پاؤں یا تم دار فنا سے عالم ہلا میں آؤ۔ پہلی صورت جہان فانی میں نمود کا واسطہ تھا، دوسری صورت بہر حال شدنی ہے۔ آؤ کے قول جنمیں گے۔

اب پوچھو کہ تو کیونکر عالم برزخ کی دستاویزی میں بیخ رہا۔ صاحب بندہ بیخ کہاں رہا۔ ایک سسٹان سے آپ و گیاہ وادی کا سفر کرتا ہوں۔ دھوپ ہی دھوپ ہے۔ سایہ کا نام و نشان نہیں۔ خلق خدا پینے میں شرابور بھٹکتی پھرتی ہے۔ کوئی راستہ نہیں، کوئی بدرق نہیں۔ وہ تو خدا کا فکر بجالاتا ہوں کہ میرے سیاہ ناسے میں چند شعر احترامِ کناہ کے پائے گئے۔ چند آنسو شرمساری کے دامن میں گرے تھے، کام آگئے۔ ورنہ میں کہاں اور یہ عالم نفسا نفسی کہاں۔ یہاں وہ وارد و گیر ہے کہ اللہ کی امان۔ میری جان! یہاں آتا تو زاد سفر ضرور ساتھ لانا۔ بڑے بڑے تبار، کہ دنیا میں ارسائی و بے ریائی میں نام رکھتے تھے، یہاں آکر حقیقت کھلی کہ دکھاوا تھا۔ اصل محتاج سے خالی کیسہ ہیں۔ ان پر وہ القاب ہے کہ الامان والہیہ! دیکھیے! انہام کا رکھا ہو۔

بھائی! یہاں تازہ واردان بساط برزخ کی ایک مجلس میں گزر ہوا۔ ذکر ہو رہا تھا کہ عالم آپ دگل کے رشتہ دان مطلقوں میں شعر غالب کا بڑا چچا ہے۔ غالب شناسی، شعری

روایت کا اہم جزو قرار پائی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پنجاب کے شہر لاہور میں میرے دیوان کے ایک قلمی نسخے کے حوالے سے تازہ کھڑا ہو گیا۔ کوئی سید زاوہ موسوم بہ مصین الرحمن ایک قدیم قلمی نسخے کی دریافت کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس قلمی نسخے اور اوراق ۶۳، سرلوچ و تصویر، شکرگرف و لاہور سے منقش، پہلے صفحات، مطلقا، حاشیہ و بین السطور مطلقا تہل ہونے، برقی غزل سے پہلے تہل ہونے، شکرگرف، خاتمے پر بھی طلاکاری ہے۔ لاہور کے سید زاوے کا بیان ہے کہ یہ ٹایپ قلمی نسخہ پرانی کتابوں کے ایک کاروباری سے اسے ملا۔ ادھر جاسد علیہ پنجاب کے ایک استاد نے، کہ قسین فراقی کے نام سے معروف ہے، یہ تحقیق ثابت کیا کہ یہ نسخہ اسی دانش گاہ کے کتب خانے ہی سرحد ہے، اور سید زاوہ مصین، غالب شاہی کا سکہ بھانے کی خاطر اسے اپنی دریافت و تحقیق کا ثمرہ بتاتا ہے۔ ابھی اے کیسی غالب شاہی ہے۔ ناشاہی، دنیا کی زندگی میں مقدر رہی، اب ناسپاسی مرنے کے بعد نصیب ہوئی۔ لوگ میرے کلام کے مجاور بن بیٹھے۔ دنیا میں فرید آباد کا کھتری بھی پیچھے پڑ گیا تھا۔ اب سر کے بھی بچن نہ پایا۔ یہ سید زاوہ میرے نام و کلام کے ویلے سے شہرت اور رزق پاتا ہے اور اب اختیار سے ترفیع درجات کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ مغل شاہوں کی بات چھوڑو۔ وہ کمال فن کے جوہر اور قدر دان تھے۔

جب صامیان عالیخان ہند میں آئے۔ سخن رنخت سے نا آگاہی کے باوصف، علم و ادب کے سچے قدر دان تھے۔ وکیلہ و منصب دیکھ بھال کر دیتے تھے۔ یہ کیا زمانہ ہے کہ سادق معترف ٹھہرے، کم سواد محقق بن بیٹھے۔

اور ہاں میری جان عالی حیران ہوں کہ اس سارے قضیے میں تو کیوں چپ ہے؟ سنا ہے کہ سخن وری میں حیران نام ہے۔ تحقیق میں درک رکھتا ہے اور سیاست و سادت میں کچھ کچھ خاندانی اثرات تھہ میں موجود ہیں۔ تجھ پر مصراحت فائق ہے۔ اس معترض میں، جہاں میں اب ہوں، غدا و اذیت کے سامان کیا کم ہیں جو تمہاری دنیا سے بھی شر اور انکار کیجے جاتے ہیں۔

اپنی نجات کا طالب
طالب

وقت اور زمانہ کا یہاں کوئی شمار نہیں، لہذا تاریخ نامعلوم
(حقیر الرحمن خان۔ ”اگر ہے“۔ روزنامہ ”قوائے وقت“۔ ۱۵ جون ۱۹۷۷ء)

چوری اور سینہ زوری

اشفاق احمد ورک

ہمارے نہایت محترم اساتذہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اور ڈاکٹر حسین فراقی، جن میں سے ایک میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کے نگران ہیں اور دوسرے میرے اعمال کے، لیکن جب سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی صدارت ملی ہے اور ڈاکٹر حسین فراقی کا عین میں قائم ہونیوالی اقبال چیمبر کے لیے انتخاب عمل میں آیا ہے، یہ دونوں حضرات نہایت عدیم القرصت ہو گئے ہیں۔ ہم نے ایک دن باتوں باتوں میں جناب ہاشمی صاحب سے اسی بات کا شکوہ کیا تو مسکرا کر کہنے لگے: بھئی! اصل بات یہ ہے کہ فراقی صاحب کو عین ہو گیا ہے اور مجھے صدارت ہو گئی ہے۔ ہم نے عرض کیا کہ گویا ایک کوس اور ایک کوس ہو گیا ہے۔ جب یہ بات اپنے حکیم جی تک پہنچی تو انھوں نے ہمیشہ کی طرح بات کا ہنگامہ بناتے ہوئے کہا: بھائی میاں! میں کہیں کہ ایک کوس ہونا ہو گیا ہے اور ایک کوس ہونا ہو گیا ہے۔

سواذخیر ان دونوں حضرات کو تحقیق اور تنقید کا ایسا پڑا ہے کہ لگتا ہے انھوں نے اپنے بچوں کے نام بھی حروف جمگی کے اعتبار سے رکھے ہوں گے۔ یار لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنے گھر آنے والے مہمانوں کی بھی 'ہیلو گرانی' تیار کر رکھی ہے۔ مصر میں دمشق قتلہ پڑا تھا تو حنا ہے یار لوگوں نے عشق تک فراموش کر دیا تھا لیکن ان دونوں حضرات پر لکھنے پڑھنے کا ایسا عشق طاری ہے کہ یہ کھانا پینا تک فراموش کیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ تحقیق و تدقیق کے میدان میں یہ دونوں حضرات اردو ادب کے شہسواروں میں شمار ہوتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف اس شعبے میں معیار اور تسلسل کے ساتھ پیش قدمی جاری رکھی ہے بلکہ اس میدان میں در آنے والے موقع و مقام پر سب عناصر کی بھی نہایت سلیقے کے ساتھ فکری و حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی تو اپنی

طیعی صلح جوئی کی بنا پر غراب کا کردہ گی والوں کو محض گریبان میں جھانکنے کا مشورہ دینے پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن ڈاکٹر حسین فراقی، جنہیں حق گوؤں کے ہر اول دستے میں شمار کیا جاتا ہے، وہ اس شبیہ میں بددیانتی کے مرتکب افراد کو نہ صرف ان کے گھر تک پہنچا کے دم لیتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر ایسے ادنیٰ مجرموں کا گریبان تھانسنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ اس سلسلے کی تازہ ترین مثال ان کا ۷۲ صفحات پر مشتمل تحقیقی کتابچہ ”دیوان غالب، نسق خواجہ۔ اصل حقائق“ ہے۔ یہ اصل میں ۱۸۵۲ء میں تصنیف ہونے والے کلام غالب کے ایک تھمی نسخے کی کہانی ہے، جس کا تعارف ڈاکٹر سید مہدائے نے جولائی ۵۳ء کے ”ماہ نو“ کراچی میں کرایا تھا اور اسے خواجہ ضیاء الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے لئے ہوئے خزانے کا درجہ بھارت دیا تھا۔ اس نسخے کے بارے میں مزید توضیحات سید صاحب کے مولانا امتیاز علی عرشی اور ایس ایم اکرام کے نام لکھے خطوط میں بھی ملتی ہیں۔ نیز ایک معتبر محقق کاظمی مہدالودود نے بھی ’نقوش‘ شمار ۶۹-۷۰ء ہایت اکتوبر ۵۸ء میں بھی اسی نسخے پر مخطوط دیوان غالب کے عنوان کے تحت تعارفی شدہ رو لکھا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا نسق پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا اور ایک عرصے تک اسی لائبریری میں موجود رہا۔ مذکورہ محققین نے بھی اس نسخے کی یونیورسٹی لائبریری میں موجودگی اور اس کی حیثیت سے متعلق کوائف بڑی تفصیل سے جان کیے ہیں۔ پھر یوں ہوا کہ یہ نسق پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے غائب ہو گیا۔ اس سلسلے میں سب سے چونکا دینے والی بات یہ ہے کہ یہی نسق ۹۸ء کے آخر میں ڈاکٹر سید مصطفیٰ الرحمن کی ترغیب و تدوین کے ساتھ ”دیوان غالب، نسق خواجہ“ کے نام سے نہایت خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ شائع ہو گیا، جسے ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف اپنے ذخیرہ غالبیات کی ”پیش قیمت محتاج“ قرار دے ڈالا بلکہ ساتھ ساتھ یہ انکشاف بھی فرمایا کہ انہیں یہ نسق ایک پرانی کتابوں کے کاروباری سے ملا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے بھی اس کے دیباچے میں اسے خواجہ ضیاء الدین احمد خاں یا کسی شہزادے کے ذخیرے کا گورگم ٹھکانہ ہی گردانا۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ڈانے والے بھی قیامت کی نظر دیکھتے ہیں، ویسے تو سید مصطفیٰ (سید مہدائے اور سید مصطفیٰ) کے جملوں کی یہ یکسانیت ایک عام آدمی کو بھی چونکا دینے کے لیے کافی تھی لیکن یہاں تو معاملہ ڈاکٹر حسین فراقی جیسے محقق کی مصلحتی نظروں میں آ گیا،

جنہوں نے انتہائی ہار یک جہی اور عرق ریزی سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا۔ انہوں نے بے شمار حوالوں، دونوں صید مغلوں کی یکسی نقل اور جید محققین کی آراء سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اصل میں جناب یوحنا دہلی سے چلایا جانے والا نسخہ ہی ہے جسے تدریسی سینہ زہری کے ساتھ پھیلائے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح اصل صورت حال اس حقیقی کتابچے کے بعد پیمتوں اور داغوں سے بھری ہوئی نظر آنے لگی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر سید مصین الرحمن کے پاس ان حقیقی موٹکالوں کا کیا جواب ہے اور ان کی طرف سے خاموشی یا نیم رضامندی کی صورت میں اولیٰ و ذریعے اس مرض کا کیا علاج مجموعہ کرتے ہیں؟

(الخلاصہ احمد دہلی۔ "قلمی دہلی"۔ روزنامہ "دن" لاہور۔ ۳۱ مئی ۲۰۰۰ء)

حصہ چہارم: متفرقات

- اپنی بات --- ادارہ ماہ نامہ "تخلیق" لاہور
 روشنی کا سفر، احمد حیدروس کا تعاقب --- ادارہ ماہ نامہ "سورج" لاہور
 اقتباس از انٹرویو
 اقتباس از انٹرویو
 اقتباس از مضمون
 اقتباس از "غالب کے نام ایک خط"
 انجمن تحفظ ناموس غالب ورثہ احمد صدیقی کے پمفلٹ
 پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی جانب سے تحقیقات کا حکم
 ویج این غالب کانٹری لاہور
 "انجمن خیال"
 نقلیس
 ڈاکٹر حسین فراقی
 پروفیسر جعفر بلوچ
 ہفتہ مفراتی

اپنی بات

”تخلیق“، لاہور سے شائع ہونے والا ایک اہم اور معتبر ادبی رسالہ ہے۔ محترم انکمپاچہ صاحب (جو اس رسالے کے ایڈیٹر ہیں) نے جون ۲۰۰۰ء کے شمارے میں ”اپنی بات“ کے عنوان سے ایک اوارہ لکھا، جس کا پورا متن پیش کیا جا رہا ہے۔

”میں تخلیق پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔ ان شاعرات سے شرمسار ہوں جن کی ادبی دیدہ دلیری کا میں نے گزشتہ ”اپنی بات“ میں احوال بیان کیا تھا اور ان پر انگلی اٹھائی تھی۔“

میرے خیال میں (اور بعد میں انجمن خیال میں آنے والے مملوط نے تائید کی) کہ ایسے واقعات ادب کو سینہ لگانے کے مترادف ہیں، اور ادب اور ادیب کا معاشرے میں جو (تھوڑا بہت) احترام رہ گیا ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔

ابھی میری تحریر کی ہازرگشت جاری تھی کہ لاہور میں ایک کتاب کا چرچا ہوا۔ حسین فراقی نے نہایت احماد سے کتاب چھاپ کر بے حد بیچیں سے مصین الرحمٰن کے سرتے کا ذکر کیا ہے۔

حسین فراقی کی تحقیق کے مطابق غالب کے دیوان کا وہ نسخہ، جسے مصین الرحمٰن نے دار ”مملوط“ ظاہر کیا ہے، دراصل پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری کیا گیا ہے۔

حسین فراقی نے اپنے تئیں بہت سے ثبوت بھی پیش کیے ہیں۔ کسی بھی غیر جانب دار شخص کو اس واردات کو مان لینے میں تامل ہو سکتا ہے۔ مصین الرحمٰن سینئر استاد ہیں۔ حسین فراقی کے بارے میں اپنے پرانے سب کی جیسی رائے ہے، وہ کسی ادبی دھڑے بندی یا یونیورسٹی اساتذہ کی کسی متنی سیاست میں شریک نہیں رہے۔ وہ ایسے شاعر اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مریجاں مرغ، وضع دار اور شریف انفس ہیں۔

معین الرحمن کے بارے میں میرے جیسے کم علم لوگوں کو یہی حسن ظن رہا ہے۔
میں اس واقعے پر شاید اظہار خیال نہ کرتا، مگر چند دن پہلے ایک قومی اخبار میں
مقام میں مقیم لطیف الزماں کا انٹرویو چھپا ہے۔ ایک زمانہ نہ صرف ان کی تحقیق و جستجو کا
قائل ہے بلکہ انھیں غالب پر سند (اتحادی) کا درجہ دیا جاتا ہے۔

لطیف الزماں نے بھی حسین فراقی کی صابت کی ہے اور معین الرحمن کی وہ چار اور
"چہریاں" بھی گنوا دی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے 'جہاں میں نے عداوت محسوس کی' کہ اگر
ایک مستحضر تعلیمی ادارے کے شعبہ اردو کا سربراہ کوئی ادبی تہیہ کر سکتا ہے۔۔۔ تو جہد جہد
آٹھ دن کی پیدا ہونے والی شاعرات پر کیا الزام۔۔۔؟

ان سے، اور "مخلیق" کے پڑھنے والوں سے معافی۔۔۔ سو ہار معافی۔
میرا اس نسل سے تعلق ہے، جس نے ادب کے گج معنوں میں عالم، فاضل، جید
اور تالیف روزگار شخصیات کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان میں بھی ادبی مناقشے چلتے تھے، مگر
ایسی چوری چکاری، سرقت اور دیدہ دلیری کی پاس تک ان کی محفلوں اور ان کے آس پاس
نہیں پہنچ سکتی تھی۔

دوستو! آؤ اب مل کر ادب کی صالح قدروں اور حسین روائیوں کے لیے دعائے
خیر کریں!

انا لله وانا اليه راجعون

انکسیر جاوید

روشنی کا سفر، اندھیروں کا تعاقب

تسلیم احمد تصور

برسوں ادھر کی بات ہے "سورج" کا پہلا ادارہ نکلا گیا۔ عنوان تھا "روشنی کا سفر، اندھیروں کا تعاقب"۔ روشنی کا یہ سفر طلب برداری نے شروع کیا تھا۔ طلب کی طرف سے حوام کے لیے۔ پھر طالب علمی کا زمانہ تو گزر گیا مگر روشنی کا یہ سفر جاری رہا۔ روشنی جو سچائی ہے، زندگی ہے، محبت ہے۔

اور پھر..... "سورج" کے غالب فہر کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔ تیاریاں آخری مرحلے میں تھیں کہ جب واقعہ ہوا۔ بھارت کے معروف غالب شناس آنجنائی پرتھوی چندر کی ماہے ناز تالیف "جاگیر غالب" ایک صاحب معین الرحمن نے، جو کورنٹس کالج لاہور میں پڑھاتے ہیں، اپنے نام سے شائع کر دی۔ "سورج" نے اس اندھیر گردی کا پردہ ہوں چاک کیا کہ "جاگیر غالب" کا اصل نسخہ اصل مولف کے نام سے "غالب فہر" میں شامل کر دیا۔ گو جمل سازی اور دیدہ دلیری کی یہ ایسی کھلی واردات تھی جس کی صفائی میں بظاہر کچھ کہنا ممکن نہیں تھا، پھر بھی بے ضابطگی کے اس مرکب کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہے تو "سورج" کے صفحات اُس کے لیے حاضر ہیں۔

یہ سب کچھ ۱۹۹۶ء میں ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ موصوف سے جواب نہ بن پڑا۔ ہم نے بھی درگزر سے کام لیا کہ ہمارا مقصد محض ریکارڈ کی ذمہ داری تھا، کچھ اچھا لانا برکز نہ تھا۔ مگر صاحب ملت کوئی بھی ہو، بُری ہوتی ہے۔ ان دنوں معین الرحمن، ایک اور کرنی کے ہاتھوں سمیٹے سمیٹے پھرتے ہیں۔ "دیوان غالب، نسخہ لاہور" جو پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری سے چوری ہو گیا تھا، "نسخہ طوبہ" کے عنوان سے شائع کر کے اقرار ہے تھے کہ ممتاز حقیق ڈاکٹر حسین فراقی نے چا پکڑا۔ خوب ٹھوٹھو ہوئی۔ اسی لے وے میں "جاگیر غالب" کا تذکرہ بھی رہا۔ ہم نے ابتدا ہی میں معین الرحمن سے محض اس قدر

پوچھا تھا کہ ”ہاکیمر غالب“ کو ہتھیانے کا آپ کے پاس کیا اخلاقی جواز تھا؟ اس ایک سٹری سوال کا ایک سٹری جواب تو موصوف ہمیں آج تک بھجوا نہ سکے، مگر پوری کتاب لکھ ماری، جس میں ہمیں چاہل نظیرانے اور ”سورج“ کے ”غالب نمبر“ میں ہدف کی غلطیاں گنوانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ کاش! وہ باتیں بتانے کے بجائے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اب بھی اعتراف جرم کر لیتے۔

مگر کہاں — کوئی ایک بات ہو تو کی جائے، ہاکیمر غالب، نمونہ مسروقہ، بشری رابطہ کا مقالہ رشید احمد صدیقی کی تصویر۔ معلوم ہوا موصوف کا جملہ اعمال ایسی بہت سی سیاہ کاریوں سے بھرا ہوا ہے۔ تمام زندگی بیکی وطیرہ رہا۔ اپنے ہاتھ پاؤں بلانے کے بجائے دوسروں کے چہانے ہوئے نوالوں سے چپٹ بھرا جائے..... کج ہے، جموٹی شہرت کی ٹھوک کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ خدا رحم کرے۔

برصغیر کے ممتاز ماہر لسانیات و غالبیات سید قدرت نقوی گزشتہ دنوں ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ ان کے ہارے میں ہمارے دوست معروف قانون دان، کالم نگار اور شاعر ظفر علی راہا کی خوبصورت تحریر بھی شامل اشاعت ہے۔ جناب نقوی مرحوم کی آخری تصنیف وہ کتابچہ ہے جو انھوں نے ”دیوان غالب، نمونہ نمونہ یا نمونہ سرا“ کے عنوان سے لکھا تھا اور جس کا جواب مصین الرحمن پر آج بھی قرض ہے۔ ایسے بہت سے دوسرے قرضہ جات کی طرح جن کی ادائیگی ان صاحبی دامن بھی نہیں کر سکتا۔

..... ”سورج“ زندگی کی علامت ہے اور زندگی کے تمام رنگوں کا ترجمان، پھر بھی زیر نظر شمارے کا غالب رنگ، غالب قرار پایا ہے۔ غالب دوستوں کو مبارک ہو۔

خلیل الرحمن داؤدی کے انٹرویو سے اقتباس

سوال: پاکستان میں غالب شہابی کے باپ میں ہونے والے کام سے آپ کہاں تک مطمئن ہیں؟

جواب: جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت نصیحت ہے۔ ڈاکٹر سید مصیم الرحمن کے مرتبہ ”دیوان غالب، نسخہ لاہور“ کے سلسلے میں ڈاکٹر حسین فراقی صاحب نے جس بحث کا آغاز کیا، اس سلسلے میں جن معتبر شخصیتوں کی کاوشیں منظر عام پر آئیں، وہ سرمایہ غالبیات میں گراں قدر اضافہ ہے۔ جناب لطیف الزمان خاں صاحب، ڈاکٹر عارف ناقد صاحب، سید قدرت نقوی صاحب وغیرہ نے اپنی نگارشات سے اس بحث میں حصہ لے کر بڑا اطمینان بخش مواد پیش کیا ہے۔ پاکستان سے دہجہ اول کے کم از کم تین غالب شناس ایسے پیدا ہوئے جن کی نظیر، وہ خود ہیں۔ وہ غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام اور مالک رام ہیں۔ وہ دیتوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ نئی نسل کے کھیلے والوں میں بھی بڑی صلاحیتیں موجود ہیں جو سامنے آ رہی ہیں۔ بالخصوص ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنی پہلی کوشش میں ہی غالب شہابی کا لوہا منوا لیا ہے اور انھوں نے برسوں میں حاصل ہونے والی منزل کو ایک رشتہ میں ہی پایا ہے، جس کے لیے ڈاکٹر سید مصیم الرحمن لائق حسین وحمید ہیں کہ اگر ان کا دیوان غالب نسخہ لاہور منظر عام پر نہ آتا تو ڈاکٹر حسین فراقی کو بھی غالب شہابی کے سلسلے میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہ ملتا۔

سوال: ان دنوں پاکستان میں دیوان غالب کے ”نسخہ لاہور“ کے حوالے سے بحث مباحثہ کی فضا گرم ہے۔ اسی ضمن میں آپ اپنے موقف سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: ”دیوان غالب، نسخہ خولید“ مرتبہ ڈاکٹر سید مصیم الرحمن کے سلسلے میں میری رائے کا اظہار ڈاکٹر حسین فراقی صاحب ”دیوان غالب نسخہ خولید“ اصل حقائق میں کر چکے ہیں جس کے جواب میں ایک کتابچہ ڈاکٹر سید مصیم الرحمن بعنوان ”دیوان غالب نسخہ خولید“ صحیح صورت حال“ شائع فرما چکے ہیں، لیکن سید صاحب سوموف نے فراقی صاحب

کے بے شمار دینی اعتراضات میں سے کسی ایک اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا ہے، بلکہ

جواب خط پہ وہ غور مسلسل
گھیریں گی بنا کر رہ گئے ہیں

ابنہ ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کے اعتراضات کی کلیتہاً تائید کے علاوہ مزید
اعتراضات وارد کرتے ہوئے ملک کے معتدّر ارباب فضل و کمال نے اعلیٰٰ نکتہ الحق
کے ضمن میں غالب شہابی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مثلاً لطیف الزماں خاں صاحب، ڈاکٹر
عارف عاقب صاحب، سید قدرت نقوی صاحب وغیرہ کی نگارشات لائق داد ہیں۔ ڈاکٹر
سید معین الرحمن نے ان میں سے کسی کا جواب نہیں دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان
حضرات کے اعتراضات اس درجہ مدلل، مثبت اور مسکت ہیں کہ سید صاحب کے پاس ان
کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ ملکی دنیا کے بڑے بڑے جغادری محققین سے ہمدردی ہے
جنہوں نے "نسخہ خوبہ" کی کاوش ترتیب و تدوین کو داد دیتے ہوئے معین صاحب کی شان
میں جو قصائد کہے تھے اور معین صاحب نے ایسے ۵۰، ۶۰ متنازع اہل قلم کی آراء کو جمع
کر کے "نسخہ خوبہ حسین و تجزیہ" کے عنوان سے اپنی مستقل تصنیفات و تالیفات میں شامل
کر لیا ہے۔ معین صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسے شغلیں خوفناک، اندھ ہناک،
کریاک، افسوسناک اور شرمناک اعتراضات کی دھول جلد ہی چٹھہ چائے گی۔ لوگ بھول
جائیں گے اور میری کتاب "نسخہ خوبہ۔ حسین و تجزیہ" باقی رہے گی اور آئندہ نسلوں کو یہی
ملے گا۔ نسخہ خوبہ کے سلسلے میں اپنی رائے کے اظہار کے لیے میں "السبق الاول" ہوں
جس نے سب سے پہلے یہ انکشاف کیا تھا کہ سید معین الرحمن صاحب نے جو نسخہ مرتب کیا
ہے، وہ پنجاب یونیورسٹی والا وہی نسخہ ہے جس پر سید عبداللہ نے "ماہ نو" میں مضمون لکھا
تھا۔ سید معین الرحمن نے یہ نسخہ کسی کھاڑی سے خریدنے کی جو کہانی گھڑی ہے، وہ کذب
بیانی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کہانی میں دیوان غالب کے متنازع خطوط کے علاوہ تین
مطبوعہ اور دو دوسرے خطوط بھی تھے۔ حالانکہ ان پانچوں کتابوں کا دیوان غالب سے
کوئی تعلق نہ تھا، اور نہ نسخہ خوبہ کی ترتیب و تدوین میں ان میں سے کسی کتاب کو بطور
ماخذ استعمال کیا ہے، لیکن اس کے باوجود سید معین الرحمن صاحب نے ان پانچوں کتابوں
کو بھی نسخہ خوبہ کے آخر میں اپنے ماخذات میں شامل کیا ہے۔ غالب سید صاحب "ماخذ"

کے معنی نہیں سمجھتے ہیں۔ مطلقاً غیر متعلق کتابوں کو مآخذات کی فہرست میں صرف وہی شخص شامل کر سکتا ہے جو اصول ترتیب متن کی مہارایت سے بھی بے بہرہ ہو گا۔ تلف کی بات ہے کہ سید صاحب موصوف نے ان غیر متعلق ۵ کتابوں میں سے ایک خطوط ”معارف الہیہ“ کی نسبت تحریر فرمایا ہے:-

”۳۔ قاری خطوط، معارف الہیہ ۴، (قلمی ۱۳۸۶ء) ملا مصین الدین داماد کاشفی (وفات ۱۵۰۱ھ)۔“

سید مصین الرحمن صاحب نے ”معارف الہیہ“ کے سلسلے میں صرف یہی معلومات مجھ پہنچائی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سید مصین الرحمن صاحب خطوطات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ معلوم نہیں ”معارف الہیہ“ کے خطوط کو اتنا نادر کیوں سمجھا ہے۔ وجہ ندرت تو کوئی بتائی نہیں۔ انھیں قانع علم نہیں کہ ”معارف الہیہ“ فی ہاراج الفتوح متعدد پار شاخ ہو چکی ہے اور اس کے قلمی نسخے بھی بکثرت دستیاب ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کا کوئی قلمی نسخہ اس وقت اہم و نادر ہوتا ہے جب کوئی وجہ ندرت ہو۔ مثلاً خط مصنف ہو، کسی نامور عالم یا ممتاز خطاط کے قلم کا شہکار ہو یا قدیم الکتاب ہو، وغیرہ وغیرہ۔ ”معارف الہیہ“ کے سلسلے میں سید صاحب نے ایسی کسی ندرت کی نشان دہی نہیں فرمائی ہے۔ حد یہ ہے کہ مولف کا نام بھی غلط لکھا ہے۔ اس سلسلے میں دو مختلف شخصیتوں کے ناموں کو غلط کر دیا ہے۔ ”معارف الہیہ“ کے مولف کا نام مصین الدین محمد المستقر۔ مصین مسکین فراہی متوفی ۹۰۷ھ یا ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ مصین الرحمن صاحب نے مولف مصین الدین کے نام کے ساتھ ”داماد الکاشفی“ لکھا ہے۔ یعنی آدھا نام صحیح ہے اور آدھا غلط، جو ایک دوسری معاصر شخصیت ملا مصین داماد الکاشفی متوفی ۹۱۰ھ مولف ”تفسیر حقیقی“ کا ہے۔ اس کے نام سے داماد الکاشفی، نکال کر مصین الدین کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔ مصین الدین، صاحب ”معارف الہیہ“ فراہی تھے، ہر وہی تھے لیکن کاشفی ہرگز نہیں تھے۔ کاشفی تو ملا مصین داماد ہی ہیں، مصین الدین نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ”معارف الہیہ“ کے سامنے بریکٹ میں ”قلمی ۱۳۸۶ء“ لکھا ہے۔ اس زمانے میں سو کتابت عیسوی نہیں بلکہ ہجری مروج و مستعمل تھا اور ہجری سن ہی لکھا جاتا تھا۔ بے شک ۱۳۸۶ء / ۸۹۱ھ کے مطابق ہے جو ”معارف الہیہ“ کا سال تصنیف ہے نہ کہ سو کتابت۔ ”معارف الہیہ“ کا دنیا بھر میں کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے جو ۱۳۸۶ء مطابق ۸۹۱ھ میں کتابت کیا گیا ہو۔ سید مصین الرحمن

صاحب نے سنہ تصنیف ۸۹۱ھ کو ہنزی کی مدد سے یا کسی کتاب سے ۱۲۸۶ء کا کرشمہ قلمی ۱۲۸۶ء لکھ دیا۔ اسی طرح سید صاحب نے ملا صمیم الدین کے سامنے بریکٹ میں (وفات ۱۵۰۱ء) لکھ دیا ہے۔

دقی اعتراض یہاں بھی ہے کہ مولف کی وفات ۹۰۷ھ لکھنے کے بجائے ۱۵۰۱ء لکھ دیا ہے۔ مولف کی وفات ۱۵۰۰ء / ۹۰۷ھ یا ۱۵۰۳ء / ۹۱۰ھ باختلاف اقوال ہے۔ حاصل یہ کہ سید صمیم الرحمن صاحب نے ”معارج الملوک“ کے مخطوطے کے سلسلے میں اس کی کوئی وجہ قدرت و اہمیت بیان نہیں کی ہے اور جو معلومات میا کی ہیں وہ غلط ہیں۔ دراصل سید صاحب کسی مخطوطے کو سمجھنے اور اسے مرتب کرنے کی صلاحیت سے عاری ہیں، اسی لیے ان کے مرتبہ ”نور خواجہ“ میں لغزشوں کی بھرمار ہے، جن کی نشان دہی متحدہ اہل قلم کر چکے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ”سورج“ لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

لطیف الزماں خاں کے انٹرویو سے اقتباس میں نے وہی کچھ کیا ہے، جو عشق کا نقاشا تھا

سوال: غالب کے نام پر چوتھی جلد سازی کیا ہوئی؟

جواب: غالب کے ساتھ چوتھی جلد سازی لاہور میں ہوئی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان غالب کے دو نسخے تھے۔ ایک ”نسخہ لاہور“ اور دوسرا ”نسخہ شیرانی“۔ یہ دونوں نسخے وہاں سے پراسرار طور پر چوری ہو گئے۔ ۱۹۸۳ء میں جب میں علی گڑھ گیا تو مجھے پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے بتایا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر ڈاکٹر سید مصیم الرحمن ایک ایسے دیوان غالب کو چھپوانا چاہتے ہیں، جو خوبہ منظور حسین کی ملکیت ہے۔ اسلوب احمد انصاری کا کہنا تھا کہ خوبہ منظور حسین ساری عمر علی گڑھ میں رہے، انھوں نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا کہ ان کے پاس غالب کا کوئی مخطوط یا دیوان موجود ہے۔ اس لیے ہم نے علی گڑھ سے وہ دیوان شائع نہ کیا اور ڈاکٹر سید مصیم الرحمن سے معذرت کر لی۔ یہاں سے باہر ہونے کے بعد ڈاکٹر سید مصیم الرحمن نے اس دیوان کو ”نسخہ خوبہ“ کے نام سے شائع کر دیا۔ یہ نسخہ دراصل پنجاب یونیورسٹی سے غالب ہونے والا ”نسخہ لاہور“ ہے، جس کا تحارف ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی اپنے متعدد مضامین میں کرا چکے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ڈاکٹر مصیم الرحمن جلد ہی ”نسخہ شیرانی“ بھی کسی اور نام سے سامنے لے آئیں گے۔ حال ہی میں ڈاکٹر حسین فراقی نے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، جس کا نام ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ اصل حقائق“ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ”نسخہ خوبہ“ درحقیقت ”نسخہ لاہور“ ہی ہے، جسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے چھپایا گیا تھا۔ میں ڈاکٹر حسین فراقی کو اس جرأت مندانہ تحقیق پر دلاؤ دیتا ہوں۔

سوال: گویا کہ آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر سید مصیم الرحمن نے تحقیقی جمل

سازی کی ہے؟

جواب: صرف یہی نہیں، ڈاکٹر سید مصین الرحمن نے اور بھی بہت سے کمالات دکھائے ہیں۔ مثلاً وہ خود کو رشید احمد صدیقی کا شاگرد کہتے ہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی ایک تصویر پیش کرتے ہیں جو سراسر جعلی ہے، کیونکہ رشید احمد صدیقی کبھی پاکستان نہیں آئے اور مصین الرحمن بھارت نہیں گئے، پھر یہ تصویر کہاں اور کیسے بنی؟ ”مذکر نگار صدیقی“ نامی کتاب میں ڈاکٹر مصین الرحمن نے لکھا ہے کہ انھوں نے گھنٹو، علی گڑھ اور الہ آباد کی جامعات میں تعلیم پائی۔ میرے نزدیک اس سے بڑا جھوٹ اور کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ مصین الرحمن بھی بھارت گئے ہی نہیں تو انھوں نے وہاں سے تعلیم کیسے حاصل کر لی۔ مصین الرحمن نے پرتھوی چندر کی کتاب ”جامگیر غالب“ کو بھی اپنے نام سے چھپوا لیا تھا، جس پر میں نے ماہنامہ ”سورج“ لاہور کے غالب فہر میں یہ کتاب اصل حالت میں شائع کر دی، جس نے اس سرتے کا پل کھول دیا۔ میں نے ”مخلوط رشید احمد صدیقی“ جلد دوم کے دیباچے میں لکھا ہے کہ مصین الرحمن نے ایک طالب بشری باسط کے مقالے ”ابو جعفری، شخصیت و شاعری“ کو اپنے نام سے ”نقوش“ میں شائع کرایا ہے۔ مصین الرحمن ابھی تک اس کی تردید نہیں کر سکے۔ مصین الرحمن نے ایک کمال یہ بھی کیا کہ رشید احمد صدیقی کے ان خاکوں سے نیلے اڑا کر، جو انھوں نے وفات پا جانے والی مختلف شخصیات پر لکھے، رشید احمد صدیقی پر ان کی وفات کے بعد خاکہ لکھ دیا۔ مصین الرحمن کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس میں اقتباسات تو رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے لیے گئے ہوتے ہیں، لیکن دخلہ نیلے مصین الرحمن کے نکل آتے ہیں، تاکہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ وہ تحریریں ان کی ہیں۔

سوال: کیا آپ خود کو غالب اور رشید احمد صدیقی کا دفاعی خدمت گزار سمجھتے ہیں؟

جواب: میں یہ بات علی الاعلان کہتا ہوں کہ مجھے غالب سے عشق اور رشید احمد صدیقی سے عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی اچھی دلوں شخصیات کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ غالب یا رشید احمد صدیقی کے نام پر ہونے والی جمل سازجوں کو منظر عام پر لانا اس لیے ضروری ہے کہ ادبی تاریخ کا چہرہ مسخ ہونے سے محفوظ رہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک شخص دستاویزی طور پر سرتے، جعل سازی اور دھوکہ دہی کا مرتکب ثابت ہو چکا ہے، لیکن نہ تو پنجاب یونیورسٹی کا چانسلر اس کے خلاف کوئی

کارروائی کرتا ہے اور نہ پبلک سروس کمیشن کا فیئر مین اس سے باز پرس کرتا ہے کہ لابی
بند پائی کرنے والا شخص کیونکر پبلک سروس کمیشن میں پیشہ کر دیا۔ اندازاً وہ فیصلے کر سکتا ہے۔

(مطبوعہ "نیو یورک" روزنامہ "پاکستانی"۔ ۱۴ مئی ۲۰۰۰ء)



ظفر علی راجا کے مضمون سے اقتباس

..... ان کی زندگی کا آخری غالب معرکہ ڈاکٹر معین الرحمن کے ساتھ ہوا۔ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے ۱۹۹۸ء میں دہلی غالب کے ایک مخطوطے کو ”دعایاں غالب، نسو، خوبہ“ کے نام سے مدون کیا تو غالبیات کے بہت سے طالب علموں نے اس کام کی حقیقی دیانت پر انگشت تنقید بلند کی اور موقف اختیار کیا کہ ”نسو، خوبہ“ دراصل پہلے سے دریافت شدہ ”نسو، لاہور“ ہی کا ایک مسروقہ ایڈیشن ہے۔ سید قدرت نقوی نے نسو، خوبہ کو تصحیح کرنے والے احباب قلم غلیل الرحمن داؤدی، ڈاکٹر حنیف نقوی، رشید حسن خان اور حسین فراقی کے موقف کی حمایت میں ایک طویل تحقیقی جائزہ سپرد قلم کر کے شائع کر دیا۔ یہ کتابچہ ان کی موت سے چار ماہ قبل شائع ہوا تو انہوں نے اس کے اولین نسخوں میں اسے ایک نسخہ بطور خاص کراچی سے میرے نام لاہور بھجوایا۔ قدرت نقوی نے اس تحقیقی کتابچے میں مضبوط دلائل کے ساتھ ”نسو، خوبہ“ کو ایک مصلحت آمیز اور قاش لغزش قرار دیا ہے۔

ابھی تک بحر کے ادبی اور علمی حلقوں میں قدرت نقوی کے اس آخری غالب معرکہ کی گونج ”غالب آگئی“ کے نئے مباحث کے دروازے کھول ہی رہی تھی کہ انہیں قدرت کی طرف سے آخری بلاوا آ گیا۔

(مطبوعہ ناچانہ ”صورج“ لاہور۔ جنوری ۲۰۰۹ء)

”غالب کے نام ایک خط“

مبین مرزا

..... ہاں آخر میں آپ کی تالیف قلب کے لیے یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ وہ جو نسخہ ڈاکٹر سید مصححین الرحمن صاحب نے ”نسخہ خواہیہ“ کے نام سے دریافت کیا ہے، اس پر یہاں خاصی لے دے ہوئی۔ اول اول اس کی پڑیرائی ہوئی، ڈاکٹر مصححین الرحمن نے جو داد تحقیق دی، اس پر لوگوں نے خوب داد کے ڈنگرے برساتے، لیکن اسی دوران کسی طرف سے ایک آواز اٹھی کہ یہ نسخہ نئی دریافت نہیں تھا، مال مسروق ہے۔ اس پر پرچار لوگ غم ٹھونک کر تحقیق میں جٹ گئے۔ کئی ایک نے کام کیا اور بھی کم و بیش ایک نتیجے پر پہنچے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ بھائی حسین فراقی، کہ چاند پنجاب میں استاد ہیں اور استادوں کی جوتیاں سیدھی کیے اور تختیں اٹھائے ہوئے ہیں، وہ بھی اس مسئلے کی طرف متوجہ ہوئے۔ قیام لاہور کے زمانے سے ان سے گاڑی چلتی ہے، میں ان کا حراج آشنا ہوں۔ وہ محقق بھی ہیں اور منتقل بھی۔ سو انھوں نے تحقیق کے بعد اس نسخے کے نئی دریافت ہونے کے رد اور مال مسروق ہونے کے ثبوت میں ایک مدلل رسالہ رقم کیا، اور خوب رقم کیا۔ اہل نظر نے داد دی کہ یہی داد و لاء احسین فراقی آپ سے یک گوشہ محبت رکھتے ہیں اور سچ کہتا ہوں کہ انھوں نے اس تحقیق میں حقیقی محبت کا ثبوت دیا۔ وہ کام جو آپ کی آل اولاد میں (بشمول بھائی جمیل الدین خاں عالی اور میں) کوئی نہ کر سکا، وہ حسین فراقی نے کیا، اور انہوں سے بڑھ کر بھائی۔ اس کے بعد ایک واقعہ اور ہوا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر مصححین الرحمن نے حسین فراقی کے رسالے کے رد میں ایک رسالہ سپرد قلم کیا جو نذر گناہ کا مصداق ٹھہرا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے حسین فراقی کے مدلل اور تحقیقی دلائل

اور اعتراضات کا جواب کوسلوں اور طعنوں سے دیا۔ نیچے! ایک موقع اور پاروں کے ہاتھ آ گیا۔ جو پہلے نہ ہوئی، اب وہ تھڑی تھڑی بھی ہوئی، اور اب سنا ہے کہ ہندوستان سے بھی کچھ ایسے ثبوت فراہم کر لیے گئے کہ اس کے بعد تو کسی کو بھی حسین قرانی کے موقف کو درست ثابت کرنے میں کوئی تامل نہیں رہے گا۔

(مطبوعہ ماہنامہ "سورج" لاہور۔ فروری ۲۰۰۱ء)



”انجمن تحفظ ناموس غالب و رشید احمد صدیقی“ کی جانب سے سنہ ۲۰۰۰ء میں کچھ پمفلٹ اہل علم ادیبوں اور دانشوروں کو بھیجوائے گئے۔ آج تک معین الرحمن ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ یہ پمفلٹ اہل علم و ادب کو دعوت فکر بھی دیتے ہیں اور معین الرحمن کی جعلسازی کا پردہ بھی چالہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

اہل علم و ادب کو مژدہ ہو

اہل علم و ادب کو مژدہ ہو کہ پہلی بار ڈاکٹر معین الرحمن نے لب کشائی کی ہے اور ”دیوان غالب نسخہ خلیفہ“ کے حوالے سے اٹھائے گئے سوالات اور کیے گئے اعتراضات کا ضمناً جواب دیا ہے، جو جواب کم اور جعل سازی کا اعتراف زیادہ ہے۔ اللہ عز و جل کرے ڈاکٹر حسین فراقی کی! کہ انھوں نے ادب پر اور تاریخ ادب پر احسان کیا اور ایک علمی و تحقیقی بحث کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے ”دیوان غالب نسخہ خلیفہ“ جسے ڈاکٹر معین الرحمن نے اپنی جعلی سازی سے مرعوب کر دیا ہے، کے جواب میں ایک مدلل اور نہایت واضح اعتراضات پر مبنی ایک مختصر کتاب تحریر کی، جس کا عنوان تھا ”دیوان غالب، نسخہ خلیفہ۔ اصل حقائق۔“ ڈاکٹر معین الرحمن نے اس کے جواب میں ایک کتابچہ تحریر کیا، عنوان تھا ”دیوان غالب، نسخہ خلیفہ۔ حج صورتہ حال۔“ ڈاکٹر معین الرحمن نے اس کتابچے میں ڈاکٹر حسین فراقی کے کسی اعتراض اور کسی سوال کا جواب واضح طور پر نہیں دیا۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے مدلل اور علمی انداز اپنایا، جبکہ ڈاکٹر معین الرحمن نے عامیانہ انداز اپناتے ہوئے منہ سے جھاگ اڑائی ہے۔ اپنے اس مختصر کتابچے کو ڈاکٹر معین الرحمن نے ایک دفعہ پھر دوسروں کے اقتباسات سے بھر دیا ہے، اور جملہ مستترضہ کے طور پر اپنی چند سطریں بھی لکھ دی ہیں۔ دراصل معین الرحمن صاحب ”علمی دے“ کے داغی مریض ہیں۔ ایک جملہ لکھ کر ان کی سانس پھول جاتی ہے اور وہ فوراً کسی دوسرے کے اقتباس یا قول کا سہارا لیتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ایک دے کے مریض کو مصنوعی آکسیجن کا سہارا لینا پڑتا

ہے۔ معین الرحمن صاحب کی مرتبہ کتب کی ایک طویل نام لہاد فہرست میں سے اگر ان کے اپنے جملے نکالے جائیں تو شاید مشکل سے ایک ایسا ہی کتابچہ تیار ہو سکے گا جیسا انہوں نے ”دیوان غالب، نسخہ خولہ“ کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔ باقی ان کا سارا کام دوسروں کا کیا ہوا ہے جسے انہوں نے بار بار اپنی مرتبہ کتابوں میں چھپی اور گوشت کی حد سے لگایا ہوا ہے۔

درا ایک نظر ان کے مذموم کارناموں پر ڈال لیجئے۔ یہ کارنامے نہیں، اہل علم و ادب کے دلہنوں میں سکتے والے سوال ہیں۔ کیا ڈاکٹر معین الرحمن پرائیٹ ٹو پرائیٹ ان کے جواب دیں گے؟

۱۔ ”دیوان غالب، نسخہ خولہ“ کے سلسلے میں یہ تو معین الرحمن نے تسلیم کیا ہے کہ عرشی صاحب کا نسخہ عرشی طبع دوم ”اپنے مضمولات اور کوائف کی تفصیل کے اعتبار سے زیر نظر نسخہ خولہ کے کم و بیش میں مطابقت ہے۔“ ”قاضی عہدودود نے مخطوطہ ”دیوان غالب“ (کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور) کے بارے میں جو تصدیقات رسالہ ”نقش“ (لاہور۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء) میں پیش کی ہیں، بڑی حد تک ”نسخہ خولہ“ پر صادتی آتی ہیں۔“

دراصل ”مخطوطہ دیوان غالب، کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور سے چوری ہو گیا اور ”نسخہ شیرانی“ بھی غائب ہو گیا۔“ ڈاکٹر معین الرحمن جسے ”نسخہ خولہ“ کہہ رہے ہیں، وہ دراصل مخطوطہ ”دیوان غالب“ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، لاہور ہی ہے۔ کیا جب کچھ حرمہ کے بعد ایک اور ”دیوان غالب“ مرتب کیا جائے اور وہ نسخہ شیرانی ہو۔ اب ایسی معیضیں آگئی ہیں کہ کوئی بھی شخص با آسانی ”نسخہ دینا“ کے نیچے دانش گاہ پنجاب لاہور کی مہر دیکھ اور پڑھ سکتا ہے۔ یہ غالیات کے سلسلے میں سب سے بڑی اور تازہ جھلساڑی ہے۔

۲۔ ڈاکٹر معین الرحمن نے غالب کے چار جعلی خطوط بھی متعارف کروائے ہیں۔ یہ خطوط ان کے تعارف کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ چاروں طفیل صاحب ایڈیٹر ”نقش“ نے بتایا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن کے پاس ملائی کی ڈائری ہے۔ اس میں یہ چار خطوط موجود ہیں۔ آفاق حسین

آفاق نے ۱۹۳۹ء میں "نادرست غالب" کے نام سے خطوط کا مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ مصین الرحمن کہتے ہیں کہ اگر ان کے متعارف کردہ خطوط جعلی ہیں تو "نادرست غالب" کے خطوط بھی جعلی۔ کبھی کیا جواز ہے؟ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے "غالب نامہ" دلی میں، متعارف خطوط کے بارے میں سوال اٹھایا کہ source کیا ہے؟ فوراً ہی مصین الرحمن کو ایک کھاڑیہ مل گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے "دیوان غالب، نسخہ کونہ" کا source کوئی نامعلوم کھاڑیہ ہے۔ کیا مصین صاحب اتنا بھی ضعیف جانتے کہ حقیقت میں دستاویزات پیش کرنے کے لیے شہادتوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ ورنہ حقیقت، حقیقت نہیں جعلی سازی شہر ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مصین صاحب کو کھاڑیہ کہاں سے مل جاتے ہیں؟ وہ کبھی تو خود کو گتائی میں بند کر کام کرنے والوں میں شمار کرتے ہیں اور انھم سے گھبراتے ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں "میں اپنے شوق کی چیزوں کی تلاش میں چلتے پھرتے کتابوں کے ان ڈبیروں کی خاک چھانی ہے اور گوہر مراد پائے ہیں۔" کیا کسی نے انھیں اس طرح چلتے پھرتے اور خاک چھاننے دیکھا ہے؟ اتارنگی کے فٹ ہاتھ پر جود اور اتوار کو گوہر مراد پانے والے نظر آ ہی جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مصین الرحمن کا تو کتاب سے کوئی رشتہ، کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ "نسخہ کونہ" اور خطوط غالب کے حوالے سے وہ کھاڑیہ کا نام اور پتا بتائیں گے؟

۳۔ پر تعوی چندر کی کتاب "جاگیر غالب" کو ڈاکٹر مصین الرحمن نے اپنے نام سے شائع کیا۔ لاہور سے شائع ہونے والے "سورج" کے "غالب نمبر" میں اصل "جاگیر غالب" شائع ہو چکی ہے۔ اسے دیکھ لیں اور اسی میں مصین الرحمن کے نام لطیف الزماں خان کے خطوط بھی شائع ہوئے ہیں۔ آج تک ڈاکٹر مصین الرحمن کو ان کا جواب دینے کی صحت اور اخلاقی جرات نہیں ہوئی۔

۴۔ "غالب اور انقلاب ستاد" ڈاکٹر مصین الرحمن کی کتاب نہیں ہے۔ یہ ترجمہ انھوں نے نہیں کیا۔ یہ ہمارا چیلنج ہے۔ اصل سورجماں یہ ہے کہ یہ ترجمہ جلی ہار دلی یونیورسٹی کے محلہ "اردوئے معلیٰ" غالب نمبر ۱ میں شائع ہوا، جسے مصین الرحمن نے

اپنے نام سے شائع کر لیا، اور یہ تاثر دیا کہ جیسے ”دستخط“ کا ترجمہ انھوں نے کیا ہے۔ یہ کتاب غالب انشٹیٹیوٹ دلی سے بھی شائع ہوئی ہے، جس سے یہ عقدہ نکلا ہے کہ یہ ترجمہ نامور محقق رشید حسن خان صاحب کا کیا ہوا ہے۔ مصین الرحمن نے جمل سازی سے اسے اپنے نام سے شائع کیا۔

غالب کو سمجھنا ڈاکٹر مصین الرحمن کے بس میں نہیں۔ وہ نہ تو شعر وزن میں پڑھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی تنقید کر سکتے ہیں۔ ایسا شخص غالب شناس ہونے کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے۔ اردو کو چھوڑیے! غالب کا زیادہ کلام فارسی میں ہے۔ کیا مصین الرحمن فارسی سمجھتے ہیں؟ ان کے دور کے ائمہ اسے ۱۰۰۰ نمبر کے فارسی کے پتے کا ہونا اور بات ہے، فارسی کو جانتا اور سمجھتا اور بات ہے۔ مصین الرحمن صاحب فارسی کی الف ب نہیں جانتے۔ اگر جانتے ہیں تو وہ غالب کے فارسی کلام کی شرح تحریر کریں، اور اگر ہو سکے تو اردو کی بھی۔ غالب کی تنقید میں کوئی تنقیدی مضمون لکھیں۔ محفل لوگوں کے لکھے ہوئے مضامین کو اکٹھا کر کے غالب شناس نہ بنیں۔

غالب کے بعد ڈاکٹر مصین الرحمن کو رشید احمد صدیقی صاحب سے بھی عنایت اور محبت ہے۔ ذرا اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ رشید احمد صدیقی نے جن مرحومین کے خاکے لکھے اور اظہارِ فہم کیا، مصین الرحمن نے رشید احمد صدیقی کی ایسی تحریروں سے جملے اڑائے، ایک عبارت ترحیب دی اور رشید احمد صدیقی کے انتقال پر اس عبارت کو اپنے نام اور حوالے سے چسپاں کر دیا۔

۲۔ رشید احمد صدیقی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جمل سازی سے بنائی اور مرحوم کی کتاب ”ہدیہ اردو غزل“ کی پشت پر شائع کی۔ جب لوگوں نے احتجاج کیا تو اب مصین الرحمن یہ کہہ رہے ہیں کہ ”میں نے رشید صاحب کے ساتھ اپنی ایک تصویر بھی تیار کی۔ اس پر مجھے قریب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داد ملی۔“ مصین الرحمن صاحب چونکہ ایسا کام بڑی ہنرمندی کے ساتھ کر لیتے ہیں اس لیے انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ ”لامحدودی ڈکٹٹ“ کے ساتھ بھی اپنی ایک تصویر اسی طرح تیار کر لیں۔ انھیں قریب اور دور کے خوش ذوق

دوستوں اور خاص طور پر بزرگوں سے بڑی داد ملے گی۔ (انہوں نے اصدافوں)۔

۳۔ ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن کی جہالت کا ایک صحت منظر ملاحظہ فرمائیں۔ علی گڑھ میگزین ۳۹-۱۹۳۸ء میں رشید احمد صدیقی کا مضمون ”کوئی تلاء کہ ہم بتائیں کیا“ شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ بے شکل عبارت ہے:

”مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو طلبہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا: غالب، اردو اور تاج محل“

ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن نے درج خود بقلم خود ایک اعتراض تحریر کیا اور اس عبارت کو بکھوری سے منسوب کیا۔ یہ اعتراض ”قوی زبان“ کراچی میں شائع ہوا جس شخص کو یہ علم نہیں کہ یہ عبارت بکھوری کی نہیں، رشید احمد صدیقی مرحوم کی ہے، وہ رشید احمد صدیقی سے عقیدت کا اظہار کیا کرے گا؟ وہ رشید احمد صدیقی کو پڑھنے اور پڑھانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

اس کو کہتے ہیں عالم آرائی!!

اب چند اور جملہ ساریاں اور جہالتیں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ نومبر ۱۹۹۸ء میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ نام تھا ”غیر نظیر“۔ اس کتاب کے صفر ۲۷۱ پر ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن کا مضمون بعنوان ”نظیر صدیقی بے مثل و بے نظیر“ شائع ہوا۔ مضمون یوں شروع ہوتا ہے: ”مجھے لاہور، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔“ ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن زندگی میں کبھی ہندوستان نہیں گئے، پھر انھوں نے علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے کیسے پڑھا؟ کیا مصیبن الرحمٰن بتائیں گے؟

۲۔ ایم۔ اے۔ اردو کی طالبہ بشری باسٹ کا مقالہ ”میرا جعفری شخصیت اور شاعری“ کو مصیبن الرحمٰن نے ”نقوش“ میں اپنے نام سے شائع کیا۔ اس کا جو جواز انھوں نے اپنے ترازو کتابچے میں تحریر کیا ہے، وہ اخلاقی و قانونی اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ اگر اس مقالے کے کچھ ابواب ڈاکٹر مصیبن الرحمٰن نے تحریر کیے (جس کا انھوں نے تاثر دیا ہے، ہر چند کہ وہ یہ لکھنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتے) تو پھر کبھی انھوں نے جرم کیا ہے، کہ مقالہ لکھ کر دینا اساتذہ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ ایسے ہی

ہے جیسے کمرہ امتحان میں استاد شاگرد کو پرچہ حل کرواتے۔ مقالہ بھی ۲۰۰ نمبر کا ہوتا ہے اور امتحان کا حصہ ہوتا ہے۔ اور اگر وہ مقالہ طالب نے خود لکھا (جس پر اسے ایم۔ اے۔ اردو کی ڈگری چاہی ہوئی) تو ڈاکٹر مصین الرحمن کا اسے اپنے نام سے شائع کرواتا جرم ہے۔ کسی بھی صورت میں ڈاکٹر مصین الرحمن بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کو اس جرم کا نوٹس لینا چاہیے۔ ورنہ لوگ دوسروں کے مقالوں کو اپنے نام سے شائع کرواتے رہیں گے۔

یہ تو بڑی بڑی علمی جہل سازیاں ہیں۔ ڈاکٹر مصین الرحمن ہر قسم کی جہل سازی کا دوسرا نام ہے۔ گورنمنٹ کالج جیسے ادارے کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی لائبریری سے کتاب نکلوا کر وہیں فروخت کے لیے بھجوا دیتا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے حقیقی بچے ”حقیقی نامہ“ کو اپنی تصنیفات و تالیفات کی فہرست میں شامل کرنا۔ ”حقیقی نامہ“ شائع کرنے کے تمام اخراجات گورنمنٹ کالج لاہور کے۔ مصین الرحمن اس خرچ سے ہونے والی کپور تک اور جڑی ہوئی کاپیاں اڑا کر ایک کتاب بناتے ہیں۔ مضمون وہی جو ”حقیقی نامہ“ میں شائع ہوئے ہیں۔ مرتب کے طور پر اپنا نام لکھتے ہیں۔ کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ خرچہ گورنمنٹ کالج لاہور کا، مضمون لوگوں کے، کتاب مصین الرحمن کی۔ (”نقوش غالب“ مرتبہ ڈاکٹر مصین الرحمن، اور ثبوت کے لیے ”حقیقی نامہ“ شمارہ ۳: ۱۹۹۳، ۱۹۹۵ء)۔ کیا یہ جہل سازی نہیں؟

سرکار کی طرف سے انھیں دس بیس ہزار کی رقم امداد کے طور پر ملتی ہے، وہ اپنے کارناموں میں اسے ”صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی“ کہتے ہیں، اور یہ تاثر دیتے ہیں جیسے یہ ”صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی“ ہو۔ کیا انھیں ”صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی“ مل چکا ہے؟ یہ سوال محترم محمد حسین ملک سے بھی ہے جنہوں نے روزنامہ جنگ ۲۰ مئی ۲۰۰۰ء میں ان کی مدح میں کالم لکھا۔ محمد حسین ملک صاحب کے بقول وہ ڈاکٹر مصین الرحمن کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے ”دل کی کتاب“ پر تبصرہ کر دیا ہے۔ بقول ان کے وہ ایم۔ اے۔ اردو بھی ہیں، مگر اس کالم کے آخر میں جو شعر درج ہے، وہ بھی بے وزن ہے: ”کبھی کبھی اسے پڑھا کیجئے“ کی بجائے ”گاہے گاہے اسے پڑھا کیجئے“ سوزوں

ہے۔ مجھ حسین ملک صاحب اسے درست کر لیں۔ ان کے استاد اسے درست نہیں کر سکتے
 کیونکہ ان کا اپنا اوپلی وزن درست نہیں ہے۔ انہیں صدارتی تمغا برائے حسن کارکردگی بھی
 نہیں ملا۔ ان کی تو کارکردگی ہی مشکوک ہے۔
 اہل علم کو مڑدہ ہو کہ اب خاموشی کا پردہ چاک ہو گا اور علم و ادب کے ساتھ جعل
 سازی کرنے والا ہر جعل ساز پتھر خاک ہو گا!

منجانب

انجمن تحفظ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی

محققینِ اردو کے لیے خوشگوار خبر

بادشاہِ ذرائع سے علم ہوا ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چرایا ہوا دیوانِ غالب کا نسخہ لاہور (جسے وہ ابھی تک نسخہٴ خولہ کہہ رہے ہیں) واپس چائلر پنجاب یونیورسٹی کو واپس کر دیا ہے۔ واپسی کا طریقہٴ معین صاحب کا اپنا رواجمی طریقہ تھا۔ سنا ہے نسخے کو سہاگنا کے واپس کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اہمل نیازی نے ۲۳ اگست ۲۰۰۰ کو اس نسخے کی واپسی کے بعد روزنامہ ”دن“ لاہور میں جو کالم لکھا اس کی یہ سطور بڑی دلچسپ اور معنی خیز ہیں: ”کیا کوئی کسی افوا شدہ لڑکی کو اس کے باپ کے گھر اس طرح لے جاتا ہے کہ وہ دلہن بنی ہوئی ہو جبکہ اس کے ساتھ دو بچے بھی ہوں۔“ دیوانِ غالب، نسخہ لاہور افوا شدہ دلہن تھی جسے واپس کر دیا گیا ہے۔ محققینِ اردو کے لیے تحقیق کے در وا ہوتے ہیں۔ حج ثابت ہونے کی گمزی آن بچگی۔ پنجاب یونیورسٹی کی تحقیقاتی رپورٹ واپس چائلر صاحب کو پہنچ گئی ہے۔ الزام ثابت ہو چکا ہے۔ جرم ثابت ہونے کو ہے۔ نسخے کی واپسی کے وقت تصویریں کھینچی گئیں۔ سب جانتے ہیں کہ معین صاحب کو تصویریں ”ہانے“ کا بہت شوق ہے۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ ان کی تصویر کھینچی نہیں گئی تھی، ہائی گئی تھی۔ سنا ہے نسخے کی واپسی کے وقت معین صاحب کے ساتھ عبدالجبار شاکر صاحب بھی تھے۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ عبدالجبار شاکر صاحب بھی ایسے کاموں میں مہارت رکھتے ہیں۔ حضرات! ایک کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔ کتاب کا نام ہے ”پاکستان لوٹنے والے“ مصنف مجاہد حسین ہیں۔ اس کتاب کو پہلی بار ادارہ تحقیقات لاہور نے شائع کیا۔ اس کتاب کے اب تک کل پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن پرنٹ لائن لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۰۵ پر یہ عنوان ہے ”پنجاب بینک لاہوری کو کس نے لوٹا۔“ صفحہ ۱۰۸ تک مطالعہ فرمائیں۔ عبدالجبار شاکر کی حقیقت کھل جائے گی۔ پاکستان لوٹنے والوں کی اس کہانی میں عبدالجبار شاکر صاحب کا بھی ذکر ہے۔ سن اتفاق ہے کہ یہ ذکر بھی لاہوری نے ہمارے نئے چوری کرنے کے حوالے سے

ہے۔ اب ایک مخلوط چوری کرنے والا، مخلوط چوری کرنے والے کا ساتھ نہ دے تو کیا کرے؟ چنانچہ اگر شاکر صاحب معین صاحب کے ساتھ گئے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیونکہ معین صاحب کے ساتھ کوئی ایسا آدمی تو نہیں جاسکتا تھا جس نے ہاشمی میں کوئی مخلوط چوری نہ کیا ہو۔ بہر کیف اب ”دیوان غالب، نسخہ لاہور“ برآء ہو چکا ہے۔ محققین اردو کے لیے راستہ کھل گیا ہے۔ مخلوط شناس حضرات لاہوری میں اسے دیکھ سکتے ہیں اور اس حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں کہ وہ بزرگوں کا شعارف کروایا ہوا ”نسخہ لاہور“ ہے یا معین الرحمن کی جعل سازی سے مرتب کیا گیا ”نسخہ خوب“۔ عبدالجبار شاکر صاحب چونکہ ڈائریکٹر لاہوری جہانپاب بھی ہیں، لہذا معین الرحمن کے مرتب کردہ ”دیوان غالب، نسخہ خوب“ کے جعلی نسخے کی فروخت میں بھی وہ معاون ثابت ہوئے۔ اس نسخے کی فروخت سے جو رقم معین الرحمن نے حاصل کی وہ جہانپاب یونیورسٹی لاہور کے اعلیٰ حکام کو واپس لینی چاہیے اور انھیں اس کے مزید ایڈیشن شائع کرنے سے منع کرنا چاہیے، کیونکہ قانونی طور پر معین الرحمن یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر اس کا ایک صلو بھی شائع نہیں کر سکتے۔ اگر یونیورسٹی حکام نے اس طرف فوری توجہ نہ کی تو عاصمینا غالب، عدالت سے رجوع کریں گے۔

محققین اردو کے لیے ایک خوشگوار خبر یہ بھی ہے کہ ”اورا جعفری، شخصیت اور شاعری“ کے موضوع پر لکھے جانے والے ایم اے اردو کی طالبہ بشری باسل کے مقالے (جسے معین الرحمن نے اپنے نام سے شائع کر لیا تھا) پر بھی تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں۔ ہمارا یونیورسٹی حکام سے مطالبہ ہے کہ ان دونوں ملکی جرائم کے حوالے سے معین الرحمن کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی جائے۔ جیسا کہ ادیب اور دانشور حضرات اس کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنی کتاب ”دیوان غالب، نسخہ خوب“ اصل حقائق“ صفحہ ۶۰ کے آخر پر یہ امید ظاہر کی تھی: ”وہی یہ بات کہ اس ہلکی نسخے کی بازیافت کب تک ممکن ہے، سو اس باب میں غالب کا یہ شعر بڑی امید دلاتا ہے

دیکھیے جاتے ہیں ”مضائق“ بتوں سے کیا ”فیض“

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے“

ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کو مبارک ہو کہ ان کی جدوجہد رنگ لائی اور غالب

کے عشاق نے جنوں سے فیض حاصل کر لیا۔ دیوان غالب نسل لاہور کی بازیافت ہوئی۔
 دم توڑتی ہوئی بیسویں صدی کا یہ آخری برس اچھا ہے۔ بہت اچھا ہے!

منجانب
 انجمن تحفظ ناموسی غالب و رشید احمد صدیقی



پنجاب یونیورسٹی رجسٹرار کے متنبہ کرنے کے باوجود ”نسخہ خواجہ“ ڈی ٹکس ایڈیشن کی مذموم اشاعت

ایک اطلاع کے مطابق ڈاکٹر صمیم الرحمن (صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور) نے ”دیوان غالب، نسخہ خواجہ“ (جو درحقیقت ”نسخہ لاہور“ ہے) کے متنازعہ نسخے کو ڈی ٹکس ایڈیشن کا روپ دے کر پھر شائع کر دیا ہے۔ اس نسخے کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد جو ہنگامہ اٹھا تھا، اسے پیش نظر رکھتے ہوئے پنجاب یونیورسٹی حکام نے واضح طور پر صمیم الرحمن کو ہدایات جاری کی تھیں کہ اب وہ اس نسخے کا ایک نسخہ بھی یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر شائع نہیں کر سکتے، مگر ان احکامات کی تعمیل کھلا خلاف ورزی کرتے ہوئے صمیم الرحمن نے اسے شائع کیا۔ اس بات کی تصدیق اس سے ہوتی ہے کہ یہ ڈی ٹکس ایڈیشن شائع ہونے کے بعد پاکستان کے کسی بک سٹال پر فروخت کے لیے نہیں رکھا گیا۔ صرف چند لوگوں کو اعزازی طور پر بھجوایا گیا ہے، یا ہر دن ملک فروخت کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق عبدالوہاب خاں سلیم (جو ان دنوں نیویارک امریکا میں مقیم ہیں اور جن کے مالی اشتراک کے ساتھ ڈی ٹکس ایڈیشن شائع ہوا ہے) اس نسخے کی فروخت کر رہے ہیں جس کی قیمت 1490۰ روپے رکھی گئی ہے۔

عبدالوہاب خاں سلیم کے حوالے سے حیرت انگیز معلومات سامنے آئی ہیں۔ یہ وہی صاحب ہیں جو پنجاب یونیورسٹی لاہوری میں ان دنوں لاہوری اسٹڈی تھے جب یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہوری سے چوری کیا گیا۔ اس حقیقی نسخے کے یونیورسٹی لاہوری سے غائب ہو جانے کے حوالے سے ایک اور کردار بے نقاب ہوتا ہے۔ اب صمیم الرحمن اور عبدالوہاب خاں سلیم مل کر اس نسخے سے کثیر رقم کما رہے ہیں۔ وہ رقم جو دراصل پنجاب یونیورسٹی کا حق ہے۔

سوال یہ ہے کہ صمیم الرحمن نے اس ڈی ٹکس ایڈیشن کو فروخت کے لیے پاکستان

کے کسی بک مثال پر کیوں نہیں دیا؟ صرف اس لیے کہ یونیورسٹی حکام نے اس کی دوبارہ اشاعت پر پابندی لگائی تھی اور مصنفین الرضیٰ کو ڈر ہے کہ کہیں یونیورسٹی حکام اس کی اشاعت پر نوٹس نہ لے لیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اپنے ایک تازہ بیان میں (جو روزنامہ ”پاکستان“ لاہور میں ۱۷ جنوری ۲۰۰۱ء کو جلی حروف میں شائع ہوا) یہ اعتراف کیا ہے کہ مصنفین الرضیٰ نے دیوان غالب کا اصل مخطوط مجھے پیش کرتے ہوئے مجھے دھوکے میں رکھا اور یہ کہا کہ یہ میری دریافت ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مصنفین الرضیٰ نے علم و ادب کے ساتھ بے وفائی کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے مخطوطے کا بغور جائزہ لیا تو اس میں واقعی ٹیبرنگ کی گئی تھی۔ وائس چانسلر صاحب کے اس اعتراف کے بعد دیوان غالب نسخہ خرابہ کے ”نسخہ لاہور“ ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا اور اس میں بھی کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ یہ یونیورسٹی ہی کا مسروقہ نسخہ ہے جو مصنفین الرضیٰ سے برآمد ہوا ہے۔ یونیورسٹی حکام کو ڈی گنس ایلیٹن کی اشاعت پر فوری نوٹس لینے ہوئے مصنفین الرضیٰ کے خلاف باضابطہ طور پر مقدمہ درج کروانا چاہیے۔

ڈی گنس ایلیٹن کے حوالے سے مصنفین الرضیٰ کی تازہ بدخواہیاں اور اپنے جرم کے اعتراف کے متعدد شواہد بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ جن سے اعادہ ہوتا ہے کہ چوری کرنے والا اپنے جرم کے نشانات ضرور چھوڑ جاتا ہے یا چھوڑتا رہتا ہے۔ یہ تازہ بدخواہیاں ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ”دیوان غالب، نسخہ ”خزانہ“ کے پہلے ایڈیشن (جسے مکتبہ انجاز لاہور نے شائع کیا) میں صفحہ نمبر ۴۲ کی اختتامی طور چھپائی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر حسین فراقی نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہاں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ایکسپنشن نمبر ۶۸۱۴ تھا۔ یہ چھپائی ہوئی طور واضح طور پر اس پہلے ایڈیشن میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ڈی گنس ایلیٹن میں پہلے ایڈیشن کے برعکس مصنفین الرضیٰ نے صفحہ نمبر ۴۲ کی کمرچی ہوئی جہز دل کو دوبارہ طے دیا ہے۔ گو اب اس تازہ ایڈیشن میں چھپائی ہوئی طور نہ کر دی گئی ہیں تاکہ قارئین کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں جعل سازی کی گئی ہے۔ مصنفین الرضیٰ نے ان دونوں نسخوں کے اس اختلاف کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ کیا یہ ان کا اعتراف جرم نہیں ہے؟ اگر نہیں تو کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ پہلے ایڈیشن

میں طور کیوں کھڑی تھی ہیں اور ڈی کس ایڈیشن میں کیوں انہیں برابر کر دیا گیا ہے؟

۲۔ معین الرحمن نے اس سے ڈی کس ایڈیشن کے دیباچے، حواشی اور فارسی متن کے ترجموں میں ڈاکٹر حسین فراقی کے تمام اعتراضات کو قبول کرتے ہوئے تصحیح کر دی ہے۔ کیا یہ ان کا اعتراف جرم نہیں ہے؟ اس کے بعد اس کتابچے کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے جو ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں انہوں نے لکھا؟

۳۔ ڈی کس ایڈیشن میں معین الرحمن نے پہلے ایڈیشن کے برعکس صرف اصل متن دیا ہے، نتیجتاً کتابت نہیں دی۔ یہ صرف اس لیے کہ معین الرحمن نے تصدیق کتابت دیتے ہوئے بے پناہ غلطیاں کی تھیں۔ کیا یہ ان کا اعتراف جرم نہیں؟

۴۔ نئے ایڈیشن کے آخر پر ۵ صفحات پر مشتمل کسی سے نکھوایا ہوا معین الرحمن کا مضحکہ خیز انگریزی دیباچہ بھی شامل ہے، تاکہ ہر دن ملک لوگ اسے پڑھ سکیں، جہاں یہ فروخت کے لیے بیکھا گیا ہے۔ یہ دیباچہ پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے۔

۵۔ اس تازہ ایڈیشن پر اشاعت کی تاریخ اگست ڈالی گئی ہے جو غلط ہے۔ نوٹ کریں نومبر میں شائع ہوا۔

۶۔ پہلا ایڈیشن مکتبہ الہام لاہور سے شائع ہوا۔ یہ تازہ ایڈیشن الونگار پبلی کیشنز لاہور (معین الرحمن کا ذاتی اشاعت کا ادارہ) سے شائع ہوا۔ یہ پہلے ایڈیشن کے برعکس ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یعنی اسے مختصر کر دیا گیا ہے۔ کیا اس کا تیسرا ایڈیشن اتنا مختصر ہو گا کہ یہ نظر بھی نہیں آئے گا؟

قارئین!

ڈاکٹر معین الرحمن سے سیدھے سیدھے یہ تین سوال ہیں:

۱۔ انہوں نے تازہ ایڈیشن میں صفحہ نمبر ۲۲ کی انتہائی طور کو اپنے پہلے ایڈیشن کے برعکس پڑ کیوں کیا؟

۲۔ انہوں نے اپنے پہلے دیباچے میں ترجمہ یوں کی؟ اور ڈاکٹر حسین فراقی کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کو انہیں جواب دے اور یوں کیا؟

۳۔ تازہ وی کس ایڈیشن پاکستان میں کیوں دستیاب نہیں ہے؟

- ۱۵۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے انصاف کی توقع ہے۔
 ۱۶۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر سے فوری اقدام کی اپیل ہے۔
 ۱۷۔ اہل علم و ادب سے جائزہ لیا جائے کی اپیل ہے۔

منجانب
 انجمن تحفظ ناموسِ غالب و رشید احمد صدیقی



پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ڈاکٹر معین الرحمن کے خلاف تحقیقات کا حکم دیدیا

یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہونے والا دیوان غالب
کا نادر مخطوطہ معین الرحمن تک کیونکر پہنچا؟

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر یحییٰ جزل (ر) ارشد محمود نے گورنمنٹ کالج
لاہور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر معین الرحمن کے خلاف تحقیقات کا حکم دے دیا ہے تاکہ معلوم کیا
جائے کہ دیوان غالب کا نادر مخطوطہ جو یونیورسٹی لائبریری سے چوری ہوا تھا، ڈاکٹر معین
رحمن کے پاس کیونکر پہنچا۔ باہقوق ذرائع کے مطابق وائس چانسلر اس صورت حال پر
خاصے پریشان ہیں کہ علمی و ادبی حلقوں میں یہ تاثر مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ یونیورسٹی
حکام مخطوطے کی چوری کے واقعے کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جزل صاحب کا کہنا
ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے مجھ سے نلکا چائی کرتے ہوئے مسروقہ نسخہ یہ کہہ کر یونیورسٹی
کے لیے عطیہ کیا کہ یہ ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر معین الرحمن نے ۱۹۹۸ء کے اوائل میں دیوان غالب کا ایک
نادر قلمی نسخہ ”نسب خواجہ“ کے نام سے شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ دراصل وہی قلمی نسخہ تھا جس پر
ڈاکٹر سید عہد اللہ نے ۱۹۵۳ء میں ”نامہ نو“ میں ایک مضمون لکھا تھا۔ چار سال بعد اس نسخے
کا رونو کراف قاضی عبدالودود لاہور آ کر لے گئے تھے۔ اسی نسخے کو بعد ازاں ممتاز غالب
شناس مرثی راہپوری نے دیوان غالب کے ”نسب لاہور“ کے نام سے مسموم کیا تھا اور اپنے
مرتبہ نسخہ مرثی میں اس کا تفصیلی ذکر کیا تھا۔

یہ قلمی نسخہ ایک مدت تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی زینت رہا، آٹا تک اسے

ایک گستاخی سازش کے تحت وہاں سے غائب کرایا گیا اور وہ برس پہلے اسے مصین الرحمن نے "نسخہ خوبہ" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس صورت حال کا بروقت نوٹس لیتے ہوئے ڈاکٹر حسین فراقی نے "دیوان غالب، نسخہ خوبہ، اصل حقائق" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کر دیا کہ مصین الرحمن نے جس گھٹی نظیہ کو "نسخہ خوبہ" کے نام سے شائع کیا ہے، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا مسروقہ نسخہ تھا۔

یہاں یہ ذکر کرنا بے عمل نہ ہو گا کہ مصین الرحمن اس سے پہلے بھی کئی بے ضابطگیاں کر چکے ہیں۔ کئی برس پہلے انھوں نے آنجمانی پرتوی چند کی "جاگیر غالب" جھبلی تھی اور اسے لاہور سے شائع کر دیا تھا۔ وہ بھرتی باسط کا مقالہ "اورا جعفری" بھی اپنے نام سے رسالہ "نقوش" میں شائع کر چکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر مصین الرحمن نے آنجمانی پرتوی چند کی طرح معروف مزاح نگار رشید احمد صدیقی مرحوم کو بھی نہیں بخشا اور ان کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر ایک جعلی تصویر تیار کی، جو موصوف کی ایک کتاب "ہدیہ اردو غزل" کے پس ورق پر شائع ہو چکی ہے۔ یہ ہمارا الیہ ہے کہ ایک اعلیٰ درجے کے تعلیمی ادارے سے وابستہ ایک استاد دوسروں کے علمی کاموں کو اپنے نام شائع کرتا ہے اور اس کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ وائس چانسلر صاحب لائق مبارک باد ہیں کہ اب انھوں نے اس شرمناک بے ضابطگی کا نوٹس لیتے ہوئے مصین الرحمن کے خلاف تحقیقات کا ارادہ کیا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ "سورج" لاہور۔ جنوری ۲۰۰۱ء)

دیوان غالب کا ”نسخہ لاہور“

ڈاکٹر قسین فراقی

روزنامہ ”پاکستان“ کی ۲۵ اگست ۲۰۰۰ء کی اشاعت میں ایک دو کالمی خبر شائع ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ گورنمنٹ کالج کے شعبہ اردو کے استاد ڈاکٹر مصین الرحمن نے دیوان غالب کا ایک پور قلمی مخطوطہ جو ان کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ تھا، پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو پرے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس موقع پر وائس چانسلر اور بعض دیگر حضرات نے مصین الرحمن صاحب کی اس پیش کش کو پرزور الفاظ میں سراہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دو کالمی خبر میں بعض حقائق کو بری طرح مسخ کیا گیا ہے۔ اس لیے میں ذیل میں اپنی چند مسموحات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ محترم چیف ایڈیٹر! آپ چونکہ صحافت کی اس ذریعہ روایت کے انہیں ہیں جو حق گوئی اور آزادی رائے کو ہر چیز پر مقدم سمجھتی ہے، لہذا میں امید کرتا ہوں کہ میری یہ مسموحات آپ کے روزنامے میں شائع ہو جائیں گی۔

۱۔ آپ کے روزنامے میں دیوان غالب کے جس قلمی نسخے کو مصین الرحمن صاحب کے ذاتی ذخیرے کی ملکیت قرار دیا گیا ہے، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی ملکیت تھا۔ دراصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیوان غالب کے دو ہی قلمی نسخے تھے۔ ایک ”نسخہ شیرانی“ جو وہاں موجود ہے۔ دوسرا بھی نسخہ جسے ممتاز غالب شناس امتیاز علی عرشی نے ”نسخہ لاہور“ قرار دیا تھا۔ یہی ”نسخہ لاہور“ اب ”نسخہ خولہ“ کی نقاب بہن کر ظاہر ہوا ہے۔ یہ نسخہ جونہی شائع ہوا غلیل الرحمن داؤدی اور ہندوستان کے ممتاز محققوں رشید حسن خان اور ڈاکٹر حفیظ نقوی نے اسے فوراً پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا نسخہ یعنی ”نسخہ لاہور“ قرار دیا۔ یہ نسخہ لائبریری سے چوری کیا گیا یا کرایا گیا۔ اس کے آٹری منظرے پر یونیورسٹی کی مذکورہ سرکاری جس پر چھپی لگا کر اسے چھپا دیا گیا اور مخطوطے کے صفحہ ۲۲ پر جہاں یونیورسٹی

لاہوری کا ایکسٹینس ہیر تھا۔ اسے چمیل کر مٹا دیا گیا۔ معین الرحمن نے تازہ حتم یہ کیا کہ اس قلمی نسخے کو لمبی سیٹ کرا کر اور رنگ بانڈنگ کے ساتھ لاہوری کو واپس کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مدد مہر پر لگی چٹ اتاری نہیں جا سکتی اور یوں مخلوطے کی اصلیت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ میں نے اپنے کتابچے "دیوان غالب نسخہ طوبہ اصل حقائق" میں قوی دلائل سے یہ ثابت کیا ہے کہ معین الرحمن جس "دیوان غالب" قلمی کو اپنے ذخیرے کی حقیقی محتاج قرار دیتے ہیں، وہ دراصل پنجاب یونیورسٹی لاہوری ہی کا نسخہ تھا۔ یہ نسخہ چونکہ معین الرحمن صاحب کے پاس سے برآمد ہوا ہے لہذا وہ تعریف اور تحسین کے بجائے جواب دہنے کے پائندہ ہیں۔ معین الرحمن صاحب نے یہ نسخہ لاہوری کو لوٹا کر کوئی احسان نہیں کیا۔ وہ اب اس کا ایک ایکس ایڈیشن شائع کرنے والے ہیں۔ میری وائس چانسلر صاحب پنجاب یونیورسٹی ی گزارش ہے کہ وہ انہیں ایسا کرنے سے روکیں کیونکہ اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر کسی حقیقی قلمی نسخے کا ایک نسخہ بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔

ذکورہ خبر میں معین الرحمن صاحب کو حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور طوبہ منظور حسین کی قلمی روایات کا اہم قرار دیا گیا ہے۔ ایسا کہنا دراصل حمید احمد خاں، سید وقار عظیم اور طوبہ منظور حسین کی روحوں کو اذیت دینے کے مترادف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں کوئی شخص بھی اس فارسی مصرع کا مصداق نہیں رہا کہ "چند دلاور است دزدے کہ بخت چراغ دارد۔" حال ہی میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے حکم پر معین الرحمن صاحب کے خلاف یونیورسٹی کے ایک نہایت سینئر استاد نے انکوائری کی ہے۔ اس انکوائری میں ایک طرف تو یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیوان غالب یہ قلمی نسخہ سو فیصد پنجاب یونیورسٹی ہی کا نسخہ ہے جو یہاں سے غالب ہوا یا کرایا گیا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ معین الرحمن نے اپنی ایک شاگرد بشری باسٹ کو جنوری ۱۹۹۱ء میں ایم اے (اردو) کا مقالہ بعنوان "دوا جعفری، شخصیت اور شاعری" لکھ کر دیا۔ انکوائری کے حقائق کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے بہت سے دستاویزی ثبوت بھی انکوائری رپورٹ کے ساتھ منسلک کیے گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص اپنی ایک شاگرد کو ایم اے کا دوسرا

نمبر کا ایک مقالہ نگار کر جمل سازی کرے، جو شخص پنجاب یونیورسٹی کے قلمی نسخے کو اپنا ثابت کرنے کے لیے اس پر چبھیاں لگائے، جو شخص رشید احمد صدیقی کی تصویر کے ساتھ اپنی تصویر جوڑ کر شائع کرے، جو شخص یہ کہے کہ وہ علی گڑھ، الہ آباد اور دیگر کئی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا ہے وہ آں حالکہ وہ کبھی ہندوستان نہ گیا ہو، جو شخص غاسرہ دھار کے مضمون پر (مطبوعہ "ارچنا") اکتوبر ۱۹۹۰ء) کو ماہنامہ "خلاصہ" لاہور نومبر ۱۹۹۵ء میں لفظ بہ لفظ اپنے نام سے شائع کر لے اور حد تو یہ ہے کہ جو شخص ہندوستان کے پر قہوی چندر کی پوری کتاب "جاگیر غالب" اپنے نام سے شائع کر لے، وہ شخص مذکورہ بالا معزز اور قابل فخر ادبی شخصیات کی روشن روایات کا امن کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسے شخص کے خلاف پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو نوٹس لینا چاہیے۔ کیونکہ انکوائری رپورٹ ان کی خدمت میں پیش کی جا چکی ہے۔

خدارا ایک ایسے شخص کو جو اساتذہ کی کمیونٹی کی عزت کو خاک میں ملا رہا ہے اور جو کورٹمنٹ کالج جیسے ممتاز ترین اعلیٰ ادارے کی روشن علمی روایات کو داغدار کر رہا ہے، اپنے اظہار کے ذریعے پروٹ نہ ہونے دیجیے۔

(ڈاکٹر حسین نرائی۔ لفظ نظر۔ روزنامہ "پاکستان" ۱۱-۱۲-۲۰۰۳ء۔ ص ۳۰۰۰)

ماہ نامہ ”تخلیق“ لاہور میں شائع ہونے والے خطوط کے اقتباسات

ماہنامہ ”تخلیق“ لاہور کے ادارہ سے تشریک پاسے ہوتے بہت سے اہل علم وادب صاحب نے اظہر چاند صاحب کو خطوط لکھے جو ”تخلیق“ لاہور اگست ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔ یہاں ہم اس قلمیے سے حلق فن علم و دستوں کی آراء درج کر رہے ہیں جن کا ایک نظر مطالعہ ادب و علم کی ترویج بھی ظاہر کرتا ہے اور ڈاکٹر معین الرحمن کے بارے میں لوگوں کی آراء کا اندازہ بھی دیتا ہے۔

محمد خالد اختر (کراچی) کے خط میں سے اقتباسات۔

”ہمارے بے چارے ڈاکٹر سید معین الرحمن، ان سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا کہ ان کی گہری بیماری جاری ہے۔ میں اس ماجرے کی اصل حقیقت سے بے علم ہوں۔ اگر یہ خطوطے سے سرقہ یا پلے گرزم کی بات ہے تو..... یہ ایک معصومانہ بھول چوک ہے جسے معاف کر دینا چاہیے۔“

(اگست ۲۰۰۰ء صفحہ ۱۰۸)

”مناسب تو یہی تھا کہ ایک ذمہ دار پروفیسر ہوتے ہوئے وہ لائبریری کے قواعد کا لحاظ کرتے اور اسے باقاعدہ ایڈو کراتے۔“ (ایضاً)

”میں نے کہا میں نہیں جانتا کہ معین الرحمن صاحب سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے اور اس معاملے کے اصل واقعات کیا ہیں۔“ (ایضاً)

علامہ انجمن فتویٰ صاحب نے جون ۲۰۰۰ء کے ادارہ سے ”اپنی بات“ کے حوالے سے یہ

لکھا۔

”جون کے شمارے کا مطالعہ حسب معمول ”اپنی بات“ سے کیا۔ اس کے ردعمل میں کیا کہوں اور کیا نہ کہوں! بس آپ کے ساتھ مل کر ادب کی صالح قدروں اور مہین روایتوں کے لیے دعائے خیر ہی مانگ سکتا ہوں۔“ (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۱۳)

”ادارے میں آپ نے جس صورت حال کا ذکر کیا، وہ نہایت سمجھیر ہے۔ میں نے جب اخبار میں یہ خبر پڑھی تھی تو دل نہیں مانتا تھا۔ خدا کرے کہ یہ جھوٹ ہی ہو۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور ”راوی“ کے تعلق کے حوالے سے دل بہت دکھا۔“

(محمد جواد حسن۔ اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۲۵)

نبیل یوسف نے مری سے لکھا:

”تخلیق کا شمارہ جون ۲۰۰۰ پیش نظر ہے۔ اس دفعہ ”اپنی بات“ میں آپ نے ملک کے موثر ترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو کے سربراہ کا علمی طبع جس خوبصورتی سے اتارا ہے، میں اس کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو بات پطرس بخاری نے بعض طالب علموں کے بارے میں کہی تھی کہ وہ تعلیم و تدریس کے چنگاموں میں خود کو اس طرح ماسون و محفوظ رکھتے ہیں جس طرح تبتس داعیوں میں زبان دہنتی ہے، یہ بات اب اکثر پروفیسروں پر صادق آتی ہے۔۔۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں وہ گڑ اور کچی پیچھے والے، پروفیسر سید مصحح الرحمن سے ایسے ہیں۔ انھیں اپنی کم علمی اور بے ہنوائی کا احساس ہے۔ وہ اسی کام میں لگے ہوئے تھے جس کے گنج معنوں میں اہل تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ری سے پرانے مخلوطے چرا کر اپنے نام سے تو نہیں چھپوا رہے تھے۔“ (اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۲۹، ۱۳۰)

پروفیسر بڑی صاحب نے لکھا:

”آپ نے ”اپنی بات“ میں پھر اسی دیکھ کا اظہار کیا ہے۔۔۔ جس طرح آپ نے ان شاعرات کو معاف کر دیا ہے اسی طرح جناب معین الرحمن صاحب کو معاف فرمادیں کہ یہ مرض لا علاج ہے۔“

(اگست ۲۰۰۰ء۔ ستمبر ۱۳۶۱ھ)

ڈاکٹر عارف قاقب نے ”تحقیق“ اگست ۲۰۰۰ء میں محترم اظہار جاوید صاحب کے ادارے ”اپنی بات“ بابت جون ۲۰۰۰ء سے تحریک پاتے ہوئے ایک طویل خط لکھا۔ خط کا پورا متن یہ تھا۔

محترم اظہار جاوید صاحب! آداب!

تازہ ”تحقیق“ بابت جون ۲۰۰۰ء اپنے روایتی حسن انتظام کے ساتھ موصول ہوا۔ آپ کا تحریر کردہ ادارہ ”اپنی بات“ مختصر سی مگر آپ نے جس طرح ادب کی صالح اقدار کی پامالی اور ان کے تائید ہو جانے پر اظہار افسوس کیا ہے، وہ اہل علم و ادب کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ کاش جج بولنے اور لکھنے کا دعویٰ کرنے والے ادیب اور دانشور مسئلے کی نزاکت کو سمجھیں اور مصلحت کی حدوں سے باہر نکل کر اپنی رائے کا اظہار کریں۔

محترم لطیف الزماں خاں اور استاد محترم ڈاکٹر حسین فروقی صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے ڈاکٹر معین الرحمن صاحب کی جن ”چوریوں“ کا اشارہ دیا ہے، وہ محض الفاظ کا گورکھ و حندا نہیں ہیں بلکہ جنی برصاوت ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بہت سے لوگ اپنی بعض جھوڑیوں کے باعث خاموش ہیں، مگر آخر کب تک؟ آج وہی لوگ اپنی رائے کا اظہار کرنے بھی لگے ہیں اور باقاعدہ ایک تحریک کی صورت وجود میں آ چکی ہے۔ یہ تحریک کسی سے ذاتی دشمنی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ علم و ادب کی تاریخ کی بھلائی کے لیے ہے۔ ہر مرضیہ ڈاکٹر معین الرحمن نے مکمل کھلا ملی و ادنیٰ چوریاں کی ہیں۔ لوگوں کی تحریروں کو اپنے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اپنے نام نہاد منصب کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے چند ہموار پیدا کیے ہیں۔ یہ تمام باتیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ جو ادیب و دانشور حقیقی اور نفاذ چاہے دیکھ سکتا ہے، پڑھ سکتا ہے اور فیصلہ کر سکتا ہے۔ میں آپ کے

اداریے سے تحریک پاتے ہوئے چند نکات اٹھا رہا ہوں۔ ان تمام کے باقاعدہ ریکارڈ موجود ہیں۔ کون شخص ان سے منکر ہو سکتا ہے؟

1- ڈاکٹر مصین الرحمن کا مرحب کردہ تازہ "دیوان غالب" نسخہ خوبہ" دراصل پنجاب یونیورسٹی لاہور سے چوری کیا گیا "نسخہ لاہور" ہے۔ نسخہ عرفی کے آخری صفحے کا عکس ملاحظہ کریں۔ مصین الرحمن نے مدور سر کے اوپر "مفتے دینا، فتح دینا" کی چھپی لکائی۔ نسخہ خوبہ کے آخری صفحے کا عکس ملاحظہ فرمائیں۔ (نسخہ خوبہ۔ صفحہ ۱۲۷) کیا یہ آنکھ والوں کو دکھائی نہیں دیتا؟ نسخہ خوبہ میں صفحہ نمبر ۴۴ کی اختتامی طور چھپیل دی گئی ہیں۔ یہاں بائیں یونیورسٹی لاہور کے "نسخہ لاہور" کا ایکسپنشن نمبر تھا۔ کیا یہ تبدیلی لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی؟

2- غالب کے جعلی خطوط ڈاکٹر مصین الرحمن نے متعارف کرائے۔ ہندوستان تک میں داویلا ہوا۔ یہاں چند لوگ ان کے اس کارنامے کی تعریف کر رہے ہیں۔ ان خطوں کا کوئی اصل ثبوت مصین صاحب کے پاس نہیں ہے۔ کیا یہ بھی جھوٹ ہے؟

3- پرتوی چندر کی مرحب کردہ کتاب "پاکیر غالب" کو مصین صاحب نے اپنے نام سے شائع کیا۔ کیا لوگوں کو علم نہیں۔ "سورج" کے غالب نمبر میں لطیف الزماں خاں کے جو خطوط نام مصین الرحمن اور ڈاکٹر وحید قریشی شائع ہوئے ہیں ان کا جواب یہ اصحاب کیوں نہیں دیتے؟

4- "غالب اور انقلاب ستاون" (دہلیو کا ترجمہ) دو بار ہندوستان میں شائع ہوا۔ پہلی بار دلی یونیورسٹی کے مجلہ "اردوئے معلیٰ" غالب نمبر ۴ میں اور دوسری مرتبہ غالب انشٹیٹیوٹ دلی سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ معروف محقق رشید حسن خان صاحب کا کیا ہوا ہے۔ مصین الرحمن نے اسے اپنے نام سے شائع کیا۔ آخر کیوں؟ کیا لوگوں کو دکھائی نہیں دیتا؟ کیا یہ کھلم کھلا چوری نہیں؟

5- رشید احمد صدیقی کی تحریروں کو مصین الرحمن صاحب نے اپنے نام سے شائع کیا۔ مصین الرحمن صاحب کا نام لینے والے جن محققین کو اعتراض ہے وہ "مطبوعات رشید احمد صدیقی" مرحومہ لطیف الزماں خاں (مطبوعہ دانیال کراچی) کا دیباچہ

”آئینہ کیوں نہ دوں“ پڑھیں اور پھر جواب دیں کہ کیا مصنف الرحمن صاحب نے رشید احمد صدیقی کی تحریریں اپنے نام سے شائع نہیں کیں؟ اس ویسا ہے میں تعلیمی انتہاسات موجو ہیں۔ وہ تو یہ لوگ پڑھ ہی سکتے ہیں۔

۶۔ رشید احمد صدیقی کی تحریر کو وہ بجزوری کی تحریر کہتے ہیں اور لوگ پھر بھی انہیں مطلق کہتے ہیں۔ (ملاحظہ کریں) ”علی گڑھ میگزین“ ۳۹-۱۹۳۸ء میں رشید احمد صدیقی کا مضمون ”کوئی غلطی کہ ہم غلطیاں کیا“ اور ڈاکٹر معین الرحمن کا اعتراض مطبوعہ ”قوی زبان“ کراچی)۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا مبلغ علم کتنا ہے۔

۷۔ سرتاب ”نذر نظیر“ کے صفحہ ۲۷ پر مصنف صاحب لکھ رہے ہیں کہ وہ لاہور، علی گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ اور بعض دوسری جامعات میں اساتذہ سے پڑھے ہیں۔ یہ کیا غلط ہے؟ جو شخص زندگی میں کبھی ہندوستان نہیں گیا۔ وہ ان یونیورسٹیوں میں کیسے پڑھا؟ الہ آباد جہاں سے انہوں نے ڈگریاں حاصل کیں، ان شہروں کا ذکر نہیں۔ مثلاً کراچی، حیدرآباد۔

۸۔ رشید احمد صدیقی کے ساتھ انہوں نے جعلی تصویر بنائی جس کا انہوں نے اعتراف بھی کر لیا ہے۔ یہ کیا تاثر دینے کی کوشش ہے؟ کوئی محقق نہیں بولا، سوائے لطیف الزماں خاں کے۔

۹۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی طالبہ بشری ہاسٹ کا ایم۔ اے۔ اردو کا مقالہ ”ادوا جعفری، شخصیت اور شاعری“ کو مصنف صاحب نے اپنے نام سے ”نفوٹش“ لاہور میں شائع کرایا۔ کیا یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے؟ کیا جواز پیش کریں گے محققین؟ اور کیا قانون ہے پنجاب یونیورسٹی کا؟

۱۰۔ محترم اظہار جاوید صاحب! حد دیکھیے! ڈاکٹر سید عہداف کا ایک نادر خط پہلے ”ارتکاز“ کراچی میں ناصر ونگار کے نام کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہیں اس کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔ ”علامت“ لاہور سے وہی خط ڈاکٹر معین الرحمن حیداف کرداتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس کے وضاحتی حواشی میرا اضافہ ہیں۔ محققین اس خط کو آٹے سے سائے رنگیں ایک لفظ کا فرق نہیں ہے۔ صرف حیداف کردانے والے نام کا فرق ہے۔ غصہ خدا کا۔ کیا یہ چوری اور جعل

سازی نہیں ہے؟ اس خط سے اردو تحقیق میں کیا اضافہ ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ جو شخص اتنی سی تحریر اپنے نام سے شائع کروا سکتا ہے، وہ بڑی بڑی تحریروں کو کیا چھوڑے گا؟

تحقیق جن اصول و ضوابط اور اخلاقیات کا تقاضا کرتی ہے، وہ مصنف صاحب میں سرے سے موجود نہیں ہیں۔ انھیں محقق اور غالب شناس کہنا تحقیق کی تاریخ پر داغ لگانا ہے۔ میں نے خود انھیں کہیں غالب شناس لکھا ہے مگر میں صورت حال سے بے خبر تھا۔ اب مجھے علم ہے تو میں یہ لکھ رہا ہوں کہ وہ محقق نہیں ہیں۔ کتنے ہی لوگ دنیاوی معاملات کے باعث مجبور ہیں اور بول نہیں سکتے۔ مصنف المرنم صاحب نے ان کی زبان بندی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اپنے حق میں کھواتے ہیں، مصلحت اپنے مہدے کی بنا پر۔ لوگوں کی تحریروں بغیر ان سے اجازت لیے وہ مرتب کرتے ہیں۔ اب کیا مجھ جیسا طالب علم انھیں یہ بتائے گا کہ یہ حقیقی ہ اخلاقی ہے۔ آج انھیں ان کی حیثیت سے ہٹا دیا جائے تو انھیں کوئی ایک کلمہ خیر کہنے والا نہیں ملے گا۔ وقت اس بات کو بہت جلد ثابت کر دے گا۔

ڈاکٹر حسین فراقی صاحب کا مسئلہ ذاتی نہیں، علمی و ادبی ہے۔ میں بعد احترام بڑے بڑے محققین اور نقاد مشفق استاد محترم ڈاکٹر وحید قریشی صاحب، قاضی صد احترام میرے دادا استاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب، مشفق و مہربان محترم مشفق خواجہ صاحب اور دیگر اہل علم و ادب سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس اہم معاملے پر کسی بھی وقت مکالمہ رکھیں، جہاں دلائل اور شہادتوں سے ثابت کیا جائے گا کہ مصنف المرنم صاحب دوسروں کی تحریروں، بلکہ پوری کی پوری کتابیں اپنے نام سے شائع کرتے ہیں۔ اگر لطیف الزماں خاں، ڈاکٹر حسین فراقی اور ڈاکٹر اسماعیل نیازی جیسے اہل علم و ادب جھوٹ کہہ رہے ہیں تو ان کا محاسبہ ہونا چاہیے اور اگر ان کا کہا سچ ثابت ہوتا ہے تو تاریخ ادب، مصنف المرنم پر جعل سازی اور چوری کا لیٹل لگائے۔ اس میں اتنا دباؤ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ لکھے ہوئے کا جواب تو دینا پڑتا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

محترم اظہر جاوید صاحب! میں جانتا ہوں آپ کسی ادبی گروہ بندی کا شکار نہیں ہیں۔ آپ برسوں سے ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں، بغیر صلے کی تفتا اور ستائش کی پروا کے۔ بہت سے مواقع پر آپ نے ادبی جہاد بھی کیا ہے۔ تم تو یہ ہے کہ موجودہ

مہد میں آپ جیسے لوگ تو آنکھ والوں کو دکھائی نہ دیں اور مصیبتِ الرمن صاحب جیسے نام نہاد محققین کی چند لوگ پذیرائی کرتے رہیں۔ کیا یہ ادب پر اور تاریخ ادب پر ظلم نہیں؟ باوجود اس کے کہ وہی لوگ فنی مصلوں میں مصیبتِ الرمن کے خلاف بیان بھی دیں۔ کیا یہ منافقت نہیں؟ یہ میرا ادب کے ایک معمولی طالب علم کی حیثیت سے سوال ہے۔ مجھے محققین اردو سے جواپ ملے کر دیں۔ آپ بڑے ہیں اور میں یہ تھاںسا آپ سے کر سکتا ہوں۔ چلیں! مان لیا سب لوگ جھوٹ کہہ رہے ہیں مصیبتِ الرمن صاحب کج کہہ رہے ہیں۔ وہ کسی ادبی فورم پر آجائیں۔ کچھ ثبوت لے کر ہم لوگ بھی آجاتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ جھگڑا تو جھوٹ اور کج کا ہے۔ کوئی ذاتی تو ہے نہیں! خط کچھ طویل ہو گیا۔ میں معذرت چاہتا ہوں، مگر آنے والی صدی کو یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ ماضی کی مسخ ادبی تاریخ کا راز کیا تھا۔ ابھی اور بھی بہت سے شواہد منظر عام پر آنے والے ہیں۔ لوگ یہ تو کہتے ہیں کہ حق کو عدل کو صاحب اولاد ہونا چاہیے کیونکہ ظلم کوچہ و بازار میں بچے بن رہا ہے، مگر حق بات کہنے میں انھیں خود تردد ہے۔ آپ نے تو ”السلامة والسلامہ واجمعون“ پڑھ دیا۔ ادب کی صالح قدروں اور متین روایتوں کے لیے دعائے خیر بھی کی۔ ہم بھی تو خیر کی دعا مانگتے ہیں۔ اسی لیے تو شر کو شر کہہ رہے ہیں!

نیاز مند! ڈاکٹر عارف ثاقب

ایم ایم صاحب نے لکھا:

”آپ نے مصیبتِ الرمن صاحب کے سرے کو بھی ادبی حلقوں تک پہنچایا۔ میں تو اسے کار خیر سمجھتا ہوں کہ کم از کم پتا تو چلے کہ ادب میں کیا ہو رہا ہے اور سستی شہرت اور جھوٹی عزت کے حصول کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ لاجوں ولا فوہ۔“

(اگست ۲۰۰۰ء، صفحہ ۱۳۶)

غیر فنی صاحب نے یہ لکھا:

”مصیبتِ الرمن کے حوالے سے ایک ادبی بددیانتی کا انکشاف حیران کن بھی ہے اور لمحہ فکر یہ بھی۔“ ”یوں کفر لاکھ پر فیروز کیا مانہ مسلمانی۔“ اگر

پروفیسر صاحب کی علمی و ادبی سطح کے لوگ اس نوع کی ادبی تحفہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو پھر عام شاعر و ادیب یا محقق کے ادبی ایمان کی پختگی کی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے۔ حسین فراتی اور لطیف الزماں کے حرف کو ان کی فنیہ جانب داری اور اصابت رائے کے سبب ادبی دنیا میں بڑا اعتبار حاصل ہے۔ وہ محتاج جان نہیں ہے۔ ہم ان کے ساتھ آپ کے حوصلے کی بھی پڑھائی فرض خیال کرتے ہیں کہ جنہوں نے بلا خوف و خطر ایک بہت بڑے ادبی کھیلے کی نشاندہی کر دی ہے۔“

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۳۸)

عبدالغفور نے کراچی سے لکھا:

”اپریل ۲۰۰۰ء کے شمارے میں آپ کی ”اپنی بات“ کی بدولت جون کے شمارے میں وہ بہت سے پوسے اٹھا دیے گئے، جن کی اوٹ میں چن کر ”ادبی احترام کے حقدار“ ناچاکو ذرائع استعمال کر کے وہ وہ سمیٹنے کی خاطر خود اپنی ہی شخصیت میں دراڑیں ڈالنے کے مرتکب ہو رہے تھے۔“

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۳۶)

ساجد علی شاعر نے لکھا:

”اوارے میں صبحین الرحمن کے بارے میں پڑھ کر دکھ ہوا۔ لطیف الزماں میرے زمانہ طالب علمی کے دوست ہیں۔ انہیں ہمیشہ حقیقت کی جستجو رہی ہے۔ اس لیے کئی لوگ ان سے غفا بھی رہے۔ حسین فراتی ایک معتبر شخصیت ہے۔ لطیف الزماں نے بھی ان کی حمایت کی ہے تو بات سچی ہے۔“

(اگست ۲۰۰۰ء۔ صفحہ ۱۵۱)

اگست ۲۰۰۰ء کے ”محقق“ کے شمارے میں لطیف الزماں صاحب کا بھی ایک طویل خط شائع ہوا۔ لکھا کہ پورا ضمن سب ایل ہے:

محبتِ محرم، اسلامِ عظیم!

۲۰ جن کو میں اور محترم قاقب صاحب "نقوش" کے دفتر میں جاوید طفیل صاحب سے جو گفتگو تھی۔ پہلے مصین صاحب اور پھر ثار احمد فاروقی کا ذکر نکل آیا۔ پہلے تو مدیر "نقوش" نے فاروقی صاحب کو کہا: He is the meanest of mankind. پھر ڈاکٹر ظلیق انجم کا پورا قول دہرایا اور جب میں نے کہا، وہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کے والد مرحوم سے، آپ کی والدہ صاحبہ اور میری موجودگی میں انیس ہزار روپے لیے تھے تو وہ ایک دم بلند آواز سے گویا ہوئے کہ آپ انیس ہزار کی بات کرتے ہیں، وہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ وصول کر چکے ہیں۔ پھر جاوید طفیل صاحب نے عجیب بات بتائی۔ "نقوش ادارہ" کے لیے ثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر گیان چند بھین صاحب دونوں لاہور آئے۔ فاروقی نے جاوید صاحب سے کہا: "تم نے میرے مقابلہ میں ایک ہندو کو دس ہزار روپے دیے۔" ایڈیٹر "نقوش" نے کہا: "آپ دس ہزار مجھ سے لے لیں۔" جاتے وقت پانچ ہزار وصول کیے تو ملے۔

۲۲ جن کی صبح کو طوفان باد و باراں۔ آکھ کھل گئی بجلی غائب ہو گئی۔ میں دروازہ کھول کر بیٹھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد یکم طفیل آ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ ہم دونوں مرحوم طفیل صاحب کی باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ طفیل صاحب کے انتقال کے بعد ثار احمد فاروقی کسی کام سے آئے، قیام ان کے ہاں تھا، مگر وہ لفظ مرحوم کے بارے میں نہ کہے۔

یہ سطور میں نے اس لیے لکھی ہیں کہ مصین الرحمن صاحب کے نام جو خط میں نے لکھا وہ دراصل فاروقی صاحب کا اصل چہرہ دکھانے کے لیے لکھا تھا۔ یہ اس میں اضافہ ہے۔

"نقوش" کے دفتر سے اٹھے تو قاقب صاحب آپ کے دفتر پہنچے۔ آپ نے جس محبت، شرافت اور کشادہ دلی سے مجھے خوش آمدید کہا، اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے بتایا تھا کہ مصین صاحب نے دو خط اور بھیجے تھے۔ آپ نے موضوع بھی بتایا۔ سب وعدہ میں ڈاکٹر ظلیق انجم صاحب کو خط کا کھس بھیج رہا ہوں۔ سید اکبر علی ترمذی صاحب کی کتاب "نامہ ہائی ماری غالب" کا ترجمہ میں نے کیا۔ "مکتوبات

غالبؔ کے نام سے شائع ہوا۔۔۔ خلیق انجم صاحب کی رائے آپ چاہ لیجیے۔
 مصنفین الرحمن صاحب نے ”دیوانی غالبؔ، نسخہ غلوہ۔۔۔“ صحیح صورت حال“ میں
 لکھا:

”میرے لیے رشید صاحب کی تحریریں دستور العمل اور رہنمائے حیات
 کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اپنے، اور دوسروں کے بھی، اچھے برے
 کارناموں اور رویوں کا جواز اور جواب مجھے رشید صاحب سے مل جاتا
 ہے۔ وہ میرے لیے کیا کہہ نہ تھے۔۔۔ میری زمین، میرا آسمان،
 میرے گھربان، میری ساری کائنات تھے وہ!“ (صفحہ ۲۳)

یہ تو مجھے اب معلوم ہوا کہ ”برے“ کارنامے بھی ہوتے ہیں۔ میں چوری مہارت
 پر تبصرہ نہ کروں گا۔ رشید صاحب کو ”کائنات“ کہنے والے مصنف صاحب نے مرحوم پر جو
 قلم توڑا، وہ یہ کہ رشید صاحب نے مولانا سلیمان اشرفؒ، علامہ اقبالؒ، مولوی عبدالحقؒ، خواجہ
 اعلیٰ غفرؒ، نواب محمد اسماعیل خاں صاحبؒ اپنے عزیز ترین دوست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
 صاحب اور دیگر اکابرین کے اقبال پر جن الفاظ میں اظہارِ غم کیا۔۔۔ تمام جملے قیمتی
 سے نکالے، ایک مہارت ترتیب دئی اور جب رشید صاحب کا اقبال ہوا تو اس مہارت کو
 انہی پر چسپاں کر دیا۔۔۔ ملاحظہ کیجیے۔ ”آپ بقی رشید احمد صدیقیؒ۔۔۔ ملیات، افکار
 اور تحریکات۔ مروجہ مصنفین الرحمن۔ ۱۹۸۳“

رشید صاحب کے ساتھ اپنی چھٹی تصویر بنوائی اور اب فرماتے ہیں۔۔۔ ”اس
 پر مجھے قریب اور دور کے خوش ذوق دوستوں اور بزرگوں سے بڑی داہلی۔۔۔ تعلق
 سرنگریاں کہ اسے کیا کیجیے۔

مجھے رشید صاحب سے بڑی عقیدت ہے۔ میں نے متعدد ذیل اوروں میں
 گوشت رشید بنوایا:

- ۱۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔۔۔ اردو لکشن، تاریخ، تنقید اور رسائل کا
 ڈائریہ۔
- ۲۔ ڈاکٹر محمود حسین لاہوری کراچی یونیورسٹی۔
- ۳۔ حدیث الکھٹ کراچی۔۔۔ میرے لے کر تائیں دم، دواہین اور شعری مجموعے

”گوشت رشید“ میں محفوظ ہیں۔

- ۴۔ خدا بخش لاہوری چند _____ پاکستانی مطبوعات کا ذخیرہ۔
- ۵۔ آزاد لاہوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے گوشت رشید میں سب سے زیادہ کتابیں ہیں۔ ہمارے رشید صاحب کو اقبال سے بڑی محبت تھی۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اقبال پر شائع ہونے والی ہر کتاب، جو بازار میں مل جائے، بھیج دوں۔ ہمارے ملک کے ادارے _____ مقتدرہ، مجلس ترقی ادب لاہور، اقبال اکیڈمی لاہور، بزم اقبال لاہور، مغربی پاکستان اکیڈمی لاہور، انجمن ترقی اردو کراچی ان اداروں کی تمام مطبوعات ”گوشت رشید“ میں موجود ہیں۔
- اس کے علاوہ رشید صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف شائع کراچکا ہوں:

- ۱۔ عزیزان علی گڑھ _____ آٹری طبع
- ۲۔ خطبات رشید احمد صدیقی
- ۳۔ سچ ہائے گراں مایہ۔ حصہ دوم
- ۴۔ سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ علی گڑھ میں
- ۵۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد اول
- ۶۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد دوم
- ۷۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد سوم
- ۸۔ مرشد واکر صاحب ہمارے واکر صاحب
- ۹۔ غالب نکتہ داں
- ۱۰۔ پیام اقبال
- ۱۱۔ خطوط رشید احمد صدیقی۔ جلد اول۔ دوسرا ایڈیشن
- ۱۲۔ میزان نثر۔ جلد اول
- ۱۳۔ میزان نثر۔ جلد دوم

میزان نثر۔ جلد سوم پریس میں ہے۔ چوتھی جلد آئندہ دسمبر تک، اور زندگی ہے تو پانچویں جلد آئندہ سال جون تک چھپ جائے گی۔

اعظم صاحب! دعا کیجیے کہ میں رشید صاحب کی تمام تحریریں کتابی شکل میں بچھرا

سکوں اور "گوشہ رشید" میں کتابوں کی تعداد اتنی ہو کہ کسی اور کے نام کے گوشے میں اتنی کتابیں نہ ہوں۔ پروفیسر نور الحسن خاں صاحب لائبریری کی تحریر کا عکس بھیج رہا ہوں۔
فراق صاحب کے ایک مصرعہ میں ایک لفظ کی تبدیلی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

ہم سے کیا ہو سکا "عقیدت" میں

پروفیسر نور الحسن صاحب یونیورسٹی لائبریری کی تحریر A.M.U News & Views
Vol. 4, No. 2 (Rasheed Number) October 30, 1995 میں شائع ہوئی ہے۔

آپ کا مخلص! لطیف الزمان
(ملتان)

کچھ ڈاکٹر سید معین الرحمن کی صفائی میں

ڈاکٹر محسین لڑائی اس قدر برہم ہیں کیوں؟
 شائع غالب کا ہوا دیوان سرورق تو کیا؟
 جسے تجھے نچھپ کیا دیوان غالب اور اک
 ہوں اگر نقش کسی کا، ہو کیا پورا تو کیا؟
 خیر سے "دیوان غالب" کا مرتب تو وہ ہے
 مصرع سوزوں اگر وہ پڑھ نہیں سکتا تو کیا؟
 کیا زباں تیرا ہے، اے پنجاب پولو درٹ!
 ایک غلطوہ اگر کوئی اڑا لایا تو کیا؟
 "نئوز لاہور" آخر "نئوز لاہور" ہے
 سادہ لوحی سے وہ کبھے "نئوز خولہ" تو کیا؟
 اشتیاق افزا، حجاب یار ہوتا ہے بہت
 مہر نے اوڑھا ہے "فتے دین" کا پردہ تو کیا؟
 "حضرت مرزا" کی ہیں توقیعات اس سے بھی فزوں
 ہے غلط املا تو کیا، کج ہے اگر انشا تو کیا؟
 "م ر" کے اصل چہرے کی زیادت تو ہوئی
 کچھ طال انگیز ہے سارا یہ افسانہ تو کیا؟
 راتنی کا یہ زمانہ ہی نہیں جعفر بلوچ
 تو نے کج بولا تو کیا اور تو نے کج کسا تو کیا؟

(جعفر بلوچ)

(روزنامہ "جنگ" لاہور، ۲ مئی ۱۹۷۷ء)

ترانہ تحریک

(پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے ایک کم شدہ قلمی اور نادر نسخہ "دیوان غالب" کی سرانجام پائی ہے)

بارغ معنی میں یہ کیا تازہ شگوفہ کھل گیا
 نقد چھرا ہیں طیوں، آزار جان و دل گیا
 ہو مبارک تجھ کو اے پنجاب یونیورسٹی!
 لاہوری کا تری، "دیوان غالب" مل گیا
 مال برآمد ہوا ہے ایک عادی چور سے
 اللہ الحمد! اس طرح دھم بہاراں سل گیا
 جب تعاقب چور کا تحسین فراتی نے کیا
 پاکبازانِ ادب کا غنیمتِ دل بکھل گیا
 رگتے ہاتھوں یوں جنابِ دزد جب پکڑے گئے
 غفلت اس کا بہر مجلس، بہر محفل گیا
 "خاردار نقد میں موصوف آ لکھے ہیں پھر
 دھم پھر "جاگیر غالب" کا پرانا جمل گیا
 کوئی دیکھے ایک چھوٹے سے دھماکے کا اثر
 جس سے جمل و سرق و دزدی کا ایساں مل گیا
 کارخانے جھوٹ کے، سب جل کے خاکستر ہوئے
 جب مرا مصرعِ ہدف پر بن کے میزائل گیا

(ہاتفِ دھڑائی)

(دور نامہ "پاکستان" لاہور ۲۸ مئی ۱۹۷۷ء)

مسروقہ مخطوطہ دیوان غالب کی سراغ یابی پر

مصر نو! یہ رنگ حیرا قافلِ افسوس ہے
 صورتِ تجھ خوش نما ہے، سیرتِ مشکویں ہے
 اور ہے تانقہ پہ ظم : ادب کا حال تو
 ظم و انتکا کے جہاں میں ہے ہر سو کج روی
 بلوہ لاہور کا بچنے والا اک واقعہ
 وہ جو ہے اس شہر کی بختِ بولچھڑی
 ایک غفلتِ نسو دیوانِ غالب تھا یہاں
 ہو گیا کم نامکوں مخطوطہ دیوانِ وحی
 "م۔ ز" نے نسو مسروقہ شائع کر دیا
 ڈاکٹر محسنِ فراقی نے کیا یہ ملا قاش
 "م۔ ز" ہے اپنے فن کا مجھد، یادش بخیر
 اس نے تصویقی قلمی اک "چاکیرِ غالب" نقل کر دی
 کتنے چہرے ایک چہرے میں دکھائی دے گئے
 جب بھی تاریخِ ہاتف نے تو قہرِیا کہا
 جو بھی کرکس ہے، بزمِ غزل، وہ ملاوس ہے
 ظاہرِا جو ہم قلم ہے، پلٹنا پاس ہے
 اس سے ہاتفِ زعفرانی اور بھی باجوس ہے
 شہرِ طغیانی میں کمر ہے بزمِ ہنوس ہے
 ایک ایسا واقعہ جو طیرت کا پس ہے
 باعثِ تخلیق صد خیام و بطلیوس ہے
 لاہوری جس کو کہتی تھی "مرا ناموس ہے"
 سانچہ یہ کتنا درد آگوس ہے اور ملوس ہے
 گویا اب یہ نسو اس کا فرق سالوس ہے
 قد سارق سے بڑا چوری کا یہ ملوس ہے
 ہر ایچکا اور شک، اس شخص کا پاس ہے
 بی چکا یہ آنحضرتی پرتوی کا پاس ہے
 بالِ مسروقہ بھی جیسے گردشِ غلوس ہے
 اسے خدا تو در کیر و قادر و قدوس ہے

نسو ملوس : بختِ بولچھڑی

"نسو مسروقہ کھینچہ ناموس" ہے

ہاتفِ زعفرانی

(جلد "زاد" : شمارہ نمبر ۷۰۰۰۰)

حصہ پنجم: ضمیر

رہاقت علی شاہ

- (الف) ”دیج ایٹ غالب، جرمن ایڈیشن“ پر مبنی نثر
(ب) ”روزنامہ“ پاکستان میں شائع ہونے والی خبر کا عکس

”دیوانِ غالب۔ جرمن ایڈیشن“ پر محققانہ نظر

رفاعت علی شاہ

”دیوانِ غالب“ کی چھٹی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۴۵ء میں شروع ہوا، جب ڈاکٹر ڈاکر سین نے برلن (جرمنی) سے ضخ نامہ میں ”دیوانِ غالب“ کا چھٹی ایڈیشن شائع کیا۔ زیر تہرہ اشاعت، سینہ طور پر اسی ایڈیشن کو بنیاد بنا کر وجود میں لائی گئی ہے۔ نسخہ ہذا کے ناکل اور سرورق پر ”دیوانِ غالب۔ جرمن ایڈیشن“ لکھا گیا ہے اور پیش لفظ نگار نے واضح کیا ہے کہ اشاعت ہذا کے ذریعے ڈاکٹر ڈاکر سین کے شائع کردہ چھٹی ”دیوانِ غالب“ کو ہی پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا ”پیش لفظ“ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے تحریر کیا ہے۔ زیر نظر اشاعت میں ”دیوانِ غالب“ کا فارسی دیباچہ اور اس کا اردو ترجمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ دوئی کیا گیا ہے کہ یہ ترجمہ ڈاکٹر سید معین الرحمن نے کیا ہے۔

اشاعت ہذا پر حقیقی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں غلطیوں کی بھرمار ہے، جب کہ خوبیاں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتیں۔ میں یہاں انحصار کے ساتھ چند بڑی غلطیوں کی نشاندہی کروں گا۔

۱۔ نسخہ ہذا کو ”جرمن ایڈیشن“ لکھا گیا ہے۔ حقیقی لفظ نظر سے اس جرمن ایڈیشن کا عکس بھی اس نسخے میں شامل ہونا چاہیے تھا جسے اس اشاعت کی بنیاد بنایا گیا ہے، جیسی یہ اشاعت ”جرمن ایڈیشن“ کہلانے کی حق داد تھی۔

۲۔ جدید معیشتی کتابت کرانے سے اس ایڈیشن کی وہ انفرادیت برقرار نہ رہی جو جرمن ایڈیشن کے ضخ نامہ میں تھی۔ چنانچہ اگر اسے ”جرمن ایڈیشن“ نہ سمجھ کر ”دیوانِ غالب“ کی عام اشاعت تصور کیا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ اس کی جانب خواہ ”پیش لفظ“ نگار بھی اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھ چکے ہیں کہ: ”اس نئی صورت میں

یہ ”جرمن ایڈیشن“ کب رہا؟ اسے ”دیوان غالب، کلاسیک ایڈیشن“ کہنا زیادہ مناسب حال اور بر محل ہوگا۔“

۳۔ اس اشاعت کو ”جرمن ایڈیشن“ کہا گیا، لیکن ”جرمن ایڈیشن“ کا تفس اس میں شامل نہیں کیا گیا۔ ایسی صورت میں، کم از کم، یہ ضروری تھا کہ ”جرمن ایڈیشن“ کے طرز اطلاق، مشمولات اور مروجہ ”دیوان غالب“ سے موازنہ کر کے اختلافات متن کو واضح کیا جاتا۔ مذکورہ امور پر مشتمل ایک تحقیقی تفصیلی جائزہ بھی شامل اشاعت ہو سکتا تھا۔ اور متن کے اندر، حواشی کے ذریعے، مذکورہ وضاحتیں بھی ہونی چاہئیں تھیں۔ اس طرح کم سے کم جرمن ایڈیشن کے حقیقی خدوخال کا کسی حد تک اندازہ ممکن تھا۔ موجودہ صورت میں ان سب کا نہ ہونا بھی اس اشاعت کے اعتبار پر انگشت نمائی کرتا ہے۔ جرمن ایڈیشن کے سہل الحصول نہ ہونے کے باعث موجودہ صورت میں ہمارے پاس موازنے کا کوئی طریقہ نہیں کہ آیا اس اشاعت کا متن، جرمن ایڈیشن کے مطابق ہے یا نہیں۔

۴۔ کتاب میں کتابت کی بے شمار غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ متن دیوان میں بھی کافی غلطیاں پائی جاتی ہیں، لیکن ”چشم لفظ“ میں کتابت کی غلطیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

۵۔ اظہار اور رموز اوقات کا طویل نہیں رکھا گیا۔ شاعری کے متون میں عموماً اور کلام غالب میں خصوصاً اظہار اور رموز اوقات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ رموز اوقات کے بغیر ازل تو شعر کی درست طور پر خواندگی ہی ممکن نہیں، اس سے بڑھ کر، بعض اوقات، اس التزام کے بغیر شعر بھی سہل ہو جاتا ہے۔ غالب کے طرز اظہار پر معروف محقق رشید حسن خاں کی پوری کتاب منظر عام پر آ چکی ہے (”اظہار غالب“ غالب انشٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ ۲۰۰۰ء۔ نیز ادارہ یادگار غالب، کراچی۔ ۲۰۰۰ء)۔ ”دیوان غالب“ کی اشاعت میں اسے چشم نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

۶۔ متن میں کئی مصرعے وزن سے خارج ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے ۱۹۷۵ء کے جرمن ایڈیشن کو نظر ثانی کے بغیر ہی جدید کتابت کرا کے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ

سے کچھ پرانی اور کچھ نئی ٹرایاں متن میں پیدا ہو گئی ہیں۔ سہولیات اور نظر ثانی نہ ہونے کی وجہ سے کئی الفاظ کی صورتیں بدل گئی ہیں۔ اس وجہ سے کئی مصرعے وزن سے خارج ہو گئے ہیں۔ اشاعت سے قبل جرمن ایڈیشن پر نظر ثانی کرنی ضروری تھی۔

۷۔ ”فیض لفظ“ نگار نے لکھا ہے کہ جرمن ایڈیشن پہلے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا اور اس کی دوسری اشاعت ۱۹۴۵ء میں منظر عام پر آئی۔ ”نمونہ جرمن“ اس وقت میرے پیش نظر نہیں، لیکن ڈاکٹر محمد انصار اللہ نے ”غالب بلیغ گرائی“ (علی گڑھ، ۱۹۷۳ء) میں جرمن ایڈیشن کے طبع اول کا سنہ ۱۹۲۵ء اور طبع دوم کا سنہ ۱۹۲۶ء دیا ہے۔ غالبیات کے دیگر محققین بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ پہلی اشاعت ڈاکٹر ڈاکٹر حسین کی مساعی سے منظر عام پر آئی۔ جب کہ دوسری اشاعت کی فرمائش پر ہوئی۔

۸۔ متن میں ”ضمیمے“ کے مآخذ کی وضاحت نہیں کی گئی، جو ہمارے ضروری تھی۔ یہ بھی واضح نہیں کہ یہ ضمیر کس نے مرتب کیا۔ ڈاکٹر مصین الرحمن نے لکھا ہے کہ آغا امیر حسین (بامشر) نے ضمیمے کا اضافہ کیا ہے، گویا یہ ضمیر آغا امیر حسین کا مرتب کردہ ہے، لیکن ازل تو خود آغا امیر حسین کی کوئی وضاحت اس سلسلے میں نہیں ملتی۔ دوسرے خود ضمیمے کے حواشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیر خود ڈاکٹر مصین الرحمن کا مرتب کردہ ہے۔ ضمیمے کے بعض حواشی ان کے مرتبہ دیوان غالب اور دیگر کتب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ضمیمے کے ص ۲۹۶ پر مندرجہ کلام کے سلسلے میں ”بیاض ثواب علماء الدین احمد خاں طائفی“ کا حوالہ دیا ہے، اور ڈاکٹر مصین الرحمن اپنی بعض کتب میں یہ لکھ چکے ہیں کہ یہ بیاض ان کی تھکوت ہے۔ اس سے یہ ظاہر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ضمیر ڈاکٹر مصین الرحمن کا ہی مرتب کردہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اسے آغا امیر حسین کے کھاتے میں کیوں ڈالا؟ اس کی وجہ نظر پر ظاہر درج ذیل بیان کی جاسکتی ہے۔

۹۔ ضمیمے کے کلام کے سلسلے میں استناد کی کوئی بحث نہیں۔ یہ واضح نہیں کہ ضمیمے کا کلام کن مآخذ سے حاصل کیا گیا اور آیا یہ مستند ہے یا نہیں۔ غالباً اسی خانی کی بنا پر

ڈاکٹر حسین الرحمٰن نے صبیحہ کی ترتیب کی ذمہ داری خود اٹھانے کے بجائے اس کا ملکہ آغا امیر حسین پر ڈال دیا ہے، اور خود اس معاملے سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کی ہے۔

۱۰۔ اب میں زیرِ نظر ”دیوان غالب“ کے سلسلے میں دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں۔ ”دیوان غالب“ کا یہ ”بحرین ایڈیشن“ بھی اسی قصیدے کا حصہ ہے جو ”دیوان غالب“ کے مثنوی ”نسخہ خوبہ“ کی اشاعت سے شروع ہوا، اور یہ قصیدہ ابھی تک تازہ ہے۔

ڈاکٹر سید حسین الرحمٰن نے ۱۹۹۸ء میں ”دیوان غالب“ کے ایک مخطوطے کا عکس شائع کیا اور خوبہ مکتوب حسین کی نسبت سے اسے ”نسخہ خوبہ“ گردانا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ یہ نسخہ ان کا ہے۔ اس اشاعت میں انھوں نے غالب کے فارسی دیباچہ دیوان کا ترجمہ بھی شامل کیا اور لکھا کہ انھوں نے ترجمہ تکمیل دیا ہے یعنی دیباچہ دیوان کے دیگر تراجم سامنے رکھ کر ایک نیا ترجمہ تکمیل دیا ہے۔ ظاہر ہے ترجمہ کرنے اور ترجمہ تکمیل دینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

ترجمہ مذکور کے لغوی و معنوی تسامحات کا تحقیقی حاکم ڈاکٹر حسین فراقی نے اپنے کتابچے بعنوان ”دیوان غالب، نسخہ خوبہ، اصل حقائق“ میں تفصیل سے کیا ہے۔ کتابچے کے پہلے حصے میں انھوں نے فحوس خوبہ کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ مسید ”نسخہ خوبہ“ اصل میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا گم شدہ نسخہ ہی ہے جسے غالباً موسم مقاصد کی تحمیل کے لیے یونیورسٹی لائبریری سے غائب کرنا حاصل کیا گیا۔ کتابچے کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر حسین فراقی نے مسید ”نسخہ خوبہ“ کی علمی حیثیت کا حاکم کیا ہے۔ اسی کے ذیل میں انھوں نے مذکورہ فارسی دیباچے کے ترجمے کے تسامحات کی نشان دہی کر کے درست صورتیں تحریر کیں۔ نتیجتاً ڈاکٹر حسین الرحمٰن نے ڈاکٹر حسین فراقی کی تصحیحات کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے تکمیل کردہ ترجمے میں تصحیحات کر لیں، لیکن اپنی کم ظرفی کے سبب نہ تو ڈاکٹر حسین فراقی سے استفادے کا اعتراف کیا اور ان سے استفادہ کرنے پر ان کا شکریہ ہی ادا کیا۔

مذکورہ بالا نظر جاتی شدہ ترجمہ ڈاکٹر حسین الرحمٰن نے ”دیوان غالب“ (مسید ”نسخہ

خوابہ") کے اس ڈی کس ایڈیشن میں شامل کیا جو ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ یہی ترمیم و چشم نظر "دیوان غالب، جرمین ایڈیشن" میں شامل ہے اور اسے ڈاکٹر حسین الرحمٰن کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ کتاب میں یہ طور مستقیم ان کا نام ان کے ایما سے ہی شامل کیا گیا ہوگا۔

ڈاکٹر حسین الرحمٰن کی فارسی دانی کا پول تو ڈاکٹر حسین فراقی پہلے ہی کھول چکے ہیں۔ اپنے کتابچے میں انھوں نے غوس شاہد کے درجے واضح کر دیا ہے کہ ڈاکٹر سید حسین الرحمٰن تو فارسی زبان کے اتنے ماہر بھی نہیں کہ فارسی عبارت کی خواندگی ہی صحیح طور سے کر سکیں۔ وہ فارسی سے آراء میں ترمیم کرنے کے اہل کہاں ہیں۔ جب کہ زیرِ نظر نسخے میں واضح طور پر قرر ہے، بلکہ وہ جگہ قرر ہے، کہ غالب کے فارسی دیباچہ و دیوان کا ترمیم ڈاکٹر حسین الرحمٰن نے کیا ہے۔ اس سے پہلی نظر میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر حسین الرحمٰن اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ وہ فارسی سے آراء میں ترمیم نہیں کر سکتے۔ فطری طور پر، اس امر کا واضح اظہار ڈاکٹر حسین الرحمٰن کو، پہلے ڈاکٹر حسین فراقی کے اعتراضات کا مدلل و مفصل جواب دے کر کرنا چاہیے تھا۔ اسی مقصد کے لیے تو انھوں نے ڈاکٹر حسین فراقی کے کتابچے کے جواب میں ایک کتابچہ بعنوان "دیوان غالب، نسخہ خوابہ۔ صحیح صورت حال" لکھا۔ لیکن اس میں ڈاکٹر حسین فراقی کے اعتراضات کا مدلل اور ثبانی جواب دینے میں ڈاکٹر حسین الرحمٰن نری طرح ناکام رہے۔ ان کا یہ کتابچہ کوسٹوں اور بدعاؤں کا مجموعہ تو کہا جاسکتا ہے لیکن بےجیدہ علمی جھگڑے میں اس کا ہار پانا ممکن نہیں۔ یوں ڈاکٹر حسین فراقی کے مدلل اعتراضات کا تسلی بخش جواب نہ دے کر ایک طرح سے انھوں نے ان اعتراضات کی صحت تسلیم کر لی۔ اس پر مزید ستم یہ کیا کہ ڈاکٹر حسین فراقی کے اعتراضات کی روشنی میں فارسی دیباچہ غالب کے آراء ترمیم (تخلیل کردہ خود) کی تصحیح بھی کر ڈالی اور یہ تصحیح شدہ ترمیم "نسخہ خوابہ" کے ڈی کس ایڈیشن میں بھی شامل کر دیا۔ ان غوس شاہد سے یہ اظہار من اعتراف ہے کہ ڈاکٹر حسین الرحمٰن نے ڈاکٹر حسین فراقی کے اس اعتراض پر ہر قصد ہی شہد دی ہے کہ وہ فارسی زبان سے نا بلد ہیں۔ ایسی صورت میں غالب کے فارسی

دیباچہ دیوان کے اردو ترجمے کو اپنے کلمات میں ڈالنا شدید قسم کی ہٹ دھرمی اور مثبت ادبی اقتدار کی پاسداری سے ڈاکٹر مصیبن الرحمن کی بجاوے پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

ڈاکٹر مصیبن الرحمن نے اپنے ”پیش لفظ“ کے ص ۱۹ پر دعویٰ کیا ہے کہ غالب کے فارسی دیباچہ دیوان کی ”مشیقی کہو رنگ میں کئی سہرا آئے ہیں۔ انھیں قریہ نظر (تازو) ایڈیشن میں مصدقہ مآخذ (مآخذ) سے درست کر دیا گیا ہے“ لیکن اول تو انھوں نے ان مآخذ کی وضاحت نہیں کی جن کی مدد سے مذکورہ فارسی دیباچے کا متن درست کیا گیا۔ جاننا ڈاکٹر مصیبن الرحمن کے نزدیک اس التزام کی کوئی اہمیت نہیں، حالانکہ تحقیق و تدوین متن کا یہ بنیادی تقاضا ہے۔ دوسرے دوستی کی اصل صورت یہ ہے کہ ۲ صفحات کی ۳۶ سطروں کے اس فارسی دیباچے میں ۲۲ غلطیاں موجود ہیں جو ”مصدقہ مآخذ“ کے اصول کا پل کھولنے کے لیے کافی ہیں۔

یہ حیثیت مجموعی ”دیوان غالب، جرمن ایڈیشن“ کی یہ اشاعت غیر مستعد، غیر اہم، باطل دعووں کی کھوتی اور بے پرواہی کا شاہ کار ہے۔ اس اشاعت میں ایسی ایک خصوصیت بھی نہیں جس کی وجہ سے اسے اہمیت دی جاسکے۔ اشاعت ہذا کی واحد خوبی بھی پیش لفظ نگار پر کھل کر بھلا چکے ہیں کہ

”اس نئی صورت میں یہ ”جرمن ایڈیشن“ کب رہا؟ اسے ”دیوان غالب، کلاسیک ایڈیشن“ کہنا زیادہ سبب حال اور بر عمل ہوگا۔“

(ص ۱۲۔ ”پیش لفظ“)

(غیر مطبوعہ)



رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر سید یحییٰ آفریقہ کی آپس میں بھی ملاقات نہیں ہوئی

چند مشاہیر کی آراء

”جسین کا کتابچہ“ اصل کتاب ”دینی اور مالدی تحقیق“ کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ جسین کے کتابچے کے آخر میں ڈاکٹر محمد اظہار کے نئے، خوش صاحب اور لکھائی میں مہارورو کے نئے اور کونو طبع کے بعض مقالات کے جو ترجمہ دیے ہیں ان کی ایک حد تک یکسانی کو بھانپنے کے لیے کسی، مہر تحریر کی ضرورت جس ایک مطالقی بھی ایک نظر بھگان سکتا ہے کہ یہ ایک اسی طے کے تھیں ہیں۔

”جسین“ نے تاریخی متن کی قرأت اور اس پر درجے میں جو تصحیحات تحریر کی ہیں وہاں غور کریں۔“

CAU-MD

”میں نے اس میں کمال سے شکوک و شبہات کی گواہی دے سکتی تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ میں نے اس سے پہلے اس کی گواہی دے چکی تھی۔“

624/200

”مظہورِ حقان غالب کلامِ جاوید کی نگاہی سے آفریقہ مصر کے تکی اور تکیوں جیلا اور اسے۔“

(16075)

”والہیہ بہار جیسے خوشنوا ہوا ہے، جن جنسوں اپنی نگاہ سے تجلّی و کا جمال ہے اور وہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ اصل و پیمان سے کہنے سے مراد اصل صاحب اور تمام اصل و حق صاحب لے کر حلال و حلالہ۔“

”میں شیخ صاحب کا دورانیہ ابھرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس مسئلے پر مصلحتاً ۳۲ فیصد کرپوریشن کے آؤٹری میں اس جگہ صریحاً ہے جو ان کو انجینئرز کے فرائض کے لئے دے گا۔ اس میں صاف ہے اس بات کو یقیناً کی جیتا گیا ہوئی ہے۔ اسے اس طرح سے دیا جائے گا۔“

Cryptosporidium

”سید صاحب موصوف نے فریق صاحب کے لیے اہم روایتی معجزات میں سے کسی ایک معجزہ نقل کیا۔“

4-2-1978

کتاب کا مطالعہ اور مسلسل فکر یہی ہمارا کام ہے۔

[illegible]

عليه السلام

علم و فن

7357192 ed.maheshwari@hawaii.edu / 808-957-1740

1. *Journal of the American Medical Association*, 1997; 278: 1039-1044.